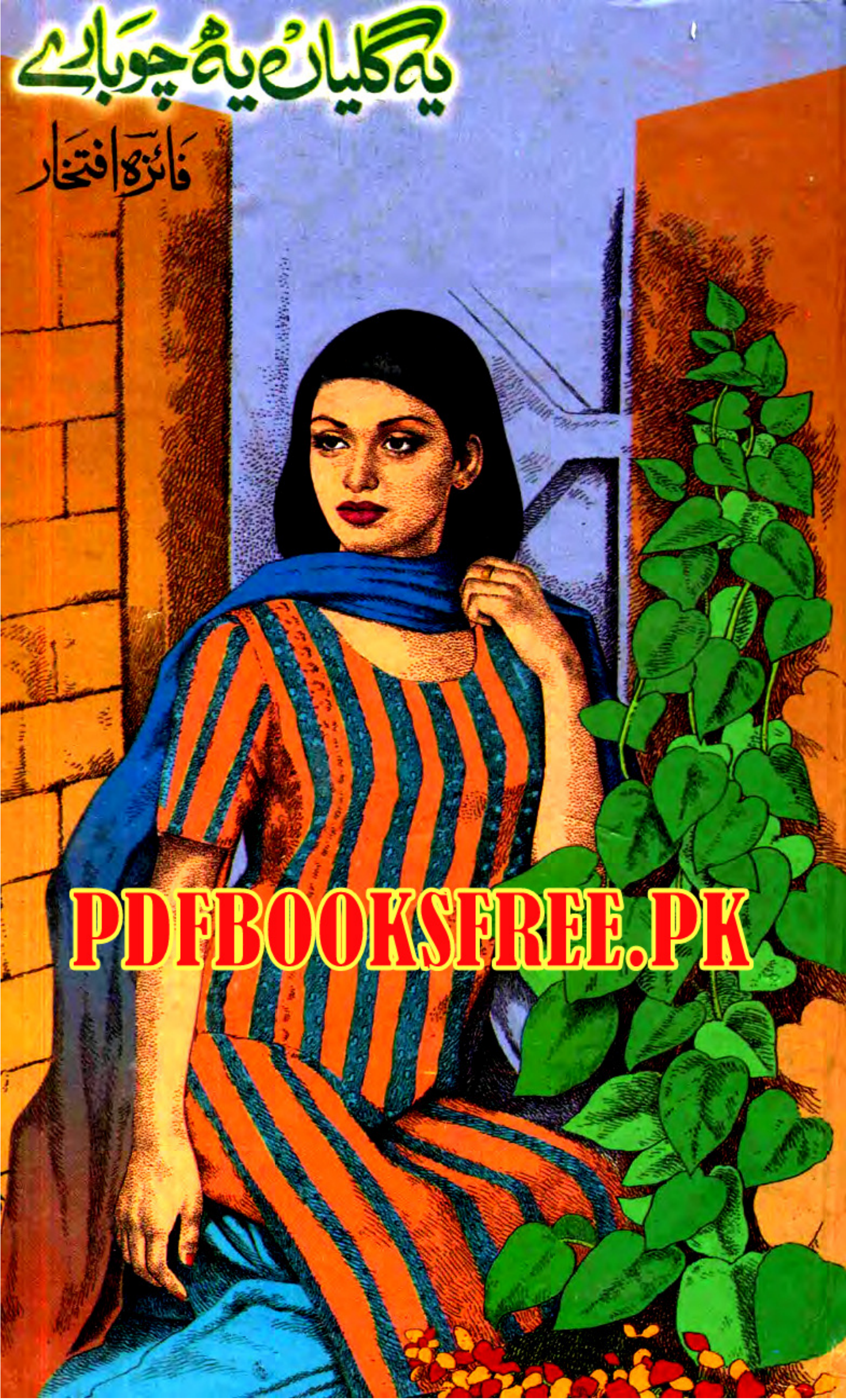

یہ گلیاں یہ چوبارے
فائزہ افتخار
PDFBOOKSFREE.PK

یہ گلیاں یہ چوبارے

''بابا! دعا کرو' اللہ سوہنا مجھے بیٹا دے۔'' اس نے بھیک کے لیے اٹھا ہاتھ واپس گرا لیا۔ دینے والے نے بڑی حیرت سے اس ملنگ کی یہ حرکت دیکھی' اس کا ہاتھ دوبارہ جیب تک گیا۔ پہلے سے نکالے پانچ روپے کے سکے کے ساتھ اب اس نے ایک دس کا نوٹ بھی اس کی جانب بڑھا دیا۔

''لو بابا' تم خوش ہو جاؤ۔'' اس نے اندازہ لگایا کہ شاید بھکاری مزید کی طلب میں اٹھا ہوا ہاتھ نیچے کر رہا ہے۔

''بس دعا کرو کہ اس بار اللہ مجھے بیٹے کی نعمت سے نواز دے۔ تم اللہ والے ہو' سچے دل سے دعا کرو گے تو مجھے......''

''کروں گا پھرتا؟'' اس ملنگ نے بگڑ کے اس آدمی کا ہاتھ پرے جھٹکا۔

''جا' نہیں کرتا میں تیرے لیے دعا؟ کیا کرے گا بیٹا لے کر؟ کیوں مانگ رہا ہے؟ جھلیا!'' وہ باقاعدہ اسے دھکے دے کے پیچھے کرنے لگا۔ آدمی سیڑھی سے گرتے گرتے بچا۔ ملنگ' مزار کی سیڑھیوں پہ بیٹھا تھا۔ وہاں بیٹھے دوسرے بھکاریوں سے بالکل الگ تھلگ...... اس میں کچھ ایسا تھا جو اسے وہاں کے درجن بھر مانگنے والوں سے علیحدہ کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ متمول شخصیت رکھنے والا وہ درمیانی عمر کا شخص اس کے

پاس نذر دینے رکا اور اسی سے دعا کی درخواست کی لیکن نہ صرف اس کی نذر لوٹا دی بلکہ دعا کی درخواست بھی بری طرح رد کر دی گئی۔

"یہ بابا پاگل لگتا ہے۔" اس شخص نے خفت سے دوچار ہوتے ہوئے نزدیک سے گزرتے کسی آدمی سے کہا۔

"اس کی دھتکار کو بھی تبرک سمجھو۔" سیڑھیوں سے نیچے فٹ پاتھ پہ کپڑا بچھا کے اگربتی، ماچس اور پھول وغیرہ بیچنے والے نے اسے بتایا۔

"چار سال سے اسے ادھر بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔ اتنی عمر کا نہیں لگتا مگر بہت پہنچا ہوا ہے۔ اسے مانگنے والا نہ سمجھنا۔ نہ آواز لگاتا ہے نہ کسی کے پیچھے لینے کے لیے لپکتا ہے۔ بس سر نیچے کیے سارا وقت دھیان لگائے رکھتا ہے۔"

بھیک دینے والے نے متاثر نظروں سے ایک بار پھر اس ملنگ کو دیکھا۔ اسے جھڑکنے کے بعد وہ ایک بار پھر سر جھکائے وہیں ٹھنڈی سیڑھی پہ بیٹھا تھا۔ موسم کی سختی سے بے نیاز وہ ایک پتلے لمبے سبز چغے میں ملبوس تھا۔ ٹخنے سے اوپر تک سوکھی ہوئی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔ پلکوں پہ بھی گرد جمی ہوئی تھی۔ ہونٹ پپڑی زدہ اور زرد تھے۔ آنکھوں کی وحشت اور ویرانی دل دہلا کے رکھ دیتی تھی، اگر اس کا حلیہ بدل دیا جاتا تو وہ خاصا معقول نظر آتا، کیونکہ اس کے نقوش زمانے اور حالات کی سختیاں سہنے کے باوجود ابھی تک کافی نرمی لیے ہوئے تھے۔ اس اجاڑ حلیے کے باوجود اس کی عمر کا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لگ بھگ چالیس سال تک کی عمر کا ہوگا لیکن یہ اندازہ اس حلیے کی وجہ سے تھا۔ اصل میں اس کی عمر فقط بتیس سال تھی۔

اس آدمی نے ایک بار پھر روپے نکالے اور بڑی عقیدت کے ساتھ ملنگ کے قدموں کے نزدیک رکھ دیے۔

"کیوں مانگوں میں دعا؟" وہ اب بھی بڑبڑا رہا تھا، اگرچہ اس کی یہ بڑبڑاہٹ بے حد مدھم آواز میں تھی۔

"میرے لیے کسی نے مانگی تھی جو میں مانگوں؟" اچانک وہ کسی نامعلوم ہستی سے لڑنے لگا۔ سامنے کوئی نہیں تھا لیکن وہ کسی سے بہت ناراضی کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

"بھلا بیٹوں کے لیے بھی کوئی دعا مانگتا ہے؟ میرے لیے تو کسی نے نہیں مانگی تھی۔ میری چاہت تو کسی نے نہ کی تھی، میں بھی تو بیٹا تھا۔"

وہ روٹھا روٹھا سا وہاں سے اٹھ کے چل دیا۔ چند سکے اس کے پیروں کی ٹھوکر

سے نیچے لڑھک آئے، لیکن وہ پروا کیے بغیر سیڑھی سے نیچے اترنے لگا۔

"او بابا، اپنی کمائی تو لیتا جا۔"

اسی اگربتیاں بیچنے والے نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"کمائی؟" وہ چونکا۔

"میں بھلا کہاں کمائی کر سکتا ہوں۔ میں کمائی کے قابل ہوتا تو میرے لیے بھی کوئی دعا مانگتا۔" کہتے کہتے اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ وحشت اور دیوانگی سے بھرپور قہقہہ۔

* * *

وہ بن مانگے آیا تھا۔ اس کی ماں کو اس کی طلب تھی نہ خواہش اور اس کے باپ کو تو اس کی خبر ہی نہ تھی۔

پھر بھی وہ مزے میں تھا۔ کم از کم اپنی زندگی کے ابتدائی دس گیارہ سال تو اس نے اسی مزے کے ساتھ لاپروائی اور بےفکری سے گزارے تھے۔ کھانے کو اچھا ملتا تھا، پہننے کو بھی۔ نہ کوئی روک ٹوک نہ پابندی نہ اسکول جانے کا ٹنٹا نہ کچھ اور عجیب آزاد زندگی تھی۔ اس کی تین بہنیں تھیں۔ دو بڑی ایک چھوٹی مگر بہت کم عمری میں ہی وہ جاننے لگا تھا کہ اس میں اور ان تینوں میں بہت فرق تھا۔ وہ اس کی طرح اتنی بےفکر زندگی نہیں جی رہی ہیں۔ ان پہ بچپن سے ہی بہت بھاری ذمہ داریاں ڈال دی گئی تھیں۔ اسکول کے ساتھ ساتھ گھر پہ بھی ان کی پڑھائی جاری رہتی۔ کئی ماسٹر آتے کوئی کچھ پڑھانے کوئی کچھ سکھانے۔ ان کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے تک کو اس کی ماں نظر میں رکھتی۔

"تمنا منہ پھاڑ کے کیوں ہنسی؟"

"ترنم دھپ دھپ کر کے کیوں چلی؟ مسکان دھوپ میں پھر رہی ہے؟"

ان تینوں کو گویا ماں ہتھیلی کا چھالا بنا کے پال رہی تھی۔ کبھی کبھی تو سکندر گھبرا اٹھتا۔

"ربا! شکر ہے میں لڑکی نہیں، جیسے جی چاہے ہنس سکتا ہوں، چل سکتا ہوں، جو دل چاہے کھا سکتا ہوں۔ باجیوں کی طرح نہیں کہ اچار نہیں کھانا، گلا خراب ہو جائے گا، چھالیہ نہیں چبانا، دانت ناس ہو جائیں گے، برف کا گولہ نہیں چوسنا آواز بیٹھ جائے گی، لکھ کروڑ دفعہ شکر ہے ربا!"

پھر ایسا ہوا کہ جوں جوں شعور آتا گیا' یہ شکرانہ رشک میں اور پھر حسد میں تبدیل ہو گیا۔

تمنا اس سے چھ سال اور ترنم چار سال بڑی تھی جبکہ مسکان ڈھائی سال چھوٹی تھی۔ سارے دن میں ماں سے اس کا واسطہ شاید ایک آدھ بار ہی پڑتا تھا وہ بھی کسی نہ کسی کام سے۔

''جا سکندرے! یہ پرچی نکڑ والے منیاری کے پاس لے جا' پیسے حساب میں لکھوا کے سارا سودا لے آ۔''

یا پھر......

''وے سکندرا! یہ دوپٹہ رنگوا کے لا' شاباش میرے پتر! اور واپسی پہ اپنی نگینہ ماسی کے ہاں سے مسکان کو لے آ' سبق لینے گئی تھی۔''

ان تینوں کے سبق ہی سارا دن ختم نہ ہوتے۔ اس کے باوجود اسے ان پہ اب رشک آنے لگا تھا۔ جو بھی تھا ماں کی ساری توجہ تو ان ہی کی جانب تھی۔ کبھی کسی کے سر پہ تیل لگا رہی ہے تو کسی کو ابٹن رگڑ کے صاف کر رہی ہے۔ کسی کے پیروں پہ مہندی کے گل بوٹے بن رہے ہیں تو کسی کو ڈھیر سارے بادام ڈال کر چنے کی دال دیسی گھی میں بھون کے کھلائی جا رہی ہے۔ یہ کہہ کر ''ماسٹر جی نے شکایت کی ہے' بے بی سبق ٹھیک سے یاد نہیں کرتی۔''

وہ تو جیسے ماں کو نظر ہی نہیں آتا تھا۔ نانی کبھی کبھار اک نگاہ ڈال لیتی۔

''توبہ سکندر! کیسا میلا چیکٹ ہو رہا ہے۔ زہرہ کا بیٹا کم اور پینو کا زیادہ لگ رہا ہے۔'' پینو ان کی جمعدارنی کا نام تھا۔ اس لیے کہ وہ اس کے بیٹے یونس عرف جونا کے ساتھ کھیلتا رہتا جو اسی کا ہم عمر تھا۔

''چل نہا' نیا جوڑا پہن۔'' کہیں سے نیا نکور شلوار قمیص نکال کے اس کی جانب پھینکا جاتا' جو وہ پہن لیتا اور تب اتارتا جب میل کچیل سے اس کا اصل رنگ دب جاتا اور وہ پھٹنے کے قریب ہو جاتا اور ایسا کرنے میں اسے مہینوں نہیں لگتے تھے' بس یہی کوئی پندرہ بیس دن چھتیں پھلانگتے' چوباروں پہ پتنگیں اڑاتے' گلی میں کنچے کھیلتے' چلتے رکشوں کے پیچھے لٹک کر جاتے ہوئے' نہر میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے کب اس نئے جوڑے کا حشر نشر ہوتا' اسے پتا ہی نہ چلتا۔

اس کے برعکس جونا جو اکثر کسی نہ کسی کی اترن پہنتا یا اس کی ماں پینو کبھی خریدتی

بھی تو لنڈے سے شوخ سے رنگ کی پتلون شرٹ لا دیتی لیکن اس کے کپڑے سکندر کے کپڑوں کی نسبت صاف ہی رہتے' اسے ماں کا ڈر جو ہوتا۔''

''نہ یار! میں نہیں کشتی لڑتا' کپڑے کیچڑ سے بھر جائیں گے' اماں جھڑکے گی۔''

''ٹھہر ذرا شلوار قمیص اتار کے ایک پاسے (طرف) رکھ دوں' پھر نیکر میں تیروں گا' ورنہ کپڑے گیلے دیکھ کر اماں دو لگائے گی' اس نے منع کیا ہے۔ کہتی ہے ساون بھادوں گزر جائے تو نہر میں نہیں اترتے' ٹھنڈ لگ جاتی ہے۔''

لیکن اسے کسی کا ڈر نہ تھا۔ وہ بیمار ہوتا' کھانستا پھرتا تو یہیں کہیں سے کوئی کھانسی کا شربت اسے پلا دیتا جبکہ تمنا کے گلے میں ہلکی سی خراش بھی آتی تو ماں اسے نمک والے پانی کے غرارے کرا کرا کے بے حال ہو جاتی۔

یہ فرق دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اسے بری طرح چبھنے لگا۔ بہت سے سوال اس کے دماغ میں کلبلاتے رہتے' جن کا جواب وہ صرف ایک شخص سے طلب کر سکتا تھا اور وہ شخص تھا' بابا حیات۔

بابا حیات کو اس نے ہوش سنبھالنے کی عمر سے ہی دیکھا تھا۔ وہ اس کے مکان کی ڈیوڑھی میں کتنے عرصے سے مقیم تھا' اس بات سے وہ ناواقف تھا لیکن یہ جانتا تھا کہ لمبے عرصے سے یہی اس کا ٹھکانہ ہے کیونکہ اس کی نانی کے ساتھ ساتھ اس کی ماں زہرہ اور خالائیں نگینہ' زمرد اور نشو بھی اس سے خاصی مانوس تھیں۔

''بابا! امی مجھے اتنا پیار کیوں نہیں کرتی جتنا باجیوں کو اور مسکان کو کرتی ہے۔ کیا وہ سگی ہیں اور میں سوتیلا؟''

اس کا سوال سن کر بابا حیات زور سے ہنس دیا۔ اس نے کم ہی اسے ہنستے دیکھا تھا۔

''سگے' سوتیلے کا کوئی چکر نہیں کاکے!

کہنے کو ماں کے لیے ساری اولاد ایک جیسی ہوتی ہے لیکن یہ سب کہنے کی حد تک ہے۔ دل کو کوئی روک تو نہیں سکتا کہ وہ ایک کو زیادہ نہ چاہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ باقیوں سے پیار نہیں کرتی۔ ہاں' تیری ماں کو بیٹیاں زیادہ عزیز ہیں لیکن کہیں نہ کہیں اس کے دل میں تیری محبت بھی ہوگی تو سہی۔''

''تو یہ محبت نظر کیوں نہیں آتی' باجیوں سے کی جانے والی محبت تو صاف نظر آتی ہے۔''

''جھلیا! محبت نظر نہیں آتی صرف ''مطلب'' اور ''غرض'' نظر آتے ہیں۔'' بابا حیات نے اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی۔ یہ بھی اس کا خاص انداز تھا سمجھانے کا۔

''میں بھی تیری طرح پہلے یہی سمجھتا تھا کہ میری ماں اولاد میں فرق کرتی ہے۔''

''بابا! تمہاری ماں بھی تمہارے بجائے تمہاری باجیوں کے زیادہ لاڈ اٹھاتی تھی؟''

''نہیں کاکے! میری دنیا اور تھی جس طرح تیری دنیا ''باجیوں'' اور ''امیوں'' کے سہارے چلتی ہے اسی طرح ایک دنیا اور بھی ہے۔ تیری اس چھوٹی سی تنگ و تاریک گلیوں اور اونچے چوباروں والی دنیا سے بالکل الگ اور بہت بڑی۔ ابھی تو نے وہ دنیا نہیں دیکھی اور اچھا ہی ہے ورنہ اس وقت تیرے پاس یہ ایک نہیں بلکہ سو ڈیڑھ سو سوال اور ہوتے۔''

''بابا! وہ تمہاری ماں والی بات۔'' سکندر نے اکتا کے یاد دلایا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میری اس دنیا میں ''اباؤں' بھائی جانوں اور ''شوہروں'' کا راج تھا۔ میں اپنے ماں باپ کا ایک ہی ایک لاڈلا بیٹا اور پوری پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اس زمانے میں مجھے یوں لگتا تھا جیسے سارا جہان بس ایک میری وجہ ہی سے تو چل رہا ہے۔ ہر طرف سے پیار ہی پیار پاتے مجھے کبھی یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اپنے حصے سے زیادہ توجہ اور محبت سمیٹ رہا ہوں' اپنی پانچ بہنوں کے حصے کی بھی۔ بچپن میں وہ بھی میرے لاڈ اٹھانے میں پیش پیش تھیں' خصوصاً بڑی تینوں لیکن لڑکپن تک آتے آتے انہوں نے میرے نخرے برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید انہیں اپنی حق تلفی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میری دونوں چھوٹی بہنیں تو باقاعدہ بے بے سے الجھ پڑتی تھیں' اس درجہ بندی اور جانب داری پہ' اور بے بے جھولی اٹھا اٹھا کے انہیں کوسنے اور بددعائیں دیتی جن کی نظروں میں ان کا اکلوتا چشم و چراغ خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔

اس وقت میرے دل میں بھی یہی خیال آیا تھا کہ ضرور یہ پانچوں سوتیلی ہوں گی اور میں بے بے اور اپّے کا سگا۔ میرے لیے اچھی سے اچھی چیز پکتی' اچھے سے اچھا کپڑا سلتا' زمیندار لوگ تھے' زمینوں مربعوں والے لیکن ہم لوگوں میں لڑکی ذات کو اچھا کھلانے پہنانے کا رواج نہ تھا۔ لڑکی کی ذات پہ پیسہ صرف اس کو بیاہتے ہوئے لگایا جاتا اور جی کھول کے خرچ ہوتا۔ زیور اور جہیز کے نام پہ کہ یہ عزت کا سوال تھا۔

پھر میری دونوں بڑی بہنوں کی شادی ہوئی۔

پھر ان کی رخصتی پہ وہ جس طرح پچھاڑیں مار کے روئی' اس پر بھی مجھے بہت حیرت ہوئی۔

بھلا بے بے کو ان کے جانے کا اتنا غم کیوں؟ خود ہی تو ان کو ویہڑے میں چلتا پھرتا دیکھ کے آہیں بھرتی رہتی تھی کہ کب یہ ویہڑا ان کی پرچھائیں سے آزاد ہوگا۔ اٹھتے بیٹھتے دعائیں مانگا کرتی تھی۔

''اللہ سوہنا' ان کو اپنے گھروں کا کر دے۔'' پھر اتنا رونا دھونا کس بات کا۔

مجھے اپّے پہ بھی حیرت ہوتی جو بار بار صافے سے گیلی آنکھیں خشک کر رہا تھا۔ اتنے سالوں میں اس نے کبھی نظر اٹھا کے گھر بیٹھی پانچ بیٹیوں کی جانب نہ دیکھا' اسے تو ہر جانب میں ہی میں نظر آتا تھا پھر یہ آنسو کس لیے؟ اور پتا ہے کاکے! کچھ سالوں بعد جب میری شادی ہوئی تو مجھ سے چھوٹی جو دو بہنیں تھیں اور جو سدا یہی رونا روتی رہیں کہ ویر کے آنے کے بعد جب اس گھر میں ان کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی تو اللہ نے انہیں پیدا ہی کیوں کیا۔ ان دونوں کے لیے بے بے کے دل میں اچانک ہی ڈھیر سا پیار پیدا ہوگیا۔ میری زنانی کی میری بہنوں یعنی اپنی نندوں کے ساتھ ذرا نہ بنتی تھی۔ بس اس بات پہ بے بے اور اس میں تو تو میں میں ہی ہوتی رہتی۔ بہنیں بچپن سے منہ پھٹ اور زبان کی کڑوی تھیں' بے بے کی شہ پا کے اور تیز ہوگئیں۔ اکثر زیادتی ان کی طرف سے ہوتی' میں رانو (بیوی) کی ذرا سی ہمدردی کر لیتا تو بے بے زمین آسمان ایک کر ڈالتی۔''

''بابا کیوں اتنے سے منڈے کو الٹی پٹی پڑھا رہا ہے۔'' اسی وقت پینو جھاڑو پھیرتی ہوئی نزدیک چلی آئی۔

''چل نی' اپنا کام کر۔'' بابا نے اسے جھڑکا اور ایک بار پھر سکندر کی جانب متوجہ ہوا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا' ادھر بھی کچھ ایسا ہی حساب ہے۔ زہرہ کے دل میں بے شک تیری اور باقی سب تمنا کی محبت ایک جتنی ہوگی مگر مطلب پرستی اسے تیرے بجائے اپنی لڑکیوں کی سیوا کرنے پہ مجبور کرتی ہے' تو ایسے ہی غم نہ کیا کر۔ یہ وہ محنت ہے جو کسان اپنی فصل پہ کرتا ہے۔ وہ ان کا خیال رکھے گی۔ ان کی صحت کا' ان کی خوبصورتی کا' ان کے گلے کا' تب ہی تو وہ اسے کما کے دینے کے قابل ہوں گی۔''

"یعنی ایک دن وہ مجھ سے بھی ویسا ہی پیار کرے گی۔ میرا بھی اتنا ہی خیال رکھے گی؟" سکندر کو امید بندھی کہ جیسے بابا حیات کی بہنوں کے دن پھر گئے تھے شاید ایک دن اس کی بھی سنے جائے گی مگر وہ زور سے ہنس پڑا۔

"نہ...... یہ آس چھوڑ دے۔ میری ماں کو بڑھاپے میں بیٹی سے سیوا کرانے کا' اس کی ہمدردی پانے کا لالچ تھا مگر زہرہ کو نہیں۔ یہاں کی عورتوں پہ بڑھاپا آتا ہی کب ہے۔" اس نے اوپر نگاہ کی۔ وہ یہاں بیٹھا اکثر ہی نانی کے کمرے کی کھڑکی کو تکتا رہتا تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار نانی اسے کمرے میں بلا کے سو پچاس کا نوٹ بھی تھما دیتی تھی جو اس کے سگریٹ پان کے لیے کافی تھا۔ روٹی تو تین وقت کی اسے یہیں بیٹھے مل جاتی تھی۔

"یہاں کی عورتیں......" سکندر نے "یہاں" کی عورتوں پہ غور کرنے کی کوشش کی۔ مشکل یہ تھی کہ وہ یہاں کی عورتوں کا وہاں کی عورتوں سے فرق تلاش نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے تو وہاں کی عورتیں دیکھی ہی نہ تھیں یعنی کہ اس دنیا سے باہر کی دنیا کی۔

یہ دنیا جہاں اس نے آنکھ کھولی' حسن اور ادائیں بکتی تھیں اور دولت بولی لگاتی تھی۔

***

وہ جس کوٹھے پہ پیدا ہوا وہاں اس بازار کا بہترین "مال" موجود تھا۔ بڑا نام تھا ہیرا بائی اور اس کے کوٹھے کا۔ ہیرا بائی اس کی نانی کا نام تھا۔ اپنے وقت کی مشہور طوائف۔ بہت رکھ رکھاؤ والی۔ وہ خاندانی طوائف تھی' سات نسلوں کی اس وراثت کی امین' اس کی نانیاں' پرنانیاں اور ان کی بھی نانیاں اس پیشے میں نام کما چکی تھیں۔

وہ بڑے بڑے جاگیردار' زمین دار' نوابین کی منظورِ نظر رہ چکی تھی۔ قسمت سے اسے بیٹیاں بھی بڑی گنوں والی ملیں۔ سب سے بڑی زمرد' پھر نگینہ' تیسرے نمبر پہ سکندر کی ماں زہرہ اور سب سے چھوٹی نشو' ان چاروں میں سے نگینہ اب اپنے گھربار والی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اپنے آبائی کام سے ہاتھ کھینچ رکھا تھا۔ اسی بازار کی کسی دوسری گلی میں اس کا الگ کوٹھا آباد تھا۔ اس بات پہ اس کی اپنی ماں ہیرا بائی سے کھٹ پٹ بھی ہو چکی تھی۔

زمرد اب ماں کی گدی سنبھالنے کی تیاریوں میں تھی کیونکہ کام کرنے کے قابل نہ رہی تھی' اس لیے صرف نئی آنے والی لڑکیوں کو ٹریننگ دیتی اور ماں سے انہیں قابو میں

رکھنے کے گر سیکھتی۔

زہرہ بڑی بھاگوان تھی۔ اس کی تینوں بیٹیاں بڑے ستھرے نین نقش لے کے پیدا ہوئی تھیں۔ ان سے ماں اور نانی دونوں کو بڑی امیدیں تھیں ورنہ زمرد کی اکلوتی لڑکی شبنم ایک تو سانولے رنگ کی تھی' دوسرا لڑکپن میں نکلنے والے مہاسوں کے داغ چہرے سے گئے ہی نہیں' البتہ گلا بڑا سریلا تھا جس کا خاص فائدہ اس لیے نہ پہنچ سکا کہ ٹھمریاں اور غزلیں سننے والے نوابین کا دور گزر چکا تھا۔

نگینہ کی دو لڑکیاں تھیں' رنگ گورے تھے مگر نین نقش بھدے اور جسم بھاری اور بھتیری لڑکیاں "ورکر" تھیں وہاں مگر خاندان کا نام تو اپنے خون سے آگے بڑھتا ہے اس لیے زہرہ کی تینوں لڑکیوں پہ ہیرا بائی کی نظر تھی۔ ابھی صرف بڑی والی کام پہ لگی تھی مگر دونوں چھوٹیوں کی سخت ٹریننگ جاری تھی۔

زمانہ بدل گیا تھا اس لیے انہیں علاقے کے اسکول میں بھی ڈال رکھا تھا' تاکہ اور نہیں تو کچھ تو لکھنا پڑھنا' انگریزی کے چار حرف بولنے آ جائیں۔ ایسے میں سکندر کا بے کار اور بے مصرف وجود کسی کو نظر ہی نہ آتا۔ وہ تنہا نہ تھا جو ایسی ناقدری کا شکار تھا' اس بازار میں اور بہت سی زہرائیں تھیں' جن کو خدا نے بغیر کسی طلب کے بیٹے کی نعمت سے نواز دیا تھا۔ انہوں نے انہیں مارا تو نہیں' پھینکا بھی نہیں' طوعاً وکرہاً پال لیا تھا مگر ویسے ہی جیسے کوئی کسی جانور کو پالتا ہے۔

***

"امی! کیا میرا کوئی ماموں ہے؟" وہ گیارہ سال کا تھا جب اس نے پتا نہیں کیوں اپنی ماں سے یہ سوال کیا۔

"کیوں؟ تجھے یہ کیا عجیب سوال سوجھا؟" زرق برق کپڑوں کا ڈھیر سامنے پھیلائے زہرہ گہری سوچ میں غرق تھی کہ ان کے کون سے ڈیزائن کے لباس سلوائے جائیں۔ بیٹے کے سوال پہ اس نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ سکندر ہی اسے امی کے نام سے پکارتا تھا ورنہ سب اسے باجی پکارتی تھیں۔

"بتاؤ نا امی! ہے کوئی میرا ماموں؟"

"ہاں' ایک نہیں دو تھے۔" اس نے کسی فیشن میگزین کے ورق الٹ کر کوئی تباہ کن ڈیزائن تلاش کرتے ہوئے بتایا۔

"دو ماموں......؟" وہ حیرت سے چلایا۔ پھر ماں کے آخری لفظ پہ غور کرنے

کے بعد قدرے بجھ سا گیا۔

''اوہو...... تھے یعنی اب نہیں ہیں۔ فوت ہو گئے؟''

''رب جانے کدھر مر کھپ گئے۔'' اس نے جھلّا کے میگزین پرے پھینکا اور پنو کو آواز لگائی۔

''نی پنو! مہندی گھول دے اور دھیان سے اس میں چار چھ لونگ پیس کے اور دو چمچے لیموں کا رس ملا لینا۔''

''ہیں......؟ امی! تجھے اپنے بھائیوں کے بارے میں پتا ہی نہیں کہ وہ کدھر ہیں؟'' وہ اب تک وہیں اٹکا ہوا تھا۔

''میں کیا ان پہ تھانیدار لگی تھی جو رکھوالی کرتی رہتی۔ بڑے والے کا تو مجھے یاد نہیں' مجھ سے پورے سولہ سال بڑا تھا' میں چھوٹی ہی تھی جب اندر ہو گیا تھا۔ پتا نہیں اب تک جیل کے دھکے ہی کھا رہا ہے۔ ہا...... وقت بھی تو بہت گزر گیا ہے' کوئی تیس سال پہلے کی بات تھی جب پکڑا گیا تھا' ہوسکتا ہے اب تک مر بھی گیا ہو۔'' اس کے انداز میں ہنوز بے پروائی تھی۔ جیسے اپنے سگے ماں جائے کی نہیں بلکہ کسی غیر کے بارے میں قیاس آرائی کر رہی ہو۔

''اور دوسرا؟'' اس بار سکندر کی آواز میں اشتیاق کم تھا۔

''اچھا بھلا طبلہ بجانا سیکھا تھا' میرے ساتھ اور باجی نگینہ کے ساتھ کتنے ہی فنکشنوں پہ ساتھ گیا تھا پھر پتا نہیں کیا ہوا' گھر چھوڑ دیا۔ نہ کسی سے کھٹ پٹ' نہ لڑائی۔ بعد میں ایک آدھ بار ملنے آیا' پھر شادی کر لی تو دوبارہ مڑ کے نہ دیکھا' سنا ہے بیوی بڑی سوہنی تھی۔ ڈرتا تھا کہ ماں اسے بھی کام پر نہ لگا دے۔ بے عقلا' لے آتا تو آج آرام سے بیٹھ کے کھاتا۔''

''سکندر' معلومات لے کے اٹھا تو اس کے قدم تھکے تھکے سے تھے۔ ننھا سا ذہن بہت سی فکروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاید اس نے اپنے ماموؤں کے بارے میں اس لیے پوچھا کہ وہ جاننا چاہتا تھا اس کا مستقبل کیا ہے اور اب وہ جان چکا تھا۔

***

''چل یار! فلم دیکھنے چلیں۔'' جو نے اسے گلی سے آواز دی۔ اس کے ساتھ اسی بازار کے کچھ اور لونڈے بھی تھے۔ وہ انہیں ایک منٹ رکنے کا کہہ کے نانی کے پاس لپکا۔ اندر بابا حیات موجود تھے۔

''ہیرا! بس ایک بار۔ دیکھ کتنے سالوں سے تیری منّت کر رہا ہوں۔ ایک بار تو مجھے بتا دے کہ......''

''نانی! ایک پچاس کا نوٹ دینا۔'' اس نے سرسری سے انداز میں بابا حیات کے بندھے ہاتھ اور بھیگی آنکھیں دیکھیں مگر کوئی دھیان دیے بغیر اپنے مطلب کی بات کی۔

''اور میں بھی تو اُتنے سالوں سے تجھے برداشت کرتی آ رہی ہوں۔'' نانی نے غصے سے بابا حیات کی بات کا جواب دیتے ہوئے اپنی گود میں پڑے پرس میں ہاتھ ڈالا۔

''تو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہیرا بائی اپنی دھن کی پکی ہے۔ میری زبان ایک ہوتی ہے۔ چالیس سال پہلے جو کہا تھا' وہ بھی کر دکھایا۔ اب بھی اپنی بات سے پھروں گی نہیں۔'' اتنا کہتے کہتے اس نے پرس سے ہاتھ نکالا تو پچاس کے بجائے سو کا نوٹ انگلیوں میں دبا تھا' مگر اس نے دیکھے بغیر سکندر کی جانب بڑھا دیا۔ اس کی توجہ اب بھی زمین پہ دوزانو بیٹھے روتے بابا حیات کی طرف تھی۔ سکندر نے قدرے بے یقینی سے اس سو کے نوٹ کو دیکھا۔ نانی کا ہاتھ دائیں جانب اسی طرح اٹھا رہا اور وہ اس کے وجود سے یکسر لاعلم اور لاتعلق نظر آتی مکمل طور پہ بابا حیات کی طرف متوجہ تھی۔

''تو نے جو قسم کھائی تھی میرے سامنے اس کے بعد تو میں مر بھی جاؤں تو......''

''میں اپنی قسم توڑتا ہوں۔'' بابا حیات اس کی بات کاٹ کر گڑگڑایا۔

''وہ تو میں نے یونہی جذبات میں آ کر غصے سے کہا تھا۔ بھلا میں کوئی ایسا کر سکتا ہوں۔ یقین کر۔ تجھے خدا کا واسطہ ہے میرا پتا نہیں اور کتنے دن رہ گئے ہیں میری زندگی کے' میں اس ادھوری بات کو لے کر مرنا نہیں چاہتا۔ میری مشکل آسان کر دے۔'' لگتا تھا جیسے وہ ابھی نانی کے قدموں میں گر جائے گا۔ سکندر کو خدشہ ہوا کہ اس سے توجہ ہٹتے ہی نانی کی نظر سو کے نوٹ پہ پڑے گی اور وہ چونک کے اسے پرس میں دوبارہ ٹھونستے ہوئے وہی دس بیس روپے نکال کے اس کے ہاتھ پہ دھر دے گی۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور فوراً نوٹ جھپٹ لیا۔ کمرے سے نکلتے نکلتے اس کے کانوں میں جو آخری الفاظ پڑے وہ نانی کے تھے۔

''نہیں چوہدری حیات! میں تجھے اچھی طرح جانتی ہوں۔ تو سانس کی ڈور توڑ سکتا ہے مگر اپنی قسم نہیں۔ جا' کسی اور کو بے وقوف بنا۔ میں اندھی نہیں' یہ جو تو پچھلے تیس

پینتیس سالوں سے ادھر ڈیرہ ڈالے بیٹھا ہے کیا میں اس سے تیرے ارادے کی مضبوطی کا اندازہ نہیں لگا سکتی۔''

لیکن جس طرح سو کے نوٹ میں کھوئے ہوئے سکندر نے باقی گفتگو کو سرسری سا لیا اسی طرح باہر دوستوں میں سو روپے کی شو مارنے کی دھن میں اس نے اس پہ بھی کان نہ دھرا۔

وہ پہلی بار فلم دیکھنے نہیں گیا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ اس بار وہ الجھ سا رہا تھا حالانکہ فلم وہی روایتی سی تھی' مار دھاڑ' پیار محبت' گانے ڈانس اور جذباتی مکالموں سے بھرپور۔

''واہ یار! کیا زبردست ڈانس کرتی ہے نا بابرہ! ایمان سے۔'' جو نے شوکے کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔

''تجھے پتا ہے' فلم کیسے بنتی ہے؟ یہ پانچ منٹ کا گانا چھ دنوں میں بنا ہوگا۔ ذرا سا ہل کے تھک جاتی ہیں ہیروئن' ذرا ذرا سا ڈانس کیمرے میں بھر کے بعد میں پورا جوڑ کے فلم میں دکھاتے ہیں۔'' شوکے نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ اس کے بڑے بھائی نے حال ہی میں اپنی ایکسٹرا گروپ میں ڈانس کرنے والی بہن کی سفارش سے اسٹوڈیو میں اسپاٹ بوائے کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا تھا۔

''اور ہماری لڑکیاں۔'' ان کے ہاں ہماری بہنیں یا ہماری بیٹیاں کہنے کے بجائے ہماری لڑکیاں کہنے کا رواج تھا۔

''وہ ساری ساری رات ڈانس کرتے نہیں تھکتیں۔ کیوں سکندر؟'' اس کے لہجے میں فخر تھا۔ سکندر چونکا' اسے لگا جیسے اس کی الجھن مزید بڑھ گئی ہو۔

''یہ تو قسمت سے بابرہ اتنی بڑی ہیروئن بن گئی ورنہ سلونی اس سے لاکھ درجے خوب صورت ہے۔''

اس نے اپنی بہن کا نام لیا جو بابرہ جیسی ہیروئنز کی سہیلی کا کردار ادا کرتے ہوئے پکنک مناتے' کسی ڈانس میں پیچھے کھڑی ہو کے تھرکتے ہوئے یا کسی فنکشن کے سین میں ہجوم کا ایک حصہ بنی فلموں میں نظر آجایا کرتی تھی۔

''بس قسمت کی بات ہے جو سلونی ایکسٹرا گرل ہے اور یہ سپر اسٹار' ویسے سکندر جو نئی ہیروئن آئی ہے آج کل' اس کی شکل تمنا سے کتنی ملتی ہے۔ اسی کی طرح پتلی سی کمر ہے۔'' اب اس کا دھیان اپنی بہن سے ہٹ کے سکندر کی بہن کی جانب چلا گیا۔

''ہاں لیکن تمنا جیسی آنکھیں۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ الجھن کا سرا اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ معمہ حل ہو گیا۔

''کمینے تیری جرأت کیسے ہوئی میری بہن کا نام اپنی ناپاک زبان پہ لانے کی؟''

اسے فلم کا وہ سین یاد آ گیا جس میں ندیم اپنے جگری یار کا گریبان پکڑے دھاڑ رہا تھا۔

''میں تیری آنکھیں نکال لوں گا۔'' اس پہ وہ پہلی بار الجھا تھا کہ اگر اس بے چارے نے اس کی بہن کو دیکھ ہی لیا' اس کی تعریف میں چار لفظ کہہ ہی ڈالے تو ندیم کو برا کیوں لگا کہ وہ اس کی آنکھیں تک پھوڑنے کے درپے ہے۔

''آرام سے سلیم ......!'' خبیث چہرے والے ولن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ذرا سوچو' تمہارے دن پھر جائیں گے۔''

''میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دولت پہ جو عزت کو داؤ پہ لگا کے ملے۔'' ہیرو نے غیرت سے اُبلتے ہوئے جواب دیا۔

''تم نے اپنی گندی نظریں میرے گھر کی عزت پہ ڈالیں' میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ ایک بار پھر اس پہ پل پڑا تھا اور یہیں سے سکندر کی وہ بے نام سی الجھن بڑھ گئی تھی جسے شوکے کی بے سروپا باتوں نے بالآخر واضح انداز میں ابھار دیا۔

یہ کس دنیا کی باتیں تھیں؟

یہ کس دنیا کے باسی تھے؟

کیا اس دنیا کے جس کے بارے میں بابا حیات اسے بتایا کرتا ہے اور جس کے بارے میں اس نے کہا تھا۔

''شکر کر' تو اس دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا' ورنہ اپنی دنیا کے بارے میں تیرے اندر ایک دو نہیں بلکہ سو ڈیڑھ سو سوال پیدا ہوں گے۔''

اور کیا یہ الجھن ان ہی سینکڑوں سوالوں کا آغاز تھی؟

یہ بات واقعی اس کے لیے حیرت انگیز تھی کہ کوئی اپنی بہن کی تعریف کرنے والے کا گریبان پکڑ کے اس کی جان لینے کے درپے ہو جائے۔

''غیرت'' اور ''عزت'' کے یہ نئے اور اجنبی مفہوم اسے حیرت زدہ کر رہے تھے۔ زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ اپنی حیرت کا اظہار بھی کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے اگلے ہی ہفتے شوکا اور جونا اسے دوبارہ فلم پہ لے جانے کے لیے آئے مگر اس نے بجھے دل کے ساتھ انکار کر دیا۔

''پچھلی بار سارا خرچہ تو نے کیا تھا' ٹکٹوں کا بھی اور کھانے کا بھی۔ چل اس بار ہم مل کے کر لیتے ہیں' تو پیسوں کی فکر نہ کر۔'' شوکے نے جیب تھپتھپائی۔

''نہیں یار! پیسوں کی بات نہیں۔ بس میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' اس کی بے دلی دیکھ کے وہ دونوں چلے گئے۔ بابا حیات نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پاس بلایا۔

''کیا بات ہے کاکے! کیوں ٹال دیا یاروں کو' کیا ہو گیا ہے تیرے دل کو' جو اس عمر میں ہر چیز سے بھر گیا ہے۔''

''دل بھر نہیں گیا بابا! دل تنگ ہو رہا ہے۔'' اس نے اپنی الجھن بابا حیات سے بانٹنے کا سوچا۔

''بس اتنی سی بات۔'' وہ ساری بات جان کے ہنس پڑا۔

''تو ابھی کچا ہے' کاکا ہے' اس لیے حیران ہو رہا ہے یا پھر شاید تیرے دماغ کو سوچنے کی بیماری ہے ورنہ یہاں تیری عمر کے کتنے ہی کاکے لگے پھرتے ہیں' جیبوں میں تصویریں ڈال کے۔ بکنگ کراتے ہیں' شوکا معاوضہ طے کرتے ہیں۔ تجھے ہی کوئی بیماری ہے اور جہاں کا تو رہنے والا ہے' وہاں اس بیماری کے جراثیم آتے ہی نہیں' پھر تجھے یہ مرض کہاں سے لگا۔'' صاف لگ رہا تھا کہ وہ سکندر کے مسئلے کو مذاق میں ٹال رہا ہے۔ سکندر اس کی عدم دلچسپی اور غیر سنجیدگی پہ خفا ہو گیا اور روٹھے روٹھے انداز میں بولا۔

''تجھ سے لگے ہوں گے یہ جراثیم۔ تم تو باہر کے ہو نا۔'' وہ چونک کے اس کم عمر مگر کھوجی لڑکے کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''چل' یہ الزام بھی مجھ پہ لگا دے۔ پاگلا! مجھے سوچ بچار کرنے کا عارضہ ہوتا تو آج میں یہاں ہوتا۔ اپنی حویلی میں بیٹھا' مربعوں فصلوں کے حساب نفع و نقصان میں الجھا ہوتا' بال بچوں سے سیوا کرا رہا ہوتا۔''

''تمہاری شادی نہیں ہوئی بابا؟'' اچانک اسے خیال آیا۔

''نہیں' کر لیتا تو شاید اس بوجھ سے آزاد ہوتا۔ شادی نہیں کی اسی لیے تو......''

وہ کہیں کھو گیا۔ بوڑھی آنکھوں کی جوت کچھ اور کم ہو گئی۔ سکندر کچھ دیر اور اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اس کی خاموشی سے اکتا کے اگلا سوال کیا۔

''بتاؤ نا بابا! کیوں نہیں کی تم نے شادی؟''

''دماغ خراب تھا میرا۔'' وہ جھنجلا گیا' شاید کسی پرانی یاد سے واپس کھینچ لانا اسے پسند نہیں آیا تھا۔

''وہ تو تمہارا اب تک خراب ہے۔'' سکندر نے بدتمیزی سے کہا۔

''دس دس روپے کے لیے نائی کے آگے ہاتھ جوڑ کے گڑگڑاتے رہتے ہو' روتے رہتے ہو' وہ تمہاری بےعزتی کرتی رہتی ہے اور بالکل ٹھیک کرتی ہے۔ امی صحیح کہتی ہے تم پتا نہیں کیوں یہاں پینتیس سالوں سے مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہو۔ نہ کوئی کام نہ کاج' شادی کی ہوتی' اپنے گھر میں ہوتے' مانگتے بھی تو اپنی اولاد سے مانگتے۔'' وہ ہاتھ نچا نچا کے اسے سنا رہا تھا لیکن بابا حیات کو طیش میں آنے کی بجائے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ پلکیں موندے دیکھا تو رک گیا۔

''تمہیں برا نہیں لگ رہا میں تمہاری اتنی بےعزتی کر رہا ہوں؟''

''بےعزتی کروانے کے شوق میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔'' اس نے اتنا کہہ کے بازو آنکھوں پہ رکھ کے ٹیک لگا لی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ مزید گفتگو کے موڈ میں نہیں۔ وہ ایسا ہی تھا دل کرتا تو سکندر سے گھنٹوں باتیں کرتا رہتا۔ موڈ نہ ہوتا تو اس کے ہر سوال کے جواب میں گہری چپ سادھے رہتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سکندر کی اب اس سے بے تکلفی بھی بڑھ گئی تھی۔ بچپن تو ان چوباروں پہ ویسے ہی بہت جلد رخصت ہو جاتا تھا۔ پندرہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اب سکندر بھی ایک مکمل مرد بن چکا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کی سوچ دو مختلف مردوں کی سوچ میں بٹ چکی تھی۔ ایک اس بازار کا مرد جو دھڑلے سے ماں اور بہنوں سے ان کی خون پسینے کی کمائی میں سے جیب خرچ مانگتا' اس کی سیڑھیاں چڑھ کے اوباش اوپر آ رہے ہوتے اور وہ ان کے قریب سے بے پروائی سے گزر کے نیچے اتر رہا ہوتا۔ کہیں کہیں ایک دوسرا مرد بھی تھا جو اپنے ہونے پہ خود ہی پریشان اور اپنی سوچ سے خود ہی سہما رہتا تھا۔

''ان سوچوں کے ساتھ یہاں گزارا نہیں ہونے والا۔'' وہ اسے یہ کہہ کر بھگانے کی کوشش کرتا۔ وہ کچھ دیر کے لیے غائب ضرور ہو جاتا لیکن تب بھی سکندر اس کی موجودگی پوری طرح محسوس کرتا۔ اس کی خاموشی کے باوجود بھی۔ خالی خالی نظروں سے تمنا کو گھنگھرو باندھ کے پریکٹس کرتے ہوئے دیکھ کر اس کا جی چاہتا' تمنا کو ایک تھپڑ مار کے دیوار کے ساتھ کونے میں بٹھا دے۔ کبھی دل کرتا سازندوں کے ساتھ بیٹھی مردمار

قسم کے قہقہے لگاتی ترنم کو چوٹی سے کھینچ کر کمرے میں بند کردے۔ تب وحشت کے مارے وہ وہاں سے اٹھ بھاگتا' مگر کب تک' بہرحال اسے واپس تو یہیں آنا ہوتا۔

''کاکے! تو میری سمجھ میں نہیں آتا' کسی ایک طرف کا کیوں نہیں ہوجاتا۔''

''اور بابا! مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی یہ تو سنا ہے اور دیکھا بھی ہے کہ بڑے بڑے نواب ان سیڑھیوں سے اتر کر فٹ پاتھوں پہ آگئے' کئی ایک نے زمینیں' جاگیریں بیچ کے نچھاور کر ڈالیں۔ تم نے بتایا نہیں مگر مجھے پتا ہے کہ تم چوہدری حیات سے بابا حیات ایسے ہی بنے ہوگے' سب کچھ لٹا کے پھر اسی چوکھٹ کے ہوگئے لیکن حیرت اس بات پہ ہے کہ تمہارے اندر میں نے تماش بینوں والی کوئی بات کبھی دیکھی نہیں۔ نہ مجرا دیکھتے ہو' نہ کوئی عاشقی معشوقی۔'' عمر کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بے باک ہوتی جارہی تھی۔

''کر بیٹھا عاشقی بھی اور معشوقی بھی۔''

''میں نہیں مانتا' تمہاری ہر بات پہلی بات سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک بار تم نے میرے پوچھنے پہ کہا کہ ہاں میں نے شادی نہیں کی کیونکہ میرا دماغ خراب تھا۔ بعد میں مجھے یاد آیا کہ دماغ تو میرا خراب تھا جو تمہاری گپ کو سچ مان بیٹھا۔ بہت پہلے ایک بار تم نے ہی تو بتایا تھا کہ تمہاری بیوی اور تمہاری دونوں چھوٹی بہنوں کے درمیان کھٹ پٹ رہا کرتی تھی' اگر تم نے شادی نہیں کی تھی تو کیا تمہاری بہنوں نے صرف نندوں والا شوق پورا کرنے کے لیے اور لڑائی جھگڑا کرنے کے لیے خود سے بھابھی گھڑ کے گھر بٹھا رکھی تھی؟'' وہ پچھلی بات یاد دلانے لگا۔

''کاکے! تو نے پوچھا تھا شادی کیوں نہیں کی؟ میں نے کہا ہاں نہیں کی' دماغ خراب تھا۔ اب مجھے کیا پتا تو کس شادی کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ وہ والی شادی میں نے نہیں کی تھی' میری ماں نے کرائی تھی۔ شادی کرنے اور شادی ہوجانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

''دل تو چاہتا ہوگا؟'' سکندر نے چھیڑا۔

''ہاں' دل کی مان لیتا' ایک بار حوصلہ کرلیتا تو یہ زندگی بے کار نہیں جاتی۔''

''واہ' بڑا طوفانی عشق ہے جو بڑھاپے میں بھی آہیں گرما گرم نکل رہی ہیں۔''

''ہاں' عشق تو تھا لیکن شادی نہ کرنے کا غم عشق کی وجہ سے نہیں۔ بس یوں سمجھ' وہ شادی جو میں نہ کرسکا' ایک جوا تھا جس کی بازی کھیلنے کی میری ہمت نہ پڑی اور میں خسارے میں رہا۔''

''ہمیشہ مشکل باتیں کرتے ہو۔'' وہ تنگ آکر اٹھ گیا۔

* * *

''سکندر' مکان کو رکشہ کرا کے لے جا' آج اس کی وین نہیں آئی۔'' زہرہ نے اسے جھنجھوڑ کے جگاتے ہوئے کہا۔

''اوہو' نہیں آئی وین تو وہ بھی نہ جائے۔ روز اسکول جانا کیا بہت ضروری ہے؟'' اسے صبح صبح جاگنے کی عادت نہیں تھی سو جھنجلا گیا۔

''اس کے پرچے ہو رہے ہیں۔ وہ بھی بورڈ کے۔ نہ جائے تو کیا دس سال کی محنت ضائع ہونے دے۔'' زہرہ نے اسے ایک کراری دھپ لگائی۔

''مصیبت۔'' وہ طوعاً و کرہاً اٹھا۔

''آج ذرا جلدی اٹھنا پڑ گیا تو تجھے مصیبت لگ رہا ہے' اگر خود اسکول جانا پڑتا' روز سویرے جاگنا پڑتا' تب پتا نہیں تجھ پہ کیا پہاڑ ٹوٹتے۔'' اس نے نکلتے نکلتے سنایا۔

''اسکول داخل کرایا ہوتا تو پتا چلتا نا مجھے۔'' وہ بڑبڑایا' اس کی تو ضرورت ہی نہ سمجھی کسی نے۔ ناچنے جوگا نہیں تھا' چلو چار حرف پڑھنے کے قابل ہی ہوجاتا۔''

''چار حرف پڑھ کے تو جیسے تو نے ہیرا بائی کے کوٹھے کا منشی لگنا تھا۔'' چکوری نے اس کی بڑبڑاہٹ سن کر قہقہہ لگایا۔ اس کے کان ویسے بھی سکندر کی باتوں پہ اور نظریں اس کے چہرے پہ لگی رہتی تھیں۔

''تو تو چپ کر' جمعدارنی۔'' اس نے آنکھیں نکالیں۔ چکوری' جونے کی بہن یعنی پینو کی بیٹی تھی۔ بچپن سے ماں کے ساتھ اس کوٹھے پہ جھاڑو پونچھا کرنے آتی تھی۔ جب سے پینو کے جوڑ کام کرنے کے قابل نہ رہے تھے' وہ اکیلی آنے لگی تھی اور تب سے ہی سکندر کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اٹھارہ' انیس سالہ سکندر عمر کے تقاضوں کے عین مطابق مخالف صنف میں کشش تو محسوس کرنے لگا تھا مگر اتنا بدذوق بہرحال نہیں تھا کہ کالی کلوٹی' موٹی بھدی چکوری کی جانب ملتفت ہوجاتا۔

''دفع ہو' سویرے سویرے میرے متھے نہ لگا کر۔'' اس کے مسلسل وہاں کھڑے ہو کے نظروں کے تیر چلانے پہ سکندر نے بری طرح سے اسے دھتکار دیا۔ وہ بھی ایک ڈھیٹ تھی۔

''رب کولوں ڈر سوھنیا۔'' بڑے ہی فلمی انداز میں اس نے گردن مٹکائی۔

''ہوسکتا ہے ساری زندگی تجھے سویرے سویرے یہی شکل دیکھنے کو ملے۔''

''ہاں اپنی ماں کی طرح تو بھی اسی کوٹھے پہ جھاڑو پھیرتی رہنا آخری سانسوں تک۔ پھر شاید ایسا ہی ہو۔'' وہ اسے پیچھے دھکیلتا کمرے سے نکل گیا۔

''میرا دماغ خراب نہیں ہے۔ ہونہہ جھاڑو' تجھے کیا پتا سکندر! میں نے تیرے حوالے سے کتنے خواب دیکھ رکھے ہیں' اگر تو ہاں کر دے تو میں بھی اس کوٹھے کا گند صاف کرنے کی بجائے ادھر کی رانی بن کے عیش کروں۔'' یہ تھے چکوری کے بلند عزائم۔ پندرہ سالہ چکوری آج سے نہیں پچھلے دو تین سالوں سے تمنا اور ترنم کے زرق برق کپڑے' میک اپ اور جیولری وغیرہ دیکھ دیکھ کے للچاتی رہتی تھی۔

''وڈی بی بی جی! مجھے بھی ادھر ہی رکھ لو' میں بھی آپ کے کام کروں گی۔'' ایک دن اس نے ہیرا بائی اس نے کے پاؤں پکڑ لیے۔

''ایسے ہی رکھ لوں؟'' وہ اس کی بات بالکل نہ سمجھی۔ ''مہینے کے اچھے خاصے پیسے کما لیتی ہے۔ میں تجھے اپنے گھر بٹھا لوں تو ظاہر ہے باقی کا کام تو چھٹ جائے گا۔ تیری ماں تو مجھے جھولی بھر بھر کے دعائیں دے گی...... یا پھر مجھے ان باقی گھروں کے برابر پیسے تجھے دینے ہوں گے۔''

''نہیں بی بی جی! یہ والا کام نہیں۔ وہی جو تمنا باجی' ترنم باجی اور شبنم باجی کرتی ہیں۔'' اس نے ہیرا بائی کے تاثرات بدلتے دیکھے تو فوراً وضاحت کی۔

''تو پاگل تو نہیں ہوگئی۔ جا بھاگ یہاں سے۔'' ہیرا بائی نے اپنے پیر کھینچ لیے۔

''کیا کہہ رہی تھی چکوری؟'' مکان نے اسے چکوری کو دھتکارتے دیکھ لیا تھا۔

''بکواس کر رہی تھی اور اسے آتا کیا ہے؟'' سکندر نے رکشے والے کو ہاتھ دیتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں کیا شوق ہے تجھے پڑھنے کا' کیا کرے گی پڑھ کر...... منسٹر لگے گی؟'' اب تک جلدی اٹھنے کا غصہ تھا۔

''کیا پتا لگ جاؤں۔'' مکان نے چڑایا۔

''بڑے بڑے منسٹر تو ویسے ہی جناب کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے نظر آئیں گے۔'' رکشہ ڈرائیور نے سامنے لگے شیشے کو مکان پہ فکس کرتے ہوئے اس گفتگو میں دخل دیا۔ وہ جس بازار سے انہیں بٹھا کے لا رہا تھا جس گلی اور جس کوٹھے سے اترتا دیکھ چکا تھا' اس لحاظ سے بے تکلفی کا حق گویا اسے خود بخود حاصل ہوگیا تھا۔

''اپنے کام سے کام رکھو۔'' سکندر نے ڈپٹ کے کہا۔

''اور تم اپنے کام سے مطلب رکھو۔'' رکشے والے نے آنکھ مار کے کہا۔ سینٹر نزدیک ہی تھا۔

رکشے سے اترتے ہوئے مکان نے دس کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا تو رکشے والا قربان ہو جانے والے انداز میں بولا۔

''کیا غضب کرتے ہو سرکار! ہم غریب کچھ دینے کے لائق نہیں مگر ایسی بات بھی نہیں کہ ''آپ'' سے لیں۔ بھلا آپ سے پیسے لیتے ہم اچھے لگتے ہیں۔'' اس نے مکان کے بڑھے ہوئے ہاتھ پہ بے تکلفی سے اپنا ہاتھ رکھ کے اس کی مٹھی بند کی۔

''کرشن نگر چلو گے؟'' چادر میں لپٹی ایک نوجوان لڑکی نے رکشے والے کو متوجہ کیا۔

''جی بہن جی' بیٹھیں۔'' اس کا لہجہ اور انداز دونوں ہی یک دم تبدیل ہوگئے۔ سکندر نے یہ تبدیلی فوراً محسوس کی۔

گیٹ تک پہنچتے پہنچتے ایک اور رکشہ ان کے قریب رکا۔ اسی کی عمر کی ایک لڑکی اور سکندر کی عمر کا ہی ایک لڑکا نیچے اترے۔ لڑکے نے اپنی جیب سے کرایہ نکالا' رکشے والے کو دینے کے بعد پرس واپس جیب میں رکھنے والا تھا کہ اس لڑکی نے بڑے مان اور استحقاق کے ساتھ کہا۔

''بھیا' مجھے بھی تھوڑے پیسے دو نا' برگر لوں گی۔''

''چٹوری۔'' اس کے مصنوعی غصے میں ایک فخر تھا۔ دینے والوں کا سا فخر' جس سے سکندر کو اپنی ذات محروم لگی۔ وہ دینے والا کب تھا' وہ تو لینے والا تھا۔

''اپنے کام سے مطلب رکھو۔''

اور ایسی بہنوں کے بھائیوں کے ذمے زیادہ سے زیادہ کام کیا لگایا جاتا ہے اس سے وہ واقف تھا۔' وہ' وضاحت کرنا چاہتا تھا۔

''نہیں' میں تو اپنی بہن کو پرچہ دلانے لے جا رہا ہوں۔ ''سپلائی'' کرنے نہیں۔'' مگر وہ چپ رہا۔ اس کے لب ہی نہ کھلے۔ مکان بھی گہری چپ لیے اندر بڑھ گئی۔ پتا نہیں اسے کیا ہوا کہ واپس لوٹنے کی بجائے گیٹ کے نزدیک کھڑا ہوگیا۔ ایک گھنٹہ' دو گھنٹہ...... حتیٰ کہ تین گھنٹے گزر گئے۔ مکان پرچہ دے کر باہر نکلی۔

''ارے تم آ گئے' میں تو سمجھ رہی تھی مجھے انتظار کرنا پڑے گا یا تو واپس جا کے دوبارہ سو گئے ہو گے یا جوتے وغیرہ کے ساتھ نکل گئے ہو گے۔''

''میں گیا ہی نہیں۔''

''وہ کیوں؟''

''بتاؤں گا' گھر چلو۔'' وہ چپ ہوگئی۔ اس بار وہ اسے لے کر رکشے کے بجائے ویگن میں بیٹھا۔ اس نے تب بھی کوئی سوال نہ کیا۔ اسٹاپ سے پیدل گھر جاتے ہوئے سکندر بولا۔

''مسکان تم مت پڑھو۔ بس جتنا پڑھ لیا' کافی ہے آگے مت پڑھنا۔ کالج جانے کا سوچنا بھی مت۔''

''لیکن کیوں؟'' تمہیں کیا اعتراض ہے۔ مشکلوں سے تو امی کو منایا ہے۔ ورنہ ترنم نے چھ تو تمنا نے آٹھ جماعتیں مشکل سے پاس کی ہیں اور تم تو خیر سرے سے اسکول گئے ہی نہیں۔''

''اچھا کیا میں نے جو اسکول نہیں گیا۔ اپنی دنیا سے نہیں نکلا اور تم یہ مت سمجھو کہ امی تعلیم کے بارے میں تمہارے بھاری بھرکم دلائل سن کر تمہیں آگے پڑھانے پہ رضامند ہوئی ہیں' یہ تو سرانگینہ خالہ کا کمال ہے۔ انہوں نے یہ پٹی پڑھائی ہے کہ اونچے طبقے میں اپنی مارکیٹ ویلیو بڑھانے کے لیے تعلیم کے کیل کانٹوں سے بھی لیس ہونا پڑتا ہے۔''

''چلو' جس کے کہنے پہ بھی سہی میرا کام تو ہوگیا۔ اب تم کیوں اعتراض کر رہے ہو؟''

''آخر تم پڑھ لکھ کے کرو گی کیا؟ کہیں استانی تو نہیں لگ جاؤ گی' ڈاکٹرنی تو نہ بن جاؤ گی۔''

''میں جانتی ہوں' میں کچھ ''بننے'' کے لیے اس دنیا میں نہیں آئی۔'' اس کی آواز کپکپا گئی۔

''میں تو مٹی میں مٹی ہونے آئی ہوں۔ سوچا دل کی ایک خواہش تو پوری کرلوں۔ زندگی میں نہ سہی دل میں' دماغ میں تو روشنی بھرلوں۔''

''خاک روشنی بھرے گی تو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو دیکھ کے اور بھی غصے میں آگیا۔

''بڑے ست لگ رہے ہو۔ لگتا ہے ساری رات لگا کے آئے ہو۔'' دودھ دہی والے نے اسے مخاطب کیا۔

''چل اچھا اب تو بھی دھندے سے لگا۔'' اس کی جانب سے کوئی جواب نہ پانے کے باوجود وہ کہتا رہا۔ سکندر کا شدت سے دل چاہا کہ سامنے پڑی ٹوٹی ہوئی اینٹ اٹھا کے اس کا سر توڑ دے۔ بہت مشکل سے اس نے اس خواہش کو دبایا اور رخ پھیر لیا۔

دوپہر کے پونے ایک بج رہے تھے' تنگ' لمبی سی گلی میں ہو کا عالم تھا۔ یہی گلیاں جو رات کو جشن کا سا سماں پیش کررہی ہوتی تھیں' روشنیاں' قہقہے' گانے' گھنگھروؤں کی جھنکار' اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبوئیں اور لمبی لمبی گاڑیوں کے مسلسل بجے ہارن جوان گلیوں میں پھنس سی جایا کرتی تھیں۔

سکندر دونوں کہنیاں گھٹنوں پہ ٹکائے بند ہتھیلیوں پہ چہرہ رکھے مٹی میں مٹی ہوتی پھولوں کی پنکھڑیاں دیکھنے لگا۔

''میں تو مٹی میں مٹی ہونے دنیا میں آئی ہوں۔'' اسے مسکان کی بات یاد آئی۔

یہ مرجھائی ہوئی پتیاں کل رات تک کسی ہار یا گجرے کی زینت تھیں۔ کسی کلائی سے لپٹی اسے خوشبو دے رہی ہوں گی مگر اب......

ابتدا ہی سے تینوں بہنوں سے اس کی وابستگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ تمنا اور ترنم تو یوں بھی خود میں مگن رہتیں' ننھی سی مسکان میں بھی اسے کوئی کشش محسوس نہ ہوتی' اس کا بچپن تو ان ہی گلیوں میں خاک اڑاتے' سیڑھیوں پہ بھاگتے دوڑتے یا پھر بابا حیات سے جڑ کر بیٹھے گزر گیا۔ یہ تو جب لڑکپن میں اسے سوچنے اور کڑھنے کی بیماری لاحق ہوئی تب سے اس نے اپنی بے مصرف زندگی کے ساتھ ساتھ چھوٹی سی مسکان پہ بھی ترس کھانا شروع کردیا۔ اسے یہ ہمدردی اس کا بچپن تباہ ہوتے دیکھ کے پیدا ہوئی۔ وہ فطرتاً بھی زیادہ ہی معصوم تھی۔

اور یہ ہمدردی تب محبت میں بدل گئی جب ایک بار نانی کی خالہ زمرد سے گفتگو کے دوران اسے پتا چلا کہ وہ اور مسکان ایک باپ کی اولاد ہیں یعنی سگے بہن بھائی ہیں۔ اب تک ہیرا بائی اس کی ماں زہرہ کے تین بار بھاری بھاری رقم لے کر نکاح کرچکی تھی۔ پہلی بار جس سے نکاح کیا اس کے عشق میں زہرہ خود مری جارہی تھی۔ زہرہ صرف چھ ماہ بعد ہی روتی دھوتی واپس آگئی۔ ایک بھرے پرے شریف لوگوں کے خاندان میں رچ بس کے زندگی گزارنا اس کے لیے مشکل نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ وہ چاہتی بھی تو یہ شریف لوگ کبھی اسے کامیاب نہ ہونے دیتے۔ آٹھ ماہ بعد تمنا پیدا ہوئی تب تک زہرہ کا غم کم

ہو چکا تھا۔ اگلا شکار اس نے ماں کی ہدایت کے عین مطابق پھانسا تھا۔ اس بار ہیرا بائی نے نکاح کے عوض لاکھوں کی جائیداد اپنے نام لکھوائی تھی۔ وہ پینسٹھ سالہ جاگیردار تین سال بعد ہی مر کھپ گیا۔ ان تینوں سالوں میں زہرہ بڑی تن دہی کے ساتھ اسے بٹورنے میں مصروف رہی۔ ایک بار پھر کوٹھے پہ واپس آئی تو نئی شان وشوکت اور چند ماہ کی ترنم کے ساتھ' تمنا کو تو وہ پہلے ہی نانی کے پاس چھوڑ گئی تھی۔

زمرد بھی ایک بیٹی لے کے اس سیاست دان سے طلاق کے بعد واپس آ چکی تھی' جس نے اس سے شادی کی خاطر صرف دعوے کیے تھے۔ دوسری بیٹی نگینہ نے بھی صرف لڑکیاں ہی پیدا کیں۔

زہرہ ایک بار پھر ایک دبئی پلٹ سیٹھ کی باتوں میں آ گئی۔ سکندر اور مسکان اسی تیسری شادی کا نتیجہ تھے۔ دبئی میں رہنے کا شوق بھی پورا ہو گیا۔ شادی شدہ زندگی گزارنے کے سارے ارمان بھی نکال لیے اب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تین سالہ سکندر اور چند ماہ کی مسکان کو لے کر پاکستان آ گئی۔

شاید یہ وہی کشش تھی جو وہ رفتہ رفتہ مسکان کی جانب کھینچ رہا تھا۔ اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد وہ اور بھی مسکان کے قریب ہو گیا تھا۔

* * *

''سکندر! میری بات کو سنجیدگی سے لو' تم اپنے آپ کو ضائع کر رہے ہو۔ کچھ کرتے کیوں نہیں؟ کب تک ہاتھ پیر بے کار رکھے مفت کی کھاتے رہو گے۔''

''تو کیا شوکے والا کام شروع کر دوں؟ یا پھر گامے اور رزاق کی طرح بدمعاشی شروع کر دوں' کرائے کا غنڈہ بن کر توڑ پھوڑ کرتا پھروں...... بتا؟''

''دنیا میں اور بھی بہت کام ہیں کرنے کو۔''

''ہاں' دنیا میں لیکن اس بازار میں نہیں۔ اس بازار میں عورتوں کے کرنے کو بھی بس ایک ہی کام ہے اور مردوں کے لیے بھی۔''

''تو تمہیں کون مجبور کر رہا ہے کہ تم اس دنیا میں رہو تم کہتے ہو نا کہ اس نگری میں عورت راج ہے۔ مرد سب سے بے کار چیز ہے یہاں لیکن میں کہتی ہوں ایسا راج کس کام کا جو اتنا مجبور اور بے بس کر دے کہ انسان اپنی مرضی سے سانس نہ لے سکے۔ تم کم از کم اتنے آزاد تو ہو کہ جب جی چاہے یہاں سے جا سکتے ہو۔ تم پہ کوئی روک ٹوک نہیں تم اس بازار سے نکلو گے تو کسی فٹ پاتھ پہ بھی جا کر بس سکتے ہو۔ تم سے کوئی سوال نہ

ہو گا کہ تم درخت پہ اگے تھے یا آسمان سے ٹپکے تھے لیکن میں......'' اس کی آواز میں حسرتیں ہی حسرتیں تھیں۔

''تو تو چاہتی ہے میں سڑکوں پر رلتا پھروں۔ فٹ پاتھوں پر ٹھٹھر کے مر جاؤں۔ نا جی نا' یہ نہیں ہو سکتا اب۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔ اتنے سال مفت کی کھانے کے بعد اب محنت مزدوری کرنے کا خیال ہی جان کھینچ کے لے گیا تھا اس بے کاری سے الجھن اپنی جگہ' اپنی مشکوک حیثیت پہ شرمساری بھی ٹھیک لیکن جان بوجھ کر خود کو حالات کے دھکے کھانے کے لیے اس چھت سے محروم کر لینا' بہت دل گردے کا کام تھا۔ اتنی ہمت اور حوصلہ دکھانا کسی طوائف زادے کے بس سے باہر کی چیز تھی۔

''نہ تو میں الف کا بے جانتا ہوں کہ کرسی میز والی نوکری مل جائے اور نہ ہی اب ان ہاتھوں سے پتھر اینٹیں توڑنے کا کام ہو گا۔''

''تم اسی بازار میں یا کہیں اور کوئی چھوٹی موٹی دکان کھول سکتے ہو۔ کسی ورکشاپ میں کام کر سکتے ہو' کسی ہوٹل میں بیرے لگ سکتے ہو۔''

''دکان کھولنے والی بات میں دم ہے۔ بات کرتا ہوں نانی سے۔ ظاہر ہے دکان ڈالنے کے لیے پیسہ تو اسی سے لینا ہو گا۔'' سکندر نے کچھ کچھ متفق ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

''لو جی ہیرا بائی کا لڑکا دکانداری کرے گا۔''

بابا حیات نے یہ تازہ ترین خبر سننے کے بعد زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''کیا کہتی ہے تیری نانی؟''

''نانی کہتی ہے میرے پاس اپنی اولاد کے لیے تو ہے' مگر اولاد کی اولاد کو نہیں بانٹ سکتی۔ اولاد کو بھی صرف اس لیے دے سکتی ہوں کہ جو کچھ ہے ان کے دم پہ کمایا ہے۔ جا کے اپنی ماں سے مانگ۔''

''اور ماں؟''

''ماں کہتی ہے جو کمایا ہے اپنے بل بوتے پہ کمایا ہے۔ ترمنا کے باپ نے سوائے دکھ کے کچھ اور نہیں دیا۔ ہاں ترنم کے باپ نے جو کچھ لکھ کے دیا' اس پہ میرے بعد ترنم کا ہی حق ہے۔ تجھے کیسے اس میں سے دو تین لاکھ نکال دوں اور تیرے باپ نے جائیداد وغیرہ کیا خاک دینی ہے' بڑی مشکل سے چند زیورات وغیرہ اس سے بچا کے واپس پاکستان آئی تھی ورنہ تو وہ یہ بھی ہڑپ کر جاتا۔''

''ہاں بھئی' بڑی حسابی کتابی عورت ہے۔ آخر ہیرا بائی کی بیٹی ہے۔''

''گل سن وے سکندر!'' پنو بڑے جلالی انداز میں کہتے ہوئے اس کے سر پہ آ کھڑی ہوئی۔ وہ اس وقت بابا حیات کے ٹھکانے پہ بیٹھا دکھ سکھ کہہ رہا تھا جب پنو کی کراری اور پاٹ دار آواز پہ پلٹ کے اس نے دیکھا۔ وہ اب کم ہی یہاں کا رخ کرتی تھی۔ جب سے چکوری نے کام سنبھال لیا تھا وہ خاص خاص موقعوں پہ صرف نذرانے وصول کرنے آیا کرتی لیکن اس وقت اس کے تیور بتا رہے تھے کہ آمد کا مقصد کچھ اور ہی ہے۔

''میری کڑی کو ورغلانا چھوڑ دے۔''

''کسے؟ چکوری کو؟'' پہلے وہ جی بھر کے حیران ہوا اور بعد میں جی بھر کے ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی کا ساتھ بابا حیات نے بھی دینے کی کوشش کی مگر کھانسی کے دورے نے اسے یہ ساتھ دیر تک نہ دینے دیا۔ پنو اسے اس طرح ہنستے دیکھ کر جز بز ہوئی۔

''میں نے کوئی جگت نہیں سنائی جو منہ پھاڑ رہا ہے۔ سیدھی طرح میری چکوری کا پیچھا چھوڑ دے' ورنہ میں بات ہیرا بائی تک لے جاؤں گی۔ وہ بھی تو اپنے بھولے بھالے کے کرتوت دیکھے۔''

''او اس نے کیا کیا ہے پنو! خوامخواہ کاکے پہ ناراض ہو رہی ہے؟''

''یہ اب اتنا کاکا نہیں رہا بابا!'' پنو نے اپنی آنکھیں مقدور بھر نکالتے ہوئے اسے گھورا۔

''میری کڑی پہ بری نظر رکھتا ہے۔''

''اس کے ایسے نصیب کہاں ماسی! کہ میرے جیسا گبھرو اس پہ نظر ڈالے۔'' سکندر نے پھبتی کسی۔ ''چڑیل خود ہاتھ دھو کے میرے پیچھے پڑی ہے۔ جا' اسے سنبھال' گرتی پڑ رہی ہے میرے پیروں میں۔''

''وہ کہتی ہے تجھ سے شادی کرے گی' ایسے ہی تو نہیں کہہ رہی ضرور تو نے لارے دیے ہوں گے۔''

''مجھے پاگل کتے نے نہیں کاٹا۔'' وہ اب واقعی بگڑ گیا۔

''دیکھ کاکے! اگر واقعی ایسا ہے تو اب مکرنے کی ضرورت نہیں۔'' بابا حیات بھی کچھ کچھ مشکوک ہوا۔

''جوانی میں کسی نہ کسی پہ دل آ ہی جاتا ہے اور پنو! تو بھی اس بات پہ ہنگامہ نہ

کھڑا کر۔ بیری پہ پتھر آنا بھی نئی بات نہیں۔ دونوں اگر واقعی اک دوجے کو پسند کرتے ہیں تو بیاہ کر ڈال ان کا۔''

اس تجویز پہ سکندر تڑپ اٹھا لیکن پنو کا حال اس سے بھی برا تھا۔ اس سے پہلے کہ سکندر احتجاج کرتا' خود پنو ہاتھ نچا نچا کے بابا حیات کو اس نامعقول تجویز پہ صلواتیں سنانے لگی۔

''ہم لوگوں کا گند اٹھاتے ہیں بابا! گند ڈالتے نہیں۔ یہ مجھے منظور ہے لیکن کوٹھے پہ بیٹھ جائے یہ مجھے گوارا نہیں۔'' اس کا واویلا سن کر سکندر ساکت رہ گیا۔ اس کا سارا غیض وغضب جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''یہ بیٹیاں بیچتے ہیں' بہو کو کون سا تخت پہ بٹھا کر راج کرائیں گے۔ ٹھیک ہے' ہم لوگ اس دنیا میں سب سے نیچ سمجھے جاتے ہیں' لوگ ہمارے کھانے پینے کے برتن الگ رکھتے ہیں۔ ہمیں جمعدار' چوڑا اور چمار جیسے الفاظ سے پکارا جاتا ہے' مگر پھر بھی بابا...... پھر بھی ہم گھروں کی ضرورت ہیں۔

یہ تمہاری ہیرا بائی...... یہ زمرد...... یہ نشو اور زہرہ...... بڑھیا کپڑے پہن کے' سونے کے گہنے لٹکا کے' مہنگی خوشبوئیں لگا کے بھی کسی شریف گھر میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ لوگ اپنی بہو بیٹیوں کو ان کے سائے سے بھی دور رکھتے ہیں۔ اس طرح ہم جمعداران کوٹھے والوں سے تو عزت دار ہی ہیں۔ خبردار! جو میری چکوری کا ذہن دوسری طرف لگانے کی کوشش کی۔'' وہ گرجتی برستی چلی گئی اور سکندر کو لگا آج اسے اٹھارہ سال کی زندگی میں سب سے سنگین گالی دی گئی ہے۔

* * *

''مکان! بس بڑے ہو گئے تیرے ڈرامے۔ تجھے کالج اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ تو بس پڑھائی کی ہو کے رہ جا۔ جب کام ہو' تیرے پاس یہی بہانے تیار ہوتے ہیں۔ کل انگریزی کا پرچہ ہے یا حساب کی تیاری کرنی ہے۔ تو اب بچی نہیں رہی' سیدھی طرح سے کام پہ لگ۔ ترنم نے تیری عمر میں ہفتے میں پانچ راتیں شو کرنے شروع کر دیے تھے۔ یہی تو دن ہیں کمانے کے اور کیا میری عمر میں ناچے گی جب ہڈیوں میں دم نہ رہے گا۔''

''بس ماما! ایک سال اور...... میرا ایف اے تو پورا ہو لینے دیں۔'' اس نے التجا کی جیسے کوئی سولی چڑھنے سے پہلے چند لمحوں کی مہلت مزید مانگ لے۔ گنتی کے چند

سانس اور...... وہ جانتی تھی اسے دیر یا بدیر کرنا تو یہی ہے۔ بس کسی طرح ٹالے جا رہی تھی۔

''ایک سال...... اگلے مہینے تو سترہ سال کی ہو جائے گی۔ اس بازار میں اتنی عمر تک لڑکی بیٹھی نہیں رہتی' جتنی کمائی کرنی ہے کر لے تاکہ وقت پہ تیری شادی ہو۔''

''ہونہہ شادی...... ماما پلیز......خود کو تو یہ دھوکا مت دیں۔'' اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔

''دھوکا......؟''

''یہ خود کو دھوکا دینے والی بات ہی تو ہے۔ دو چار سالوں کے لیے کسی سیٹھ کو اپنی لڑکی بیچ دینے کو شادی کا نام دیا ہوا ہے۔ سودا ہوتا ہے لاکھوں کا اور ایگریمنٹ ہوتا ہے نکاح نامہ۔ مال بٹور کے آخر واپس تو یہیں آنا ہوتا ہے۔ ذرا دم لے کے دوبارہ کسی کی برائے نام بیوی بننے کے لیے۔''

''شکر کر نکاح تو پڑھایا جاتا ہے' وہ بھی اس لیے کہ ہم خاندانی لوگ ہیں' ہمارا جدّی پشتی روزگار ہے' ہمارے خون میں شامل ہے اور ہم اس کو تمام تر ایمان داری اور روایتوں کے ساتھ زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس بازار میں ہیرا بائی کے کوٹھے کے علاوہ شاید ہی کوئی اور ہو جہاں ایسا ستھرا کام ہوتا ہے۔'' اس نے اپنے کام کے لیے ایک نئی دلیل ایجاد کی۔

''چند دنوں کے لیے ہی سہی' بیوی تو کہلاتی ہے نا۔ ورنہ یہاں...... توبہ توبہ۔ اسی لیے تو ماں کی تیری نگینہ خالہ سے نہیں بنی۔ اس کا ذہن اور طرح کا ہے۔ پرانے اصولوں اور رواجوں کو وہ نہیں مانتی۔ نئے زمانے کے ڈھنگ اپنانا چاہتی تھی' اوپر سے بندہ بھی ایسا ہی بے غیرتا ڈھونڈ لیا۔ زیادہ سے زیادہ مال کمانے کے چکر میں وہ سب کرنے پہ تیار تھی' اس لیے اسے الگ کر دیا۔''

''مجھے یہ سب کیوں سنا رہی ہیں آپ؟'' وہ اکتا گئی۔

''بتا رہی ہوں کہ نہ تو اس حد سے آگے بڑھنے کی اجازت کسی کو ہے اور نہ ہی اس سے پیچھے رہنے کی۔ آگے بڑھنے والی کو ماں نے فوراً نکال باہر کیا' اب تو قدم پیچھے ہٹائے گی تو میں مار مار کے سیدھا کر دوں گی۔ ماں کو تیری بڑی فکر ہے۔ بستر سے لگ گئی ہے پھر بھی ہر وقت مجھ سے تیرا ذکر کرتی ہے۔ اس کی تسلی کو میں نے کہہ رکھا ہے کہ تو اب بھی باقاعدگی سے ماسٹر سے سبق لیتی ہے۔ اگر یہ بتا دوں کہ پڑھائی کا بہانہ بنا کے

تو نے دو مہینے سے ایک بھی ڈانس کا سبق نہیں لیا تو بے چاری کا بلڈ پریشر اور بڑھ جائے گا۔ اب بھی سدھر جا۔''

زہرہ نے مسکان کو ڈراوے دیے لیکن اس کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ ہیرا بائی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ بیماری اس کی جان لے کر ٹلی۔

رات گئے جب سکندر' نانی کو دفنا کے واپس لوٹا تو بابا حیات کی چارپائی خالی تھی۔ وہ دھک سے رہ گیا۔

''امی...... امی......'' وہ زور زور سے پکارتا ایک وقت میں کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چڑھا۔

''امی کہاں ہیں؟'' اس نے گول کمرے میں سفید چادر پہ سوگوار بیٹھنے والی اپنی بہنوں اور خالاؤں سے پوچھا۔

''سر میں درد تھا بے چاری کے' ماں سے زیادہ قریب بھی تو وہی تھی۔'' زمرّد نے بتایا۔

''گولی دے کر سونے بھیجا ہے اندر۔''

''امی......'' اس نے ایک دھکے سے دروازہ کھولا اور وہیں جم کر رہ گیا۔

گہرے سبز قالین پہ سرخ خون نے سیاہی مائل تالاب سا بنا رکھا تھا۔ مڑے تڑے ہاتھ پیر لیے' کالے ماتمی لباس میں۔ بے حد حیران اور خوف زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں والی وہ اس کی ماں کی لاش تھی۔

ایک طوفان تھا جو منٹوں میں لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ زہرہ بائی کا بہیمانہ قتل ایک سانحے سے کم نہ تھا اور خصوصاً اس وقت جب اس کی ماں کی تدفین کو گھنٹہ بھر ہی ہوا تھا۔ ہر جانب ایک کہرام مچ گیا۔

''کس نے یہ ظلم کمایا' ارے زہرہ کی تو کسی سے دشمنی بھی نہ تھی۔'' زمرد سینہ پیٹ پیٹ کر بین ڈال رہی تھی۔

''کون آیا تھا اوپر؟ بابا حیات کو پتہ ہوگا۔'' کسی نے کہا۔

''ہاں اوپر جانے والا ہر بندہ اس کی نظر سے ہو کے جاتا ہے۔'' نگینہ نے بھی تائید کی۔

''لیکن بابا تو نیچے نہیں ہے۔'' کوئی جلدی سے جا کے دیکھ بھی آیا۔ اس اطلاع پہ سب کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ سب کا دماغ جس جانب اشارہ کر رہا تھا اسے ظاہر کرنے

میں تامل بھی ہو رہا تھا۔

''بابا حیات تو چلا گیا۔'' سکندر نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''اس نے مجھ سے ہی کرائے کے پیسے لیے تھے۔ کہہ رہا تھا ہیرا بائی نہیں رہی' اب میرا یہاں کیا کام؟''

''کب......؟ کس وقت گیا تھا وہ؟''

''جنازہ نکلنے سے کچھ دیر پہلے۔''

''اوہ......تو پھر......کون......؟'' یہ سوال باقی رہ گیا۔

* * *

جب جونے کو وہاں رکنے کا کہہ کر سکندر اوپر نانی سے پیسے لینے آیا تو بابا حیات کے رونے کی آواز سن کر دروازے پہ ہی رک گیا۔ ''بہت ضد کر لی تو نے ہیرا بائی! تو ضد کی پکی ہے تو کم ڈھیٹ میں بھی نہیں۔ یہ جو موت تیرے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہے' یہ میری دعاؤں کی وجہ سے ہے۔ میرے سوال کا جواب دیے بغیر تو مرے گی نہیں۔ یونہی ایڑیاں رگڑتی رہے گی۔ بتا دے مجھے' کون ہے میری بیٹی؟''

سکندر ادھ کھلے دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔

''پہلے تو اپنی قسم توڑ۔ تو نے قسم کھائی تھی کہ تو اپنی بیٹی کا نام جانتے ہی......''

''واہ ہیرا بائی! تو نے اپنی قسم پوری کی' مجھے میری قسم سے ہٹانا چاہتی ہے۔ جب میں نے تجھ سے شادی سے انکار کیا' تب تو نے قسم کھائی تھی کہ تو میری اولاد کو پیدا کر کے رہے گی' اگر بیٹا پیدا ہوا تو اس کے ہاتھوں میرا خون کرائے گی اور اگر بیٹی ہوئی تو اسے کوٹھے پہ بٹھائے گی۔ تو نے اپنی قسم پوری کی لیکن اگر تو چاہتی ہے تو تیری خاطر میں اپنی قسم توڑتا ہوں۔ ویسے بھی ان بوڑھے ہاتھوں میں اب اتنا دم نہیں رہا۔ میں تو صرف دل میں یہ خلش نہیں رکھنا چاہتا کہ اپنے ہی خون کے اتنا قریب ہونے کے باوجود میں اس سے انجان ہوں۔''

''کتنا مشکل ہوتا ہے خلش کے ساتھ جینا' اب پتہ چلا ہے تجھے۔ میں نے ساری عمر کوٹھے پہ گزاری تیری وجہ سے۔ ایک وقت تھا جب میرے دل میں بھی گھر والی بننے کا ارمان جاگا تھا۔ ہر طوائف کی زندگی میں یہ وقت ایک نہ ایک بار ضرور آتا ہے۔ مجھ پر ذرا دیر سے آیا۔ دو مرد بھگت چکی تھی۔

حالانکہ باقاعدہ نکاح کے بعد دلہن بن کے گئی تھی ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں

میری۔ اٹھائیس سال عمر ہو گئی تھی جب پہلی بار تو اس کوٹھے پہ آیا اور زندگی میں پہلی بار میرے دل نے سچائی سے کسی ایک کا ہو جانے کا سوچا۔ کیا تھا حیات محمد! اگر تو میری مان لیتا' مجھ سے شادی کر لیتا مگر نہیں' تو نے میری بات نہ مانی۔ تماش بین بننا گوارا تھا تجھے۔ عیش کر سکتا تھا مگر سہارا نہیں دے سکتا تھا۔ جو کام میں نے کبھی پیسے لے کر نہیں کیا تھا' وہ بغیر پیسوں کے صرف اس لالچ میں کر لیا کہ شاید میرے اتنا آگے بڑھنے پہ تو میرے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگے لیکن نہیں' مجھے ساری حدیں توڑنے پہ مجبور کرنے کے بعد تم نے اپنے وعدے توڑ دیے پھر میں کیا کرتی۔

کھانی پڑی مجھے یہ قسم...... پیدا کی میں نے تیری یہ ناجائز اولاد...... تیری زندگی خدا کو منظور تھی' اس لیے بیٹا نہ ہوا اور تیری ذلت شاید قسمت میں لکھی جا چکی تھی' اس لیے بیٹی ہوئی۔ تجھے میری محبت کا اعتبار نہ تھا' اس لیے میری قسم کا بھی نہ کیا۔ اسے خالی خولی دھمکی سمجھ کر تو چلا گیا۔ وہ تو چار سال بعد جب اچانک ملا اور میں نے بتایا۔

''میری قسم پوری ہوئی حیات محمد! جا...... جا کے ڈھونڈ اپنی بیٹی اس بھرے بازار میں۔ جا...... ایک ایک کوٹھا چھان مار...... اپنے خون کی خوشبو پہچان اور تب سے تو بھکاری بنا میری دہلیز پہ بیٹھا ہے۔'' ہیرا بائی نے ہنسنے کی کوشش کی مگر اتنا زیادہ بولنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہی تھی۔

''کہاں بیچا تھا میری بیٹی کو' بتاؤ ہیرا!'' بابا حیات تیزی سے آگے بڑھا کہ کہیں وہ یہ راز اگلے بغیر نہ مر جائے۔

''ایک جھوٹ...... جھو......ٹ...... بولا تھا......مم......میں نے......'' زرد ہوتی رنگت کے ساتھ ہیرا بائی نے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے......تم......تمہاری بیٹی کو......کو...... بیچا نہیں تھا...... وہ...... وہ یہیں ہے......یہیں......اسی کوٹھے...... پہ''

''کون؟'' آواز بابا حیات کی تھی مگر سکندر کا رواں رواں یہ سوال کر رہا تھا۔

''وہی جسے تو میرے...... میرے تیسرے شوہر کی او...... اولاد......سم...... سمجھتا رہا......راجو کی بہن سمجھتا رہا۔ وہ راجو سے ایک نہیں دو دو سال...... بڑی تھی......'' اس سے آگے بولنے کی ہمت اس میں نہ تھی مگر بابا حیات یہ راز جان گیا تھا۔

''زہرہ......'' وہ درد سے دہری ہوتی ہیرا بائی کو بے رحمی سے دیکھنے لگا۔

''ایک جھوٹ تم نے بولا' ایک میں نے بھی بولا۔ میں نے اپنی قسم نہیں توڑی۔

یہی قسم کھائی تھی نا میں نے کہ اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے ماردوں گا۔ بہت دیر ہوچکی' بہت زیادہ لیکن میں اپنی قسم ضرور پوری کروں گا۔''

سکندر نے تڑپ کے اندر قدم رکھا۔ ہیرا بائی یہ سچ جاننے کے بعد مری تھی یا پہلے اس کا اسے علم نہ ہوسکا۔ بس وہ آگے بڑھا' ڈبڈبائی آنکھوں والے بابا حیات کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

''نانی مرگئی ہے۔''

* * *

اگلے چھ مہینے اس کے لیے لاعلمی سے بھرے دن تھے۔ وہ لاعلم تھا...... بے خبر تھا...... انجان تھا۔

اپنے آپ سے بھی اور اپنے گردوپیش سے بھی۔

اس دن کے بعد گویا اس نے بابا حیات کی گدی سنبھال لی تھی۔ سیڑھیوں کے نیچے بچھی وہی جھلنگا سی سال خوردہ چارپائی اب اس کا ٹھکانہ تھی۔ دن رات وہ وہیں پڑا چھت کی کڑیاں گنتا۔ مکڑی کے جالے پہ نگاہیں ٹکائے رہتا۔ بابا حیات کی طرح اسے بھی دو وقت کا کھانا وہیں مل جایا کرتا۔ دیر سے یا سویرے سے مگر بہرحال مل جاتا تھا۔ بابا حیات کی روٹی کا دھیان نانی رکھتی تھی تو سکندر کے لیے ٹرے مسکان تیار کروا کے بھیجتی۔ کئی کئی روز ہوجاتے وہ اوپر کا رخ نہ کرتا۔ آہستہ آہستہ سارے دوست بھی چھٹ گئے۔ سب کا کہنا تھا کہ نانی کی موت' ماں کے قتل کے ساتھ ساتھ بابا حیات کی گمشدگی نے بھی اس کے دل ودماغ پہ گہرے اثرات مرتب کیے ہیں کیونکہ وہ بچپن سے ہی اس کے بہت قریب تھا۔

صرف مسکان تھی جو اسے اس کے حال پہ نہ چھوڑ سکی۔ ویسے بھی اب اس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ اس حادثے کے دو مہینے بعد اس کے ایف اے کے امتحانات ہوئے۔ تیاری پہ فرق تو پڑا تھا لیکن جیسے تیسے دے دیے۔ رزلٹ بھی گزارے لائق آگیا جس کا فائدہ وہ نہ اٹھا سکی۔ اسے دوبارہ کالج جانے کی اجازت نہ ملی اور یہ اجازت نہ دینے والی نگینہ خالہ تھی جو ہیرا بائی کے بعد اس کوٹھے کی کرتا دھرتا تھی۔ زمرد کی نسبت زہرہ زیادہ فعال اور ماں کا دایاں ہاتھ تھی۔ اب وہ بھی نہ تھی' مجبوراً نگینہ بائی کو اپنا چلتا کاروبار چھوڑ کے یہاں منتقل ہونا پڑا۔

اس نے ہیرا بائی کے کوٹھے کو اپنی طرز سے چلانا شروع کردیا۔ صرف چھ مہینے

میں ہی حالات اتنے بدل گئے کہ اس نے ایک بے حد پوش علاقے میں ایک عالی شان کوٹھی پچاس ہزار روپے ماہانہ پر لے لی۔ وہ سب لڑکیوں سمیت وہاں شفٹ ہوگئی۔ کوٹھا اب بھی آباد تھا' وہاں ورکر لڑکیاں رہتی تھیں' جو روز رات کو محفل سجاتیں۔ سب خوش تھے سوائے مسکان اور سکندر کے۔

سکندر تو اس بڑی کوٹھی میں اپنا دل لگانے میں ناکام رہا۔ اسے اس گندے محلے کے پرانے' اونچے چوباروں والے مکان کی سیلن زدہ ڈیوڑھی' اس کی تنگ وتاریک سیڑھیاں اور ان کے نیچے اس کونے میں بچھی اپنی چارپائی یاد آتی رہی جو پینتیس سال تک بابا حیات کا ٹھکانہ بنی رہی مگر اسے چھ ماہ سے زیادہ برداشت نہ کرسکی۔ اس پرسکون' خاموش سے علاقے کا یہ حصہ کچھ زیادہ ہی غیر آباد تھا۔ اکا دکا مکان تھے اور وہ بھی اتنے بڑے بڑے کہ ایک گیٹ سے دوسرے گیٹ کا فاصلہ اتنا تھا جتنا اس کے محلے کے ایک گھر اور دسویں گھر کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ کوٹھی خاصی پرپیچ اور پیچیدہ تھی۔ دو مہینے ہونے کو آئے اب تک اسے پتہ نہ تھا کہ اس کے کمرے کے علاوہ باقی سب کا کمرہ کہاں کہاں تھا۔ وہ آدم بےزار ہوچکا تھا۔ ہر چیز سے اکتایا ہوا' ہر انسان سے بےزار۔ وہاں پرانے گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے بچپن کے دوستوں سے کٹ چکا تھا۔ جونا اسے واپس زندگی کی طرف لانے میں ناکام ہوچکا تھا۔ شوکا بالآخر چکوری کے ارادوں کے جال میں پھنس گیا تھا' وہ اسے بھگا لے گیا۔ یقیناً چکوری کی دلی مراد برآئی ہوگی۔ پپو کا کیا بنا' یہ جاننے کی خواہش سکندر کے دل میں نہ تھی۔ اس کے اندر سے ہر جذبہ' ہر احساس' بابا حیات محمد جیسے خنجر کے ایک وار کے ساتھ نکال کے لے گیا تھا۔ وہ واحد کام جو اس نے آخری بار مکمل ہوش وحواس کے ساتھ کیا' وہ ایک جھوٹ تھا۔

''بابا حیات تو چلا گیا' جنازہ اٹھنے سے کافی دیر پہلے۔''

حالانکہ سیڑھیوں سے میت اترتے ہی سکندر نے اسے دبے پاؤں اوپر چڑھتے دیکھا تھا۔ شاید وہ تب ہی ماں کے کمرے میں جاکے چھپ گیا ہوگا اور جب ایک گھنٹے بعد ماں اوپر اپنے کمرے میں آئی تو اسے چیخنے کا موقع دیے بغیر......

اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا۔ وہ خود نہ جانتا تھا' وہ بابا حیات کو کیوں بچانا چاہتا تھا؟ کیا اس لیے کہ وہ رشتے میں اس کا نانا تھا لیکن اس نے جس کو قتل کیا وہ بھی تو اس کی ماں تھی' اگر نانا کا دل اپنی ہی بیٹی کو خنجر گھونپتے ہوئے نہیں کانپا تھا تو اس کا دل ایسے شخص کے لیے کیوں موم ہوگیا تھا۔ کیوں وہ ہفتوں اس کرب سے روتا رہا کہ ایک

بوڑھا شخص اپنی عزت کو، اپنے خون کو بازاری ہونے سے بچانے کی نیت سے پینتیس سال تک بھکاری بنا ایک بدتر زندگی گزارتا رہا۔ وہ اپنی آنکھوں سے گاہکوں کو اوپر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس بوڑھے کمزور دل پہ کیا قیامت گزری ہوگی۔

اس دن خالہ نگینہ نے اسے اندر بلا بھیجا۔

''بہت ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ لیا سکندر! یہاں یہ مفت خوری نہیں چلے گی۔ وہ تمہاری ماں کا گھر تھا، دس بیس سال اور بھی بٹھا کے کھلا سکتی تھی۔ یہ میڈم نگینہ کا اڈہ ہے، میں دھندے کی پکی ہوں جس کی جتنی محنت، اتنا ہی گڑ حصے میں آئے گا۔ نہ نہ...... میں تمہیں یہاں سے جانے کا نہیں کہہ رہی، آخر تمہاری دو دو کماؤ بہنیں یہاں رہتی ہیں لیکن اب وہ زمانے گئے جب طوائف زادے یونہی بہنوں کی کمائیوں پہ پل کے دندناتے پھرتے تھے۔ کوئی ہاتھ پیر ہلاؤ۔''

''ڈھونڈ دیں جی نوکری، کرلوں گا۔'' وہ مرے مرے انداز میں بولا۔

''نوکری کیا تم سے خاک ہوگی اور کرنی ہی ہے تو جاؤ خود ڈھونڈو۔ میرے پاس تو میرے ہی گھر بار کا کام ہے۔ زمان خان کے ساتھ رہو اور کچھ نہیں تو ڈرائیونگ سیکھ لو۔ آج دو گاڑیاں ہیں، کل تین ہوں گی، پرسوں چار۔ ڈرائیور جتنے ہوں، کم ہیں۔ کوئی کم کام ہیں، بس کل سے مجھے فارغ بیٹھے نظر نہ آؤ۔''

''جی اچھا۔'' ایک دم ہی اسے بھی آٹھ مہینوں سے خود پہ چھائے جمود اور سکوت سے الجھن ہونے لگی۔

اوپر گیا تو کتنے دنوں بعد مسکان کی شکل دکھائی دی۔

''سکندر...... تم......؟'' کہنی کے نیچے کشن رکھے وہ کوئی میگزین پڑھ رہی تھی، جب اسے دیکھ کے چونکی اور پھر سیدھی ہوئی۔

''کیسے ہو تم؟''

''چلو تمہیں یہ پوچھنے کا خیال تو آیا۔'' سکندر نے ہلکا سا گلہ کیا۔

''پرانے گھر میں آتے جاتے تو دن میں ایک بار جھلک دکھا جاتی تھی، روتی پانی پوچھ لیتی تھیں۔ اس بڑی کوٹھی میں آ کے تو بھی ''بڑی'' ہوگئی اور سب کی طرح۔''

''ایسی بات نہیں ہے سکندر! میں تو......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک کر قالین کا رواں نوچنے لگی۔ سکندر نے ٹھٹک کے اس پہ غور کیا۔ اس میں کچھ تھا جو الگ الگ سا نظر آرہا تھا۔ وہ پہلے جیسی نہیں لگ رہی تھی۔

''تو بیمار ہے یا رہ چکی ہے؟'' اس نے مسکان کی آنکھوں کے نیچے نمایاں ہوتے حلقے اور پہلے کی نسبت قدرے اترا ہوا چہرہ دیکھ کے پوچھا۔ جواب میں وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

''پھر...... پرچے ہو رہے ہیں۔''

''نہیں، پڑھنا تو کب کا چھوڑ دیا۔'' وہ دکھ سے ہنس دی جیسے یہ بات بتاتے ہوئے اپنے ہی غم کی شدت کم کرنا چاہ رہی ہو۔

''تو پھر نظر کیوں نہیں آتی؟ کہاں غائب رہتی ہے سارا دن؟''

''کاش...... کاش کہ میں کہیں غائب ہوسکتی سکندر!'' وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

''کاش میں کسی کو نظر نہ آ سکتی، کاش میں غائب ہوسکتی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ کسی کو دکھائی نہ دیتی سوائے......''

''سوائے؟'' اس نے ایک عرصے سے کچھ پوچھنا، کسی بھی چیز سے واقفیت رکھنا، سب کچھ ترک کر رکھا تھا لیکن پتہ نہیں مسکان کا چہرہ کون سی کہانی کہہ رہا تھا کہ عرصے بعد سوال اس کے ہونٹوں کی منڈیروں سے جھانکنے لگے تھے۔

''بتا سوائے کس کے؟''

''سوائے مظفر باجوہ کے۔'' دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے نظریں جھکا لیں لیکن اس ایک پل میں سکندر نے دیکھ لیا کہ اس نام کے لیتے ہی مسکان کی سہمی ہوئی افسردہ آنکھوں میں کیسی زندگی کی جوت جگمگا اٹھی تھی۔

''مسکان تو جانتی ہے کہ ہم......''

''نہیں سکندر! نہیں۔'' اس نے سکندر کے کچھ کہنے سے قبل ہی تڑپ کے اس کے ہونٹوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں...... مجھے مت بتانا کہ ہم کون ہیں۔ ہماری اوقات کیا ہے۔ میں کچھ نہیں بھولی۔ وہ بھی جو تم نہیں جانتے۔''

''میں کیا نہیں جانتا؟''

''بہت کچھ۔ کبھی تم نے غور کیا کہ یہ دولت کی ریل پیل، یہ مہنگی نئے ماڈل کی گاڑیاں، یہ عالی شان کوٹھی، یہ آدھے درجن نوکر، ان کی تنخواہیں اور تین ٹائم جاری رہنے والا مرغن کھانوں کا پرتکلف لنگر۔ یہ سب خرچے کہاں سے پورے ہوتے ہیں۔ کبھی سوچا

تم نے؟ جب کہ اب یہاں روز رات کو مجرے کی محفلیں بھی نہیں سجتیں۔"

"میرا خیال تھا شاید باہر کے فنکشن زیادہ ملنے لگے ہیں۔ دن میں اور رات میں کتنی بار تو گاڑی بھر کے نکلتے دیکھتا ہوں۔"

"ہاں نکلتی تو سب لڑکیاں کام سے ہی ہیں مگر سکندر! یہ وہ کام نہیں جو نانی کے کوٹھے پہ ہوتا تھا' یہ وہ کام ہے جس کو کرنے پہ نانی نے نگینہ خالہ کو اپنے دھندے سے الگ کر دیا تھا۔ اب خالہ...... نہیں...... میڈم نگینہ کا زمانہ ہے۔ ہر لحاظ اور ہر روایت کی دھجیاں اڑا دینے کا زمانہ۔"

سکندر سناٹے میں آ گیا۔ "مکان! کیا خالہ نے تجھے بھی......" کسی خیال کے آتے ہی وہ سہم گیا۔

بھلا ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ دو ماہ سے میڈم نگینہ اسے مفت کی کھلا رہی ہو۔ وہ تو ایک لگا کے چار وصول کرنا جانتی ہے۔ مکان کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ ہمت ہار گیا۔

"مرے ہوؤں کو روتا رہا چھ مہینے اور ایک زندہ رشتہ میرے سامنے رل گیا۔ ہائے بدبختا۔" اس نے خود کو کوستے ہوئے دیوانگی میں اپنا منہ نوچا۔ مکان اس کا یہ روپ دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے اوروں سے سنا تو تھا کہ ماں کے قتل کے بعد سے سکندر اپنے حواس کھو بیٹھا ہے اور اکثر اس پہ دیوانگی کے دورے پڑا کرتے ہیں' آج دیکھ بھی لیا۔

اس کے ہونٹ لرز رہے تھے' آنکھیں وحشت کے مارے اوپر چڑھ گئی تھیں۔ وہ مکان کے روکنے کے باوجود مسلسل اپنے منہ پر تھپڑ مار رہا تھا۔

"میں کچھ نہ کرسکا' بابے کے سیاپے روتا رہا۔ نانی...... نانی...... کیا تھا جو تو یہ سچ مرتے مرتے بولنے کے بجائے پینتیس سال پہلے بول دیتی۔ پینتیس سال پہلے ہی سارا کچھ ہوگیا ہوتا تو آج نہ ترنم رلتی' نہ تمنا' نہ مکان' نہ میں......"

"کیا ہوگیا ہے سکندر!" وہ اسے سنبھالتے سنبھالتے بے حال ہوگئی۔ وہ تو شکر تھا' کوٹھی کے کمرے خاص طور پر ساؤنڈ پروف تھے اس لیے سکندر کی آہ وزاری کسی نے نہ سنی' ورنہ یہاں تماشا کھڑا ہو جاتا۔

"بس کرو سکندر!" اس نے اپنا سارا زور لگا کے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

"بات سنو میری' کچھ نہیں ہوا سکندر! میرے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔ میرا یقین کرو' کچھ نہیں ہوا۔"

بہت مشکل سے وہ اس کے کانوں تک اپنی آواز پہنچانے میں کامیاب ہوئی۔ وہ بے یقینی کے عالم میں اپنی وحشت زدہ پھٹی ہوئی آنکھیں اس پہ گاڑے اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں سکندر...... کسی کے برا کرنے سے ہر بار برا نہیں ہو جاتا۔ کبھی کبھی اللہ ہم کمیوں کی بھی سن لیتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی معجزے ہو جایا کرتے ہیں۔ خالہ نے تو میرا بندوبست کرنے کے لیے یہاں آتے ہی بڑی والی پارٹی تھی' اس میں مجھے بولی لگوانے کے لیے پیش کر دیا۔ یہ پارٹیاں اصل میں نیلامی کی رنگا رنگ تقریبات ہی ہوتی ہیں۔ میں کتنا تڑپی' کتنا روئی۔ وعدے کیے کہ جب تک آخری سانس ہے' ناچ سے جو کماؤں گی' سب اس کی ہتھیلی پہ رکھوں گی۔ میں مدد مانگنے تمہارے پاس بھی آئی تھی مگر تب تم پتہ نہیں کس دنیا میں کھوئے رہتے تھے۔ میں مایوس ہوگئی تھی اور خود کو خالہ کے رحم وکرم پہ چھوڑ کے اس کے کہنے کے عین مطابق بن سنور کے پارٹی کی شان بڑھانے آ گئی۔ میں اس تقریب کا خاص آئٹم تھی اور تب معجزہ ہوگیا۔ ہاں سکندر! اللہ نے میری مدد کے لیے بھی ایک فرشتہ بھیج دیا اور وہ فرشتہ ہے مظفر باجوہ۔"

"مظفر؟" سکندر نے دوبارہ یہ نام سنا تو یاد آیا کہ بات تو شروع ہی اس نام سے ہوئی تھی۔

"یہ مظفر باجوہ کون ہے؟"

"میرا نجات دہندہ...... یہ وہ شخص ہے سکندر! جس نے اس رات میری سب سے اونچی بولی لگائی تھی۔ مجھے خرید لیا تھا مگر پتہ ہے' خریدنے کے باوجود اس نے مجھے برتا نہیں۔ بڑے پیار سے سنبھال کے رکھ لیا۔"

"میں...... میں سمجھا نہیں۔ خریدار تو وہ بھی نکلا نا۔ ہاں اس نے کوئی جھوٹے سچے وعدے کر ڈالے ہوں گے تو تو سمجھی کہ وہ تیرا بڑا خیرخواہ ہے۔"

"نہیں سکندر! وہ اگر اس رات مجھے اپنے نام نہ کرتا تو اب تک میں نہ جانے کس کس کے نام ہو چکی ہوتی۔ اس نے خالہ کو پابند کر دیا ہے۔ ہر ہفتہ وہ ایک بھاری رقم اسے ادا کرتا ہے جس کے عوض خالہ نے مجھے صرف اور صرف اس کے لیے مخصوص کر رکھا ہے' اگر اس نے میری بولی لگا کے میری عزت کم کی ہے تو میری قیمت ادا کرنے

کے باوجود مجھے ایک بازار سے خریدی چیز سمجھ کے استعمال نہ کرتے ہوئے میری عزت دگنی کر کے مجھے واپس بھی کی ہے۔ وہ بہت اچھا ہے سکندر! بہت اچھا۔"

سکندر کو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جگنو چمکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ مسحور سا اسے دیکھتا رہا۔

"نانی نے ایک بار مجھے سمجھایا تھا کہ اگر کوئی مرد کسی طوائف سے کہے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے تو طوائف کو حق ہے کہ وہ اس بات پہ جی بھر کے خوش ہو لے مگر یقین کبھی نہ کرے۔ ہاں نہیں یقین کرنا چاہیے مرد کے اس دعوے کا...... لیکن میں نے کیا ہے سکندر! اس لیے کہ مظفر باجوہ نے دعوا نہیں کیا' اس نے ثابت کر دکھایا ہے اور فرض کرو' وہ نہیں کرتا مجھ سے محبت تو نہ سہی' کیا فرق پڑتا ہے؟ میری سب سے بڑی بھوک عزت ہے' محبت نہیں۔"

مگر سکندر چند گھنٹے ہوش وحواس میں گزارنے کے بعد ایک بار پھر اپنی دیوانگی میں لوٹ چکا تھا۔ اس کے ادھ کھلے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ خالی خالی آنکھیں سامنے والی دیوار پہ آویزاں اپنی ماں زہرہ بائی کی بڑی سی فریم شدہ تصویر پہ جمی تھیں۔ اس کے چہرے پہ عجیب سے سائے بن اور بگڑ رہے تھے۔

"سکندر......" مسکان نے اسے جھنجوڑا۔

"کیوں ہو گیا ہے تو ایسا؟ یہ تجھے بیٹھے بیٹھے کیا ہو جاتا ہے؟ نہ کر میرے ساتھ ایسا۔ ایک تو ہی تو میرا اپنا باقی رہا ہے جس سے میں اپنے دکھ سکھ کہہ لیتی ہوں' اگر تو بھی یوں خود سے بے گانہ ہو گیا تو میں......" وہ اس کے شانے پہ سر رکھ کے سسک اٹھی۔

* * *

"اچھا تو یہ ہے مظفر باجوہ۔"

اشرف کے بتانے پر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ذرا آگے آ کے دیکھنے لگا۔ سرکاری نیم پلیٹ والی اس بڑی سی کالی گاڑی کے اندر آتے ہی اشرف نے بتایا تھا۔

"یہ مظفر باجوہ ہے' بہت اثر ورسوخ والا وزیر ہے۔ جدی پشتی جاگیردار اور سیاست دان۔ اپنی چھوٹی بے بی مسکان پہ بری طرح فدا ہے۔ اس کا ہر ہفتہ یہ بک کرا لیتا ہے۔ چاہے سارے ہفتے آئے یا نہ آئے۔"

کافی دنوں سے سکندر پہ دیوانگی کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اب اس نے خالہ نگینہ کی کڑی ہدایت پہ اشرف کے ساتھ ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔

دل ہی دل میں وہ بھی اس شخص سے ملنے کا مشتاق تھا جس نے اس کی بہن کی مایوس اور تاریک زندگی میں امید کے اجالے بھر دیے تھے۔ وہ اسے ایک بڑا جی دار نوجوان تصور کر رہا تھا جو روایتوں سے ٹکراتے ہوئے ایک طوائف کو محبت کے ساتھ ساتھ عزت بھی دے رہا تھا۔

گن مین اور سیکیورٹی گارڈز کے سائے میں مظفر باجوہ پورٹیکو سے اندر کی جانب بڑھا اور سکندر کو اسے دیکھ کے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ کوئی بانکا سجیلا نوجوان نہ تھا۔ چالیس بیالیس سال کا ایک پکی عمر کا کرخت صورت مرد تھا۔ رنگت کبھی گندمی رہ چکی ہوگی مگر اب سنولا چکی تھی اور چہرے کے کرخت نقوش کے ساتھ جچ رہی تھی۔ بڑی بڑی گھنی بل دار مونچھیں' دائیں رخسار پہ ڈیڑھ انچ لمبا زخم کا کوئی پرانا نشان' چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ راسلک کے کرتے کے دامن پہ ہلکی سی شکنیں تھیں۔ اتنی عام سی شخصیت کے باوجود شاید وہ اس کی خاندانی امارت تھی۔ عہدے کا رعب تھا یا پھر اس کا اجلا باطن جو وہ سکندر کو ایک دم بہت اونچا' بہت معتبر سا لگا۔ وہ خود کو آگے بڑھنے سے روک نہ پایا۔ اس کا سخت کھردرا ہاتھ تھام کے سکندر نے آنکھوں سے لگا لیا۔ مظفر باجوہ نے ٹھٹک کے اسے دیکھا۔ دو گن مین چوکس ہو کے آگے بڑھے' مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

"سکندر ہو؟" بھاری بارعب آواز میں اس نے اپنا ہاتھ آہستگی سے چھڑاتے ہوئے پوچھا۔ اس کے اثبات میں سر ہلانے پہ وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

اس رات سکندر نے مسکان اور مظفر باجوہ کے حوالے سے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے۔ وہ اپنی بہن کو مظفر باجوہ جیسے چاہنے والے کی شریکِ حیات کے روپ میں زمانے بھر سے عزت وتکریم وصول کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس خواب کا ذکر اگلے روز مسکان سے کیا۔ وہ سکندر کی بات سن کر اداسی سے مسکرا دی۔

"تمہارا کیا خیال ہے سکندر! وہ اب تک کنوارا ہے؟ دو شادیاں کر چکا ہے' دونوں بیویاں خاندان کی ہیں۔ ایک ہی گھر میں رہتی ہیں۔"

اس کے شادی شدہ ہونے کی خبر پہ سکندر کو کوئی خاص دھچکا نہ لگا۔

"دو کی ہیں تو تیسری کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"پہلی شادی اس نے اپنے بڑے بھائی کی بیوہ سے کی ہے۔ بھابی ہونے کے

علاوہ وہ اس کی چچا زاد بھی تھی۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد' اگر دوسرا بیاہ کرتی تو اپنے باپ کا سارا ترکہ بھی ساتھ لے جاتی۔ ساتھ میں تین بیٹے بھی۔

مظفر نے باپ کے حکم پہ جب اپنی بیوہ بھابی سے شادی کی' تب وہ صرف انیس برس کا تھا اور وہ عورت بتیس سال کی۔ آج بھی اسے خاندان میں بڑی بہو کا درجہ حاصل ہے۔ ساس کے مرنے کے بعد وہی کرتا دھرتا ہے۔ کم عمر شوہر بہت پہلے اس کے رعب میں آ گیا تھا اور اب تک ہے۔ مظفر کی دوسری شادی اس کے ایما پہ ہوئی تھی۔ یہ بھی خاندان میں ہوئی اور وٹے سٹے کے نتیجے میں ہوئی۔ اس نئی دلہن کے بدلے مظفر نے اپنی ایک نہیں دو بہنیں بیاہی تھیں۔ اب وہ اتنے بھاری سودے کے عوض لائی بیوی پہ سوکن کیسے لا بٹھائے۔ اس میں تو دوسری شادی کرنے کی ہمت بھی نہ تھی' اگر اس کی پہلی بیوی خود بڑھتی عمر کی نندوں سے چھٹکارا پانے کے لیے ایسا نہ کرتی۔''

مسکان نے تفصیل سے اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''مگر...... مگر وہ تجھے چاہتا بھی تو ہے۔'' سکندر اتنی الجھی ہوئی کہانی پہ بوکھلا گیا۔

''اتنا بھی نہیں کر سکتا وہ تمہارے لیے۔''

''چاہتی تو میں بھی ہوں مظفر جی کو۔ تو کیا میں ان کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتی۔''

وہ عقیدت سے چور لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''اور پھر وہ مجھ سے مانگتا ہی کیا ہے' الٹا مجھے دے رہا ہے' تحفظ۔ بیٹھی رہوں گی میں اس کے نام پہ...... بہت ہے میرے لیے۔''

''مگر کب تک؟'' وہ سوچ کے رہ گیا مگر پوچھ نہ سکا مگر اس ان کہے سوال کا جواب اسے کچھ ہی دنوں بعد مل گیا۔ وہ سرِ شام ہی اپنے کوارٹر کی چارپائی پہ اوندھا گرا بے مقصد سوچوں سے لڑ رہا تھا۔ باہر سے ٹی وی کی آواز اور ملازمین کے تبصرے سنائی دے رہے تھے۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے یہ آوازیں بڑھ گئی ہوں۔

''ہائے ہائے' یہ کوئی عمر تھی' بڑا جوان تھا۔''

''سیاست میں یہی رولا ہے۔ اک دوجے کو روند کے آگے نکلتے ہیں سارے۔''

''زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔'' کسی نے سرد آہ بھری تھی۔ ''ابھی کچھ دن پہلے دیکھا تھا اسے' اسی کوٹھی میں۔ کیا پتہ تھا کچھ دن بعد بے چارہ بے موت مر جائے گا۔''

''ذرا آواز اونچی کرنا' خبر پھر سے آ رہی ہے۔''

''سیاسی حلقوں میں مظفر باجوہ کے بہیمانہ قتل کے حوالے سے سخت غم و غصے کے

جذبات پائے جاتے ہیں۔ حکومت سے مطالبہ کیا رہا ہے کہ وہ مظفر باجوہ کے قاتلوں کا جلد از جلد سراغ لگائے اور انہیں قرار واقعی......''

ٹی وی سے آتی نیوز کاسٹر کی بلند آواز نے اسے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

''مظفر باجوہ کا بہیمانہ قتل......''

یہ الفاظ کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے ذہن پہ برسے۔ وہ ڈگمگاتے' لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ باہر نکلا۔ سرونٹ کوارٹرز کے مشترکہ کھلے سے صحن میں ترپال ڈال کے وہ سب چودہ انچ کے کلر ٹی وی پہ ایک پاکستانی نیوز چینل پہ خبریں دیکھ رہے تھے۔ پنجوں کے بل اچک کے اس نے دیکھنے کی کوشش کی۔ مظفر باجوہ کا لمبا چوڑا سراپا خون میں لت پت تھا۔ اسٹریچر ایمبولینس سے نکالا جا رہا تھا۔

گہرے سبز قالین پہ سرخ خون کا سیاہی مائل تالاب۔ شکن آلود سیاہ لباس میں زہرہ بائی کی مڑی تڑی لاش۔ خون میں لت پت دہشت زدہ آنکھوں والی لاش۔

سکندر نے جھرجھری لے کر اس منظر سے رہائی حاصل کرنا چاہی' جو مہینوں سے پتلیوں میں جم کے رہ گیا تھا۔

وہ بجلی کی پھرتی سے اٹھا اور چند لمحوں بعد وہ مسکان کے کمرے میں موجود تھا۔ ہاتھ میں ریموٹ لیے وہ صوفے پہ ساکت بیٹھی تھی۔ خطرناک حد تک کھلی آنکھیں ٹی وی اسکرین پہ منجمد تھیں۔ رنگ پیلا پھٹک ہو چکا تھا۔

''مسکان......'' اس نے قریب جا کر اسے پکارا۔ کوئی جواب نہ ملنے پہ سکندر نے اسے شانوں سے تھام کے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کے اندر ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ چہرے کی پیلی رنگت ایک دم سفید ہوئی اور پھر سرخ پڑتی گئی۔ آنکھیں بھی لہو رنگ ہو گئیں۔ اس کے پورے جسم پہ ایک لرزہ سا طاری تھا۔

''مسکان رولو' یہ تمہارا حق ہے۔ مظفر کی دونوں بیویوں سے بڑھ کے تمہارا حق ہے اس کی موت پہ بین کرنے کا۔ اس کی زندگی میں تم ان کے ہوتے ہوئے شامل نہیں ہو سکتی تھیں لیکن اس کی موت کا ماتم کرنے میں تم ان سے پیچھے مت رہنا۔ اس کے مرنے کا سب سے بھاری نقصان تمہیں ہی ہوا ہے مسکان...... رولو...... جی بھر کے رولو۔ وہ تو صرف بیوہ ہوئی ہیں' تم تو لاوارث' بے مکان اور غیر محفوظ بھی ہو گئی ہو۔ روتی کیوں نہیں ہو مسکان!''

سکندر نے اسے بری طرح جھنجوڑا۔ مسکان کا سکتہ ٹوٹا تو وہ سکندر کے گلے لگ

کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

٭٭٭

مظفر باجوہ کے جانے کے بعد مکان کی آنکھوں کے اندھیرے اس کے اندر بھی در آئے، جہاں پہلے ہی وحشت کا راج تھا۔ وہ پھر سے ہوش وخرد سے بے گانہ ہوتا چلا گیا۔ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ رال بہے جاتی پھر ایک دم اس پہ لرزہ طاری ہوتا۔ ہاتھ پیر اینٹھ جاتے، منہ سے جھاگ نکلتے اور وہ بے ہوش ہو جاتا۔ اس حالت میں اگر کوئی اس سے کچھ پوچھنے یا اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا تو وہ اور بھی قابو سے باہر ہو جاتا۔ سب نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا۔ ویسے بھی وہاں اس کا ایسا ہمدرد کون بیٹھا تھا۔ ایک بار اشرف کے ساتھ جاتے ہوئے دورہ پڑا تو اس نے میڈم کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''یہ ڈرائیونگ وغیرہ اس کے بس کی بات نہیں، یہ سائیں لوک بندہ ہے۔ ایسے ہی کوئی نقصان کر بیٹھا تو......''

نگینہ نے اسے گھر کے کاموں میں لگانا چاہا مگر نتیجہ صفر۔ نانی کی موت...... ماں کے قتل کے اثرات نے رفتہ رفتہ جیسے چھ آٹھ ماہ میں اس کی ذہنی حالت منتشر کی تھی، اس بار اسے مکمل طور پہ تباہ ہونے میں آٹھ دن بھی نہ لگے تھے۔

یہ مظفر کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے صرف دس دن بعد کی بات تھی جب وہ یونہی خالی ذہن لیے اپنے اندر کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ادھر سے ادھر پھر رہا تھا۔ پتہ ہی نہ چلا کب کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ نگینہ اندر دو کسٹمرز کے ساتھ بیٹھی انہیں البم دکھا رہی تھی، اسے سکندر کی آمد سخت ناگوار گزری۔ اس کا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا، اوپر سے دیوانگی کے عالم میں کی جانے والی بکواس جو وہ کبھی بھی اور کسی کے سامنے بھی کر سکتا تھا، مگر خلافِ توقع وہ ایک کونے میں زمین پہ بیٹھ کر چپ چاپ ساری کارروائی دیکھنے لگا۔

''روزی......'' نگینہ نے اپنی خاص ملازمہ کو آواز دی جو بس نام کی حد تک خوشگواریت رکھتی تھی۔

''کیا بات ہے خالہ؟'' روزی کو نہ آتے دیکھ کے وہ پوچھ بیٹھا۔ پتہ نہیں کیسے آج اس نے اپنے علاوہ بھی کسی اور کی بات نہ صرف سن لی تھی بلکہ رسپانس بھی دیا تھا۔

نگینہ نے خیال کیا کہ اس پہ اس وقت ذرا سی توجہ دی جائے تو ایک بار پھر وہ

بہتری کی جانب لوٹ سکتا ہے۔

''ان صاحب کو روم نمبر سیون میں پہنچانا ہے۔ تم لے جاؤ گے؟'' نگینہ نے اندازہ لگانا چاہا کہ وہ کس حد تک ہوش میں ہے۔ سکندر کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی میلی، شکن آلود قمیص جھاڑی اور بغیر کچھ کہے اوپر کو گھوم کے جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ نگینہ نے اطمینان بھرا سانس لیا۔

''جائیے لطیف صاحب! سکندر آپ کو لے جائے گا۔''

''میڈم! اسٹاف تو بڑا چن کے رکھا ہے پھر یہ نشئی کیسے اندر آنے دیا۔'' لطیف نامی موٹے بھدے شخص نے اس کی ظاہری ابتر حالت کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں صاحب، نشہ وشہ نہیں کرتا۔ ذرا بیمار ہے، گھر کا ہی بچہ ہے۔'' نگینہ نے تسلی کرائی۔

''روم نمبر سیون...... روم نمبر سیون۔''

کسی پہاڑے کو یاد کرنے کے سے انداز میں وہ دائیں بائیں سر ہلاتا با آواز بلند دہرا رہا تھا۔ ہر زینے پہ قدم رکھتے ہوئے وہ نعرہ لگاتا۔

''روم نمبر سیون...... روم نمبر سیون...... روم نمبر......'' اچانک وہ رک گیا۔ اس کے قدم اور آواز دونوں رک گئے۔ اس کے بالکل پیچھے آنے والا لطیف نامی شخص اس سے ٹکرا کے گرتے گرتے بچا۔

''روم نمبر سیون؟'' اس بار اس نے قدرے مدھم آواز میں سوال کے سے انداز میں دہرایا۔

اور چند سیکنڈ اپنے خوابیدہ دماغ پہ زور ڈالنے کے بعد حیرت انگیز طور پہ اسے یاد آ گیا کہ وہ کمرہ ترنم کا تھا۔ وہ کرنٹ کھا کے پیچھے مڑا۔ خود سے چند انچ کے فاصلے پہ کھڑے اس سوٹڈ بوٹڈ شخص کو گھورا جسے وہ خود اس لڑکی کے کمرے میں چھوڑنے جا رہا تھا جو قسمت سے اس کی بہن تھی۔ اگرچہ اس نے کبھی سوائے مسکان کے لیے، کسی کے لیے بھی اپنے دل میں وہ جذبات محسوس نہ کیے تھے جو ایک بھائی اپنی بہن کے لیے رکھتا ہے۔ اس کے باوجود یہ احساس اس کے اندر چھپ کے بیٹھے، اپنے ہونے پہ شرمسار اس مرد کو جگا گیا جو اس بازار میں اپنے ہی جیسے بے حمیت دوستوں کے ساتھ گھومتے پھرتے اکثر اسے چٹکیاں لیا کرتا تھا۔

سکندر نے اس شخص کو ایک زوردار دھکا دیا۔ اس اچانک اور غیر متوقع حملے نے اسے سنبھلنے کا موقع تک نہ دیا۔ وہ ماربل کی چمکتی چکنی سیڑھیوں پہ لڑھکتا چلا گیا۔ اس کے ماتھے سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ نگینہ اپنی جگہ پہ دم بخود کھڑی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے سکندر کو دھکا دیتے ہوئے دیکھا تھا۔

لیکن جب چند ہی لمحوں کے بعد اس نے اس آدمی کو کراہتے اور واویلا مچاتے' اٹھتے ہوئے دیکھا تو جیسے جان میں جان آئی۔ چیخ وپکار کر کے نگینہ نے گھر کے سارے ملازم اکٹھے کر لیے' اوپر کے کمرے کے بند دروازے کھول کے ساری لڑکیاں بھی جھانکنے لگیں۔ سکندر اب چند زینے نیچے اتر کے خون کا معائنہ کر رہا تھا۔

''خالہ! دیکھو بالکل ویسا ہی خون' وہی رنگ' وہی خون' بالکل ویسا ہی ہے۔ کیا سب کے اندر یہی خون ہوتا ہے خالہ! اسی رنگ کا' میرا بھی؟''

لیکن اس سوال کے جواب میں نگینہ کے بھاری بھرکم ہاتھ کا زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پہ پڑا تھا۔ کسی موٹی سی انگوٹھی کے لگنے سے اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ اس کے اشارے پہ اشرف اور دوسرے چند ملازم سکندر کو پیٹنے لگے۔ نگینہ اپنے کسٹمر کی دل جوئی کرنے میں مصروف ہوگئی جو اس کی میٹھی اور چکنی چپڑی باتیں سننے کی بجائے بکتا جھکتا باہر نکل رہا تھا۔

''نکال باہر اس حرام خور کتے کو۔''

ادھر سکندر ساری کارروائی سے بے نیاز اپنے ہونٹ سے رسنے والے خون کو انگلی پہ لگا کے دوسرے ہاتھ پہ لگے خون سے اس کا موازنہ کر رہا تھا۔

''ایک جیسا ہے۔'' وہ اچانک خوشی سے چیخا۔

''تماشا کیا دیکھ رہے ہو اس پاگل کا' باہر لے جاؤ اور سڑک پہ پھینکو۔ مجھے اپنے گھر میں مفت کی روٹیاں توڑنے والا نہیں چاہیے۔''

''اگر سکندر مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے تو اپنی بہن کے پلے سے توڑ رہا ہے خالہ! تمہارا کیا جاتا ہے۔'' تمنا نے آگے بڑھ کے اشرف کا اٹھا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اپنی میڈم کو دیکھنے لگا جو دم بخود کھڑی تھی۔

''اسے کوارٹر میں لے جاؤ اور خبردار جو کسی نے اسے ہاتھ لگایا۔''

''تم نہیں جانتیں' اس نے ترنم کے لیے آیا کسٹمر واپس لوٹایا ہے اور پتہ ہے کس طریقے......''

''تو میرا نقصان ہے نا۔'' ترنم نے بھی دخل دیا۔

''میں بھر دوں گی۔''

اور نگینہ چپ رہ گئی۔ کھا جانے والی نظروں سے سکندر کو اپنے آپ سے باتیں کرتا باہر نکلتے دیکھتی رہی۔

ترنم اور تمنا کے دل میں یکا یک بھائی کے لیے سوئی محبت جاگ گئی تھی لیکن مسکان جو ہمیشہ سے سکندر کے قریب رہی تھی اس وقت اپنے کمرے کے دروازے سے ٹیک لگائے بے تاثر چہرے کے ساتھ نیچے ہونے والا تماشا چپ چاپ دیکھ رہی تھی۔

* * *

''آج مسکان بے بی کی سالگرہ ہے' بڑی رونق لگنے والی ہے۔''

وہ گھاس پہ گرا نرم گرم دھوپ سے بدن سینک رہا تھا۔ اس کے آس پاس سے گھر کے ملازمین کے علاوہ دوسرے کئی باہر کے بھی لوگ گزر رہے تھے۔ بڑی افراتفری کا عالم تھا۔ کیٹرنگ والے بھی تھے' لائٹ والے بھی۔ ایک بڑے سے ٹرک سے کرسیاں میزیں بھی اتر رہی تھیں۔ فلاور ارینجمنٹ والا بھی گھوم پھر کے جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سب سے بے نیاز چت لیٹا شفاف آسمان کو تکے جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کس نے اسے اطلاع دی تھی۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔

''راستے سے اٹھ جا' یہاں شامیانے لگنے والے ہیں۔ سارا لان کور کرنا ہے۔ شاباش جلدی اٹھ کے اندر جا۔'' کسی اور نے اسے حکم دیا اور پھر ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کے اسے بازو سے پکڑ کے اٹھایا اور اس کے کوارٹر کا راستہ دکھایا۔ اندر جا کے وہ دھپ سے اپنی چارپائی پہ جا گرا۔ آسمان کی وسعتوں میں بھٹکنے والی نظریں اب نیچی چھت پہ لگے جالوں کو تک رہی تھیں۔

''سکندر......'' مسکان نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کے نہ دیکھا تو وہ خود سامنے جا کھڑی ہوئی۔ سوگوار چہرے اور تھکے ہوئے سراپے والی مسکان اس کے سامنے تھی۔ وہ اسے اجنبی نظروں سے دیکھتا رہا۔

''یہ میں ہوں سکندر! مسکان......'' مگر اس کے اندر پہچان کی کوئی رمق نہ جاگی۔

''میں آخری بار تم سے ملنے آئی ہوں۔ کل سے شاید میں تمہیں نظر نہ آؤں۔ نہیں' میں مرنے والی نہیں۔ موت ہم بدنصیبوں کو اتنی آسانی سے کہاں نصیب ہوتی ہے'

نہ ہی میں یہاں سے بھاگنے والی ہوں۔ فرار بھی میری قسمت میں نہیں۔ کوئی سہارا ہو تو قید سے نکلنے کا حوصلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ میں یہیں رہوں گی' اسی گھر میں' مگر تمہیں نظر نہیں آؤں گی۔ آج میری سالگرہ کا جشن ہے لیکن اصل میں آج میری نیلامی کی تقریب ہے۔ میری رونمائی ہے۔ خالہ کا مستقل گاہک تو گیا...... اب وہ مجھے گھر بٹھا کے مفت کی روٹی تو نہیں کھلا سکتی۔ سن رہے ہو سکندر!'' مگر وہ ٹکر ٹکر اسے تکے جا رہا تھا۔

''اب تم نے سننا بھی چھوڑ دیا اور کچھ کرنے کے لائق تو نہ تھے' کم از کم سن تو لیتے تھے۔ یہ بھی......'' وہ سسک اٹھی۔

''مزے میں ہو؟ ہاں کیوں نہ ہو گے۔ پوری نہ سہی' آدھی موت کے مزے لے رہے ہو۔ اللہ...... مجھے بھی یہی موت دے دے' اگر میری دوسری موت کا مقررہ وقت ابھی دور ہے۔ یہ موت بھی کم نہیں۔ بدن بھلے زندہ ہو' دماغ تو مر جاتا ہے۔ جو کچوکے لگاتا ہے' درد نہ تو ہو گا' جیسے تمہیں نہیں ہو رہا۔ یہ سننے کے بعد بھی کہ آج میری......'' وہ ایک بار پھر سسکیاں لینے لگی۔

''میں ایک بھائی سے مدد مانگنے آئی تھی مگر اب ایک بھائی کی زندہ لاش پہ فاتحہ پڑھ کے جا رہی ہوں۔'' وہ واپس پلٹ گئی۔ سکندر کی کھنڈر آنکھیں دور تک اسے جاتے جاتے دیکھتی رہیں۔

***

''شہر کے پوش علاقے میں ایک عالی شان بنگلے میں خوف ناک آتش زدگی' ایک نائیکہ سمیت سات کال گرلز بری طرح جھلس گئیں' تین کی حالت نازک۔''

اگلے دن کے تمام اخبارات کے پہلے صفحے پہ یہ خبر خاصے نمایاں انداز میں شائع ہوئی تھی۔

نمائندہ خصوصی کے مطابق یہ بنگلہ مشکوک سرگرمیوں کی وجہ سے اہلیانِ علاقہ کی نظر میں تھا مگر اس کی بارسوخ مالکہ میڈم نگینہ جو درحقیقت شہر کی ایک مشہور نائیکہ ہے' دولت اور تعلقات کی وجہ سے پولیس کے خوف سے بے نیاز کھلے عام یہ اڈہ چلا رہی تھی۔ اس بنگلے میں بڑے بڑے سرکاری افسران اور شہر کے نامی گرامی تاجروں کا آنا جانا رہتا تھا۔ کل رات جبکہ اس بنگلے میں کچھ ہی دیر کے بعد رنگ و نور کی محفل برپا ہونے والی تھی' برتھ ڈے پارٹی کے شروع ہونے سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے بنگلے کے اوپری حصے میں نامعلوم وجوہ کے باعث شدید آگ بھڑک اٹھی جس پہ قابو پانے میں وہاں کے ملازمین

اور دیگر افراد ناکام رہے۔ فائر بریگیڈ کے عملے کے وہاں پہنچنے کے دو گھنٹے بعد شدید جدوجہد کے ذریعے آگ پہ قابو پایا گیا مگر تب تک کمروں میں بند سات لڑکیاں بری طرح جھلس چکی تھیں۔ قیاس ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کمروں کو باہر سے لاک کر دیا گیا تھا' ورنہ ان میں سے کوئی باہر نکل کر نیچے اترنے کی کوشش ضرور کرتی۔ مرنے والیاں آپس میں قریبی رشتے دار تھیں۔ ان میں سے تین سگی بہنیں بتائی گئی ہیں۔''

یہ خبر اگر اندرونِ شہر کے کسی خستہ حال مکان کی چھت گرنے یا شارٹ سرکٹ سے آگ لگنے کے نتیجے میں چند لوگوں کے مر جانے کی ہوتی تو پھر بھی پڑھنے والے کی آنکھ اشک بار ہوتی۔ اخبار میں شائع ہونے والی جھلسی ہوئی لاشوں کی تصویریں دیکھ کر نرم دل عورتیں توبہ استغفار پڑھتے ہوئے رو دیتیں۔

لیکن اس خبر نے کسی کا دل نہیں دکھایا۔ جیتے جی وہ سب اوروں کے لیے تماشا تھیں۔ ان کی موت بھی ایک چٹپٹی مزہ دینے والی خبر سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

''خس کم جہاں پاک۔'' زیادہ تر کا تبصرہ یہ تھا۔

''ادھر بھی جہنم میں جلنا ہے' ادھر سے بھی جل کے ہی گئیں۔'' کسی نے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے کہا۔

لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ موت جو دوسروں کے لیے ایک عبرت انگیز انجام سے زیادہ نہ تھی مگر کسی کی نظر میں نجات کا واحد ذریعہ تھی۔

ایک تھی جس نے ان آگ کے شعلوں کو اپنے گرد بھڑکتے دیکھ کے اللہ کے حضور شکرانہ ادا کیا تھا۔

ایک تھی جس نے اس بات سے بے خبر کہ اس کا ماں جایا پہلے ہی دروازہ باہر سے لاک کر گیا ہے' اندر سے بھی لاک کر دیا تھا کہ کہیں کوئی اسے بچانے کی نیت سے نکال کے نہ لے جائے۔

ایک تھی جس نے اس تپش کو جی جان سے گلے لگایا تھا۔ اپنے رب کی جانب سے بھیجی جانے والی مدد سمجھ کے۔ ایک تھی جس نے مرتے مرتے اس آگ لگانے والے کی بخشش کی دعا اپنے اللہ سے مانگی تھی۔

اس کی وحشت اور دیوانگی کم نہیں ہوئی تھی' پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ اس کے ذہن سے ہر بات محو ہو چکی تھی' ہر یاد مٹ چکی تھی۔ کبھی کچھ یاد بھی آتا تو صرف ہر جانب بھڑکتے شعلے' طبلے کی تھاپ اور جلتے انگاروں پہ تھرکتے پیر۔

کچھ سنائی بھی دیتا تو صرف اتنا کہ کسی نے اس سے بڑی بے بسی سے کبھی مدد مانگی تھی۔

کیا اس نے مدد کی تھی؟ وہ سوچ میں پڑ جاتا۔ یہ سوچ گہری اور گہری ہوتی جاتی۔ اس کے آگے گرنے والے سکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا۔

''بابا! دعا کرو اللہ مجھے اولادِ نرینہ سے نواز دے۔ دعا کرو میرے گھر بیٹا ہو۔''

کوئی اس سے کہتا اور وہ دینے والے کا ہاتھ جھٹک دیتا۔

''چل ہٹ' بیٹا بھی کوئی مانگنے کی چیز ہے۔ میرے لیے کسی نے مانگی تھی دعا جو میں مانگوں۔''

وہ بڑبڑاتا ہوا ہر بار وہاں سے بھاگ جاتا اور ہر بار اس کی مخصوص جگہ پہ بکھرے سکّے وہیں کے وہیں پڑے رہ جاتے۔

☆☆☆

مہندی' چوڑی اور آنچل

بڑی امی کی طرف سے دی گئی یہ خبر خوش کن نہ سہی' حیران کن ضرور تھی اور اس وقت چوہدری ہاؤس کی تمام ''بکریاں'' نمکین تلی ہوئی مونگ پھلی اور دال مونگ چرنے کے ساتھ ساتھ اس تازہ ترین اطلاع پہ جی بھر کے تبصرے بھی کر رہی تھیں۔

''امی نے یہ بھی بتایا ہے کہ شبنم پھپھو اتنے سالوں بعد اپنے صاحب زادوں کو لے کر پاکستان محض تبدیلیِ آب و ہوا کی خاطر نہیں آ رہیں بلکہ......''

''پتا ہے' پتا ہے...... بس!'' بینا اپنی دانست میں جو انکشاف کرنے جا رہی تھی' وہ میں نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکتے ہوئے رد کر دیا۔

''اچھی طرح پتا ہے' یہ سالوں کی گم شدہ پھپھیاں اچانک اپنے گھبروؤں کے ساتھ وطن واپسی کا پروگرام کیا سوچ کر بناتی ہیں۔ دیسی قسم کی بہوویں تلاش کرنے اور ایسے گوہر اگر اپنے ہی خاندان میں جابجا بکھرے ہوئے ہوں تو کیا ہی کہنے۔'' بیلا نے میرے دل کی بات کہی۔

''اور پھر امپورٹڈ بیٹوں کی ماں ہونے کی حیثیت سے جو پروٹوکول ملتا ہے وہ عیاشی

الگ۔'' رحمہ نے اسکیچ بناتے بناتے پنسل ربک کر ایک اور اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی۔

''اور کیا' تم دیکھ لینا۔ یہ شبنم پھپھو جنہوں نے اتنے سال کسی عزیز رشتے دار سے رابطہ تک رکھنا گوارا نہ کیا' ان کی اتنی آؤ بھگت ہوگی۔ برساتی مینڈکوں کی طرح ایسے ایسے دور پرے کے رشتے دار نکل آئیں گے انہیں مدعو کرنے' جن کا نام تک وہ نہ جانتی ہوں گی۔ ان کے تو مزے ہی مزے' وی وی آئی پی کی طرح یہ ڈیڑھ مہینہ گزاریں گی وہ۔ سارا خاندان ہاتھوں ہاتھ لے گا' ایک اعزاز کی طرح ان کی میزبانی کا شرف حاصل کیا جائے گا۔'' میں نے پیشن گوئی کی' جس کے جواب میں بینا نے ہلکا سا استہزائی قہقہہ لگایا۔

''امی اور آنٹیز تو جیسے یہ موقع ہاتھ سے جانے دیں گی بھلا ہے ناں......؟''

''اور کیا' چوہدری ہاؤس سے زیادہ ورائٹی انہیں کہاں ملے گی۔''

اب تک خاموش بیٹھی کشف چوہدری نے موٹے شیشوں کی عینک اور موٹی جلد والی بڑی سی جناتی بک ایک طرف رکھتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔ اس کے تلخ سے سچ نے بیلا کو تلملا کے رکھ دیا۔ مجھے البتہ بڑا مزا آیا۔

''ہاں یار...... واقعی......! وہ تو مشکل میں پڑ جائیں گی' لڑکے دو اور لڑکیاں تھوک کے بھاؤ...... ہاہا...... ہاہا'' مجھے خوامخواہ ہنسی آئے جا رہی تھی۔ ''چوہدری ہاؤس سے باہر نکلنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ چہ چہ...... بے چاری شبنم پھپھو...... گھن چکر بن کے رہ جائیں گی' ایک سے ایک بڑھیا مال...... عمدہ کوالٹی۔''

''اسٹاپ اٹ۔'' میری توقع کے عین مطابق بیلا چیخ پڑی۔

''پلیز' خود کو یوں ڈی گریڈ مت کیا کرو۔ جب تک تم لوگ خود اپنی عزت نہیں کرو گی' دوسروں سے کیا خاک کرواؤ گی؟''

''ہاں اور تم جو چوبیس گھنٹے اپنی عزت خود ہی کرتی رہتی ہو' اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ تمہاری دیکھا دیکھی کبھی کسی دوسرے نے تمہاری عزت کی؟'' گل بین عرف بینا نے فضول سا جملہ مارا۔

گل بیلا نے تاسف سے ایک نظر خود سے ڈیڑھ سال بڑی گل بین پہ ڈالی' پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔

''سحاب! کم از کم تم سے مجھے یہ توقع نہیں تھی۔ اپنی ہی صنف کے لیے ایسے ایسے ہتک آمیز تبصرے' لڑکیاں ہیں یا پرچون کی چیزیں جو تھوک کے بھاؤ گنوا رہی تھیں تم اور...... اور...... توبہ بڑھیا مال' عمدہ کوالٹی You should shame

yourself چوہدری ہاؤس کی لڑکیاں شوکیس میں سجی ڈیکوریشن کی چیزیں نہیں جو کوئی اپنی مرضی سے اٹھا اٹھا کر کوالٹی جانچے گا۔ یہ تو طے ہے کہ شبنم پھپھو کو اپنے صاحب زادوں کے حوالے سے اس گھر سے تو کوئی وی آئی پی پروٹوکول نہیں ملنے والا۔''

''ہاں ہاں' تم نے طے کر لیا اور سمجھو طے ہوگیا۔'' بینا نے مونگ پھلی پہ ڈھیر سا چاٹ مسالا چھڑکتے ہوئے تمسخر اڑایا۔

''بیلا بی بی! تمہاری فلاسفی اپنی جگہ لیکن ماؤں کی فلاسفی اور وہ بھی قابلِ فکر تعداد میں پائی جانے والی بیٹیوں کی ماؤں کی فلاسفی...... کچھ اور ہے۔ ذرا اوپر نیچے کے پورشنز میں ایک نظر دوڑا لو پھر نعرے لگانا تنظیم نسواں اور حقوقِ نسواں کے۔ امی' رابعہ آنٹی اور فضیلہ آنٹی تینوں کا جوش و خروش اور پھپھو کے استقبال کی تیاریاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کچن میں ڈیڑھ مہینو کا مینو ترتیب دے کر لٹکایا جا چکا ہے۔ گیسٹ روم میں گھر کے فرنیچر میں سے تمام اچھے اچھے آئٹمز منتقل ہو چکے ہیں۔ بڑے چاچو کو نئے پردوں اور کارپٹ کے لیے آرڈر دیا جا چکا ہے۔ ایک کل وقتی ڈرائیور رکھنے کا معاملہ زیرِ غور ہے جو کہ پھپھو اور ان کے بیٹوں کی خدمت میں پیش کیا جا سکے...... آف کورس' بمعہ ایک شان دار گاڑی کے اور ہماری تمہاری مائیں اپنے اپنے اسٹور رومز میں پڑی لمبی چوڑی پیٹیوں میں سر گھسائے نہ جانے کب کے سنبھالے مہنگے مہنگے سوٹ پیس چھانٹ رہی ہیں۔''

ہم سب میں وہی زیادہ بڑوں میں گھسی رہتی تھی اور پھر اکلوتی منگنی شدہ ہونے کی وجہ سے اسے خاص رعایت بھی حاصل تھی جس کی رو سے عموماً چھوٹے موٹے معاملات میں بڑی امی اور آنٹیاں اسے رازدار بنا لیا کرتیں۔ ویسے سچی بات تو یہ تھی کہ خود اسے بھی بڑی اماؤں کی طرح ہر بات میں گھسنے کا شوق زیادہ تھا ورنہ لیلیٰ آپی اور شاداب اس سے عمر میں بڑی تھیں لیکن ہر طرح کے معاملے سے الگ تھلگ رہتیں اور میں اور رحمہ بھی اس سے بس چند مہینے ہی چھوٹی تھیں لیکن ذہنی لحاظ سے شاید وہ ہم دونوں سے کئی سال زیادہ ''گھریلو'' تھی۔

بیلا نے اس کی اس نئی اطلاع کو ناپسندیدگی سے سنا۔

''تم سب کان کھول کر سن لو۔ یہاں کوئی افسانوی سچویشن نہیں دہرائی جائے گی۔ یہ شبنم پھپھو کوئی ہماری سگی پھپھو تو نہیں ہیں اس لیے زیادہ آگے پیچھے پھرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ان کے سپوتوں کو تو ہرگز منہ نہیں لگانا۔ خبردار جو کسی نے اپنا اخلاق بگھارنے' سگھڑاپا اور سلیقہ شعاری جتانے یا حسن نکھارنے کی کوشش کی۔'' اس کے رعب

جمانے پہ رحمہ مائنڈ کر گئی۔

''ہونہہ' ہمیں کیا ضرورت ہے ایسے ہتھ کنڈوں کی' لیکن ڈیڑھ مہینے تک گھر آئے مہمانوں سے یوں الگ تھلگ بھی تو نہیں رہا جا سکتا۔''

''اور پھر بڑی امی...... وہ ایسا کرنے دیں گی' ناممکن...... اب اور میں کیا کہوں تمہاری امی کو تم زیادہ بہتر جانتی ہو گی' ان کا بس نہیں چلتا چوہدری ہاؤس کی تمام لڑکیوں کو راتوں رات ٹھکانے لگا دیں۔''

شاداب جو چپ چاپ ایک طرف بیٹھی اسٹار مووز پہ اپنے فیورٹ ٹام ہینکس کو Cast away میں آگ جلانے کی کوشش میں سرگرداں دیکھ رہی تھی' بڑی امی کا نام لینے سے خود کو روک نہ سکی۔ اسے نہ جانے کیوں بڑی امی اور ان کی ہدایتوں' فکروں' پریشانیوں سے اتنی چڑ تھی۔ اس کے لہجے کی بے زاری کو میں نے شگفتگی سے ڈھانپنا چاہا۔

''چوہدری ہاؤس کی تمام لڑکیوں نے سب سے زیادہ تنگ بھی تو انہی کو کیا ہے۔ یہ سب لڑکیاں ان ہی کے سِلے فراک پہن کر' ان ہی کے پکائے پراٹھے کھا کر اسکول جاتی رہی ہیں۔ ان ہی کے ہاتھوں تیل پی پی کر یہ بال اتنے لمبے ہوئے ہیں اور ان ہی کے بنائے حلوے اور مربے کھا کھا کر یہ دماغ اتنے چل پڑے ہیں کہ کشف بی بی ہیومن سائیکالوجی میں ایم فل کر رہی ہیں اور شاداب بی بی انگلش لٹریچر میں ماسٹرز۔''

جس طرح شاداب' میری بڑی بہن کو بات بے بات بڑی امی کی شکایت جڑنے کی عادت تھی' اسی طرح اس کی ہر شکایت پر جوابی کارروائی کے طور پر بڑی امی کی ان گنت مہربانیوں میں سے چند ایک کو جتانا میرا وطیرہ بن چکا تھا۔ اب بھی شاداں نے بھنویں اچکا کر مجھے یوں گھورا جیسے کہہ رہی ہو' تم باز نہ آنا' چچی...... اور پھر سے مووی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''اور ہاں وہ چھوٹیاں کہاں ہیں' بلاؤ ذرا ان تینوں کو۔'' بیلا کو یکا یک کیٹی' حمنی اور سیما کی فکر لگ گئی۔

''اب انہیں کیا پٹی پڑھانی ہے' خدا کا واسطہ بچیوں کو تو بخش دو۔ تمہارا اپنا دماغ تو خراب ہو چکا ہے کیوں ان معصوموں کو بھی ایب نارمل بنانے پہ تلی بیٹھی ہو۔''

بیلا سے اس طرح کی بات صرف بینا ہی کر سکتی تھی' وہ واضح طور پہ اپنا بڑی بہن والا امیج کیش کرا لیتی تھی۔ یوں تو بیلا نے چھوٹی بہنوں پہ جو لیڈر شپ بنا رکھی تھی' وہ ہم میں سے کسی کو بھی پسند نہ تھی لیکن سوائے بینا کے اور کوئی کھلم کھلا اس پہ تنقید کرنے کا حوصلہ نہ

رکھتا تھا حتیٰ کہ میں بھی نہیں جسے تمام کزنز میں بیلا سے قریب تر ہونے کا دعویٰ تھا۔

''ہاں نارمل تو بس تم ہی ہو۔'' وہ جواباً بڑبڑائی اور کمرے سے نکل گئی۔

''چلو اب جا کر دماغ کھائے گی ان تینوں کا۔ بھلا ان بے چاریوں کا اس قصے سے کیا تعلق۔ شبنم پھپھو کے دو ہی تو بیٹے ہیں' ان دونوں کے ایج گروپ کے لحاظ سے سحاب' شاداب' گل بیلا' رحمہ اور کشف ہی میں سے سلیکٹ کریں گی وہ اپنی بہوئیں۔ ان چھوٹیوں کو لیکچر دینے کا کیا فائدہ؟''

''اف...... ف...... ف...... بینا!'' شاداب نے بینا کافی لمبا کھینچتے ہوئے دہائی دی۔ ''ابنارمل تم دونوں بہنیں ہی ہو۔ ایک وہ ہے شادی بیاہ اور رشتوں کے ٹاپک سے حد درجہ الرجک اور ایک تم ہو جسے دنیا میں اور کوئی موضوع ہی نہیں ملتا سوائے رشتہ لانے والی مائیوں کی طرح لڑکیوں کی بڑھتی عمروں اور رشتوں کی عدم دستیابی پہ سیر حاصل تبصرہ کرنے کے لیے۔ پلیز ذرا امی اور آنٹیوں کے ساتھ کم اٹھا بیٹھا کرو۔''

اب کے شاداب نے اپنے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھایا اور گل بین کو لتاڑ کر رکھ دیا' وہ برے برے منہ بناتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''توبہ ہے' آؤ سحاب! ہم ٹیرس پہ چلتے ہیں۔'' اس نے رحمہ کو اسکیچ بناتے' کشف کو اسٹڈی کرتے اور شاداب کو لڑنے پہ آمادہ دیکھتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ نکلنے پر اکسایا۔ اپنے بچاؤ کے لیے میں نے قریب پڑا نیوز پیپر اٹھا لیا۔

''تم چلو' میں بس ابھی آئی۔'' اس کے نکلتے ہی میں نے سکون بھری سانس لی۔

رحمہ نے سر اٹھا کر مجھے مسکرا کر دیکھا' میں بھی جھینپ کر مسکرا دی۔ بینا کو خالصتاً عورتوں والے سنجیدہ گھریلو مسئلوں میں الجھنے کا خبط تھا' کوئی بھی تازہ ترین واقعہ اسے کئی دن تک بحث چھیڑنے کا موقع فراہم کر جاتا اور میں جانتی تھی کہ اگلے دو چار روز میں' شبنم پھپھو کے آنے سے پہلے پہلے ہی وہ ان کے دونوں بیٹوں کے لیے ہم میں سے دو کو خود ہی فائنل کر لے گی اور پھر پھپھو کے دل میں جگہ بنانے کے لیے بیش بہا مشوروں سے بھی نوازے گی۔ جب سے اس کی منگنی ہوئی تھی تب سے وہ بھی بڑی امی' آنٹی رابعہ اور آنٹی فضیلہ کی طرح ''بکریوں'' کی فکر میں ہلکان رہنے لگی تھی۔ اس کی اس عادت سے ہم سب تو بے زار تھے ہی بیلا سب سے زیادہ تپتی تھی۔

اس وقت بھی اس کی بور کرنے والی گفتگو سے بچتے ہوئے میں نے نیوز پیپر کے اسپورٹس اسپیشل کے پیچھے پناہ لی۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے جے سوریا کے

نسواری چہرے پہ بجی' جامنی ہونٹوں سے جھانکتی' دودھ جیسے سفید دانتوں کی قطار کو منہ بناتے ہوئے دیکھا اور پیپر تہ کرکے ایک طرف رکھ دیا۔

''یار! کوئی نیوز تو سناؤ۔'' کشف نے اپنی کنگ سائز کتاب کے پیچھے سے فرمائش داغی۔

''تم خود بھی اخبار پڑھنے کی زحمت نہ کرنا۔'' اس کی سہل پسندی کو لتاڑتے ہوئے میں نے نیچے لاؤنج میں جانا زیادہ مناسب سمجھا۔ لیلیٰ آپی آج خلافِ معمول گھر پہ تھیں۔

''آپی! آپ...... ہاسپٹل نہیں گئیں۔'' میری آواز پہ وہ ایک دم چونک گئیں۔ ہاتھ میں پکڑے کشن اچھل کر نیچے جا گرے۔ خالی خالی نظروں سے وہ مجھے دیکھنے لگیں۔ میں سمجھ گئی کہ حسبِ عادت وہ ایک معمول کی طرح کو کشن پہ چڑھانے کا کام انجام دے رہی تھیں اور دماغ ان کا اس وقت کسی اور جہان کی سیر کر رہا تھا' میری آواز انہیں سیدھا منظر میں گھسیٹ لائی تھی اس لیے سوال دہرایا۔

''میری نائٹ ڈیوٹی ہے۔''

''تو پھر جا کر آپ آرام کیجیے' یہ کن کاموں میں لگی ہیں' ساری رات جاگنا ہے تو جا کر چند گھنٹے سو لیں۔'' میں نے ان کے ہاتھ سے باقی کے کشن لے لیے۔

''پاگل......!'' وہ سر جھٹک کے مسکرائیں۔ ''یہ کوئی سونے کا وقت ہے اور بھلا نیند بھی ایسے آتی ہے کہ جب چاہا بٹن آف کیا' سو گئے' بٹن آن کیا نیند پوری ہو گئی۔''

''آپ کا تو پتا نہیں' میری نیند بس ایسی ہی ہے' سونے کا ارادہ کرتی ہوں اور آنکھیں بند......'' فون کی بیل پہ گفتگو ادھوری چھوڑ کر کارنر پہ رکھے ٹیلی فون سیٹ کی جانب لپکی۔ آج ویک اینڈ تھا اور یہ وقت عطا کے فون کرنے کا تھا۔ دوسری طرف واقعی وہ تھا۔

''سحاب......! مجھے پتا تھا تم ہی ہوگی او مائی گاڈ...... ایک گھنٹہ تو کہیں نہیں گیا۔ کاش تم جان سکتیں یہ لانگ ڈسٹینس کال اس وقت مجھے کتنی بھاری محسوس ہوتی ہے' جب دوسری طرف تم میرے متھے لگتی ہو۔'' میری ہیلو کے جواب میں اس نے دہائی دی۔

''نہ دعا' نہ سلام...... رسالپور کی خمیری روٹیوں میں ایسا کون سا نمک ڈلتا ہے جس نے تمہارے دیدے ہوائی کر دیے ہیں۔ یہ ساری بے مروتی' بدلحاظی' زندہ دلانِ شہر لاہور سے نکلنے کا نتیجہ ہے۔''

''سلام بھی کر لیتے ہیں جناب اور دعا بھی دے لیتے ہیں' جایئے بی بی سحاب رحمت اللہ چوہدری! خدا آپ کے شر سے اہلِ خاندان کو محفوظ رکھے۔ اچھا اب ممی اور بڑی امی

سے بات کرواؤ میری' پاپا گھر پہ ہیں کیا؟''

''پہلے مجھ سے تو نمٹ لو پیڑے۔'' سامنے بیٹھی مسکراتی لیلیٰ آپی کو بھی میں نے اشارے سے منع کر دیا کہ ابھی وہ کسی کو عطا کے فون کا نہ بتائیں' میں جانتی تھی اس سے بات کرنے کے لیے ابھی گھر بھر اکٹھا ہو جائے گا۔

''تم سے تو اللہ ہی نمٹے گا جلیبی...... وہ بھی جلی ہوئی۔''

''اچھا یہ بتاؤ' کیسی گزر رہی ہے' لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے۔''

''تمہارے بغیر خاصا پرسکون ماحول ہے۔'' اس نے مسلسل میرا دل جلانے کی کوشش جاری رکھی لیکن میں ڈھیٹ بنی رہی۔ جانتی تھی اس وقت ہر منٹ گزرنے پر اس کا خون خشک ہو رہا ہوگا بل بڑھنے کے خوف سے' میں نے اس کی جزبز ہوتی شکل کا تصور کرتے ہوئے مزہ لیا۔

''ہاں لڈو پیڑے! ایک ضروری بات پوچھنی تھی' کب سے پوچھنا چاہ رہی تھی مگر موقع ہی نہیں ملتا تھا' آج یاد آ گئی تو سوچا تم سے پوچھ لوں...... دیکھو سچ بتانا۔''

''ہاں ہاں...... کیا بات ہے؟'' میری توقع کے عین مطابق وہ متجسس ہو گیا۔ میں نے بھی لہجے میں حد درجہ سنجیدگی بھرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہنا شروع کیا۔

''سنو یہ جو تمہارے میس کا دھوبی ہے' کیا وہ بھی تمہارے موزے دھوتے ہوئے آپا فاطماں کی طرح الٹیاں کرتا ہے......؟''

جملہ مکمل کرتے کرتے میری خود ساختہ سنجیدگی فوت ہو گئی اور قہقہہ ابل پڑا۔ دوسری طرف مکمل خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت بے بسی کی انتہا پہ کھڑا دانت پیس رہا ہوگا۔ پی سی او سے فون کرنے کی وجہ سے کال ڈس کنیکٹ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پھر دوبارہ نہ جانے کب باری آئے اور یہی وقت ہوتا تھا اسے جی بھر کے تنگ کرنے کا...... لیلیٰ آپی کی سرزنش کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں نے اپنا شغل جاری رکھا۔

''چہ چہ' بری بات...... اچھے بچے ایسے نہیں کرتے' میں جانتی ہوں اس وقت تم اپنے وسیع و عریض چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے میرے بارے میں کوئی ناشائستہ کلمات کہہ رہے ہو گے۔''

''سحاب! میں آخری بار کہہ رہا ہوں میری جان چھوڑ دو' ورنہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔''

''اچھا کیا کر لو گے تم؟''

’’میں اسی ہفتے لاہور آ رہا ہوں پھر آ کر بتاؤں گا۔‘‘ اس نے دھمکی دی‘ میں خوف زدہ ہونے کے بجائے خوشی سے چلا اٹھی۔

’’سچی‘ پیڑے! تم آ رہے ہو؟ زیادہ دنوں کے لیے نا؟‘‘

قریب سے ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے گزرتی چوہدری عطا اللہ کی چھوٹی بہن کائنات عرف کیٹی کے کان کھڑے ہوئے پیڑے کا لفظ سن کر۔

’’عطی بھیا......! عطی بھیا کا فون۔‘‘ اس کی ساری سستی ہوا ہوگئی اور پھرکی کی طرح گھر بھر میں گھوم کر اس نے خبر نشر کردی۔ کمروں کے دروازے کھلنے لگے‘ بڑے ابو‘ بڑی امی دوپہر کو سونے کے عادی تھے‘ سو آنکھیں ملتے باہر نکلے۔ بڑے پاپا یعنی عطا کے والد ننگے پیر اسٹڈی سے بھاگے آئے۔ رابعہ آنٹی شاید کوئی وظیفہ پڑھ رہی تھیں اسی طرح چادر لپیٹے تسبیح تھامے بیٹے کے فون کی خبر سن کر چلی آئیں۔ چاچو نے بھی کیبل کے آگے سے اٹھنا گوارا کرلیا اور فضیلہ آنٹی کی انگلیوں میں دبا پین بتا رہا تھا کہ وہ نوٹس بناتے بناتے اٹھ کے باہر آئی ہیں۔ بینا جو کچھ دیر قبل منہ پھلائے پھر رہی تھی اب باچھیں چیرے بڑے ابو کو فون پہ باتیں کرتا دیکھ رہی تھی جیسے ساری گفتگو اس کی سمجھ میں آ رہی ہو۔ مجھے اسے دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ کشف بھی کتاب سمیت بات کرنے کے خواہش مندوں میں قطار بنائے موجود تھی البتہ بڑے ابو کے بجائے موٹے چشموں کے پیچھے سے اس کی ذہین آنکھیں کتاب پہ ہی مرکوز تھیں۔ رحمہ کے چہرے پر ماسک لگا تھا اور شاداب ریسیور کو بڑے غور سے ابو سے بڑی امی تک منتقل ہوتے دیکھ کر بڑبڑا رہی تھی۔

’’لو اب بھلا بڑی امی آسانی سے ریسیور کا پیچھا چھوڑیں گی؟ وہ تو پوری رپورٹ لیں گی کہ عطا نے پشتو کے اور کون کون سے لفظ سیکھے ہیں‘ چارسدہ کے چپلی کباب کھائے یا نہیں۔‘‘ اور اس کے پیچھے لائن بنا کے کھڑی ’’چھوٹیاں‘‘ کیٹی‘ حمنٰی اور سیما۔ بہ ظاہر بڑے صبر سے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔

’’کتنا خوش نصیب ہے یہ عطا بھی...... ماشاء اللہ۔‘‘

اسے اتنے لوگوں کی محبتیں سمیٹتے دیکھ کر مجھے بے ساختہ رشک سا آیا پھر دادو کی گھوریاں تصور میں آتے ہی میں نے گڑبڑا کر ماشاء اللہ کہا۔ جب دادو زندہ تھیں تو ہم سب ہی کزنز عطا سے خار کھایا کرتیں۔ دادو‘ دادا کی ساری شفقتیں‘ عنایتیں اس پہ نچھاور ہوتے دیکھ کر جل جل کر جل ککڑی بن جایا کرتیں اور ہمارے ہلکے سے کسی حاسدانہ جملے پہ وہ غضب ناک ہوکر گھورتیں۔

’’اے شیریں یہ ان لڑکیوں کو یہاں سے لے جا...... کم بخت ماریاں کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہمارے شہزادے کو کھاتا دیکھ کر گھور رہی ہیں حالاں کہ پہلے میں نے انہیں ایک ایک کیلا پکڑایا پھر عطا اللہ کو کھلانے بیٹھی ہوں مگر یہ جو ’’بکریاں‘‘ ہیں نا‘ منٹوں میں سب چر کر اس پہ نظر لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔‘‘

اور بڑی امی سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ کر مجھے‘ بیلا‘ بینا‘ شاداب اور رحمہ کو گھسیٹ لے جاتیں اور تب ہی کسی دن بڑے غصے سے عطا کے پھولے پھولے گالوں والے گول چہرے کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے ’’لڈو پیڑے‘‘ کا خطاب دیا تھا۔

میری چوں کہ اس سے اچھی خاصی بات ہوچکی تھی لہٰذا اپنے اور شاداب کے مشترکہ کمرے کا رخ کیا۔ جہاں ہمیشہ کی طرح بیلا پہلے سے موجود تھی اگرچہ اس کا اور بینا کا کمرہ ایک تھا لیکن چوں کہ دونوں کی چونچیں اکثر لڑتی رہتیں اس لیے وہ تب اپنے کمرے کا رخ کرتی جب بینا کے سونے کا پکا یقین ہو جاتا۔ مجھ سے اس کی خوب بنتی شاید اس لیے کہ مجھے کرید کرید کر سوال کرنے کی عادت نہ تھی۔ اب بھی میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ سارے گھر کی طرح عطا سے بات کرنے کی خواہاں کیوں نہیں۔ اسے میری یہی عادت پسند تھی کہ میں بلاوجہ کسی بھی عمل کی وجہ دریافت کرنے کھڑی نہیں ہو جاتی‘ حالاں کہ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ میرے سوال نہ کرنے کی وجہ میری بے نیازی نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کبھی کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پڑتی ہی نہیں‘ مجھے خود ہی سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔ جی ہاں‘ میری ڈھیروں ڈھیر خصوصیات میں یہ سرفہرست خصوصیت ہے‘ میری قیافہ شناسی جو غضب کی ہے۔

’’بیلا! عطا آ رہا ہے ڈھیر سارے دنوں کے لیے۔‘‘

’’یوں کہو ڈھیر سارے کوفت بھرے دنوں کے لیے۔‘‘ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ اسی وقت لیلیٰ آپی اندر آ ئیں۔

’’تم دونوں فارغ ہو تو جا کر ذرا گیسٹ رومز کی ڈسٹنگ وغیرہ کردو۔‘‘

’’کردیں گے آپی! بلکہ جس وقت شبنم پھپھو نے آنا ہوگا اس سے آدھا گھنٹہ پہلے کریں گے ابھی کرنے کا کیا فائدہ‘ پھر سے گرد جمع ہو جائے گی۔‘‘ بیلا نے بے زاری سے کہا۔ وہ کام چور تھی نہ سہل پسند بلکہ ہم سب میں زیادہ ذمہ دار...... لیکن ان متوقع مہمانوں سے نہ جانے کیوں بیر کھائے بیٹھی تھی۔

’’وہ لوگ کل صبح کی فلائٹ سے آ رہے ہیں۔ پہلے پھپھو نے اپنے سسرال جانا تھا

اور ایک ہفتے کے بعد ادھر آنا تھا لیکن اب پتا چلا ہے کہ ان کی ساس اپنے بڑے بیٹے کی فیملی کے ساتھ عمرے پہ گئی ہیں اس لیے وہ سیدھا یہیں آئیں گی۔'' میں نے اسے اطلاع دی تو وہ منہ بنا کر چپ ہوگئی۔

***

میری زندگی کا تیسرا سال ختم ہوکر چوتھا شروع ہو رہا تھا جب پاپا کی انگلی تھامے میں ''چوہدری ہاؤس'' میں داخل ہوئی اور اس منظر سے میرے حافظے کی کتاب کا پہلا ورق کھلتا ہے۔ میرے ساتھ مجھ سے بڑی بہن شاداب اور پاپا کی گود میں مجھ سے چھوٹی سیماب تھی۔

میں بڑی بڑی آنکھیں کھولے پاپا کو دادو کی گود میں سر رکھ کر تو کبھی دادا کے کاندھے سے لگ کر روتے دیکھ رہی تھی۔ بالکل پاپا ہی کے جیسے دکھنے والے ایک انکل جن سے بڑے ابو کہہ کر تعارف کرایا گیا تھا' بار بار پاپا کو چپ کراتے ہوئے دادو کو بھی مزید بولنے اور گلے شکوے کرنے سے باز رکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک خوب گوری چٹی صحت مند سی عورت کی گود میں میری دو ماہ کی بہن سیماب ایک طرف گردن ڈالے سو رہی تھی۔ میں حیران رہ گئی' سیما کتنے دنوں سے پاپا کے لیے مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ روتی تو چپ ہی نہ ہوتی اور سونا تو جیسے اسے آتا ہی نہ تھا۔

شاداب ایک طرف لائن بنا کر کھڑی تین بچیوں کی طرف متوجہ تھی۔ ایک میم آگے آئی' شاداب کا ہاتھ پکڑ کر اس کا تعارف ان بچیوں سے کرانے لگی۔ ان بچیوں میں تیسری جو سب سے چھوٹی تھی' شاید بالکل میری ہی عمر کی' وہ ہوبہو اس میم کی کاپی تھی۔ ویسی ہی گوری گلابی رنگت' کھڑے نقوش' نیلی کانچ سی آنکھیں اور ہلکے سنہرے بال جو دو ننھی منی پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے۔ ایسی ہی ایک سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی گڑیا اس میم کی گود میں بھی تھی جس کے منے سے لب بے حد سرخ تھے۔ میں دلچسپی سے اس میم اور انگریز گڑیوں کو دیکھنے لگی۔ عینک والے انکل نے' جن سے پاپا نے بڑے پاپا کہہ کر متعارف کرایا تھا' میرا ہاتھ تھام کر اپنے پاس کھینچا اور آواز دی۔

''کشف!''

وہی انگریز گڑیا بھاگ کے آئی اور بڑے پاپا نے مجھے اس کے ساتھ کھیلنے بھیج دیا۔ بڑے کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے چائے کی ٹرالی اندر لاتے ہوئے ایک اور نازک سی' دلہن جیسی آنٹی کو دیکھا' دلہن اس لیے کہ وہاں موجود تمام آنٹیوں میں اس نے میک اپ

بھی کیا ہوا تھا' کانوں میں لٹکتے بندوں کے ساتھ ساتھ' گلے میں لاکٹ اور موتی سی چین بھی موجود تھی۔ انگلیوں میں کئی ایک رنگز اور کلائی میں سونے اور کانچ کی چوڑیاں بھی تھیں جبکہ وہ میم آنٹی ان کے گلے میں بس اللہ والا لاکٹ اور دوسری والی کی ایک کلائی میں عجیب موٹا سا کنگن پھنسا ہوا تھا۔ یہ تھا میرا پہلا تعارف چوہدری ہاؤس کے مکینوں سے۔ جلد ہی میں نہ صرف ان سب سے واقف ہوگئی بلکہ خود سے بھی۔ ہاں دادو کی بدولت وقت سے بہت پہلے ہی مجھے وہ باتیں بھی معلوم ہوگئیں جو شاید پاپا مجھ سے ابھی چھپانا چاہتے تھے۔

بڑے چوہدری صاحب یعنی میرے دادا گاؤں سے شہر اٹھ کر آئے تھے اس لیے گھر میں روایتی نظام اور خاندانی رکھ رکھاؤ واضح طور پر نمایاں تھا لیکن پوش علاقے میں رہائش رکھنے' مالی حیثیت اچھی ہونے اور پھر سب سے بڑھ کر اولاد کو اچھے اداروں میں پڑھانے کی وجہ سے بہت جلد پینڈو پن کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ ان کی بیٹی کوئی نہ تھی' چار بیٹے تھے' چھوٹے بھائی کی بیٹی کو لگاؤ کی وجہ سے اپنے ساتھ شہر لے آئے تھے' پڑھا لکھا کر خود ایک اچھے تعلیم یافتہ گھرانے میں شادی کی۔ یہی شبنم پھپھو تھیں جو شادی کے چند سال بعد ہی اپنے شوہر کے ساتھ ساؤتھ افریقہ چلی گئیں۔

دادو اچھے رعب داب والی خاتون تھیں لیکن ددا کے آگے انکا بس نہ چلتا تھا۔ ددا کو اپنی من مانی کا شوق تھا۔ بڑے بیٹے ہدایت اللہ کی شادی خود ہی کہیں طے کر آئے اور گھر آ کر اطلاع دی۔ دادو بیٹے کے لیے چاند سی دلہن ڈھونڈنے کا خواب ٹوٹتا دیکھ کر سٹپٹا گئیں۔ ددا نے اپنے کسی دوست کی بیٹی سے رشتہ جوڑا تھا جو افغانی نژاد' قالینوں کا تاجر تھا اور چند سال قبل ہی قندھار سے ڈیرہ اسماعیل خان آ کر رہائش پذیر ہوا تھا۔ دلہن آئی چاند سی ضرور تھی مگر بیٹے سے چند سال بڑی اور سسرال کی زبان پنجابی سے نابلد ہونے کے علاوہ اردو بھی ٹوٹی پھوٹی بولتی تھی۔ دادو' فارسی اور پشتو بولنے والی اس لمبی تڑنگی گنوار اطوار والی بہو سے ذرا خوش نہ ہوئیں۔ یوں بڑی امی یعنی شیریں بی بی چوہدری ہاؤس کی پہلی اور بڑی بہو ہونے کے ساتھ ساتھ ناپسندیدہ بہو بھی کہلائیں۔

دادو نے ددا کے خلاف اسٹینڈ لیا اور انہیں مزید کسی بیٹے کے سلسلے میں کوئی اختیار دینے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے بیٹے نعمت اللہ چوہدری یعنی بڑے پاپا نیوی میں تھے اب دادو نے ان پہ زور دینا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ برادری میں لڑکیاں دیکھنا بھی جاری رکھا لیکن بڑے پاپا ان کی ہر منتخب کردہ لڑکی کو مسترد کر دیتے۔ ایسے میں بڑے ابو کے ہاں گل لیلیٰ' گل رخ کا اضافہ ہوگیا اب دادو کے دل میں پوتے کے ارمان بھی مچلنے

لگے' ان کے بڑھتے دباؤ سے تنگ آ کر بڑے پاپا نے صاف کہہ دیا کہ وہ شادی کرنے پہ تیار نہیں اور خصوصاً برادری میں تو ہرگز نہیں۔

ناچار دادو نے اپنی خالہ زاد بہن کی بیٹی سمیرا کو' جو انہیں خاصی بھائی تھیں' اپنے تیسرے بیٹے رحمت اللہ چوہدری یعنی میرے پاپا کے لیے مانگ لیا۔ خوب جوش وخروش سے شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں' سارے ارمان نکالے گئے۔ بے چاری شیریں بی بی جو ساس کو خوش کرنے کے لیے پراندہ باندھنا شروع کر چکی تھیں (مینڈھیاں چھوڑ کر) برقعہ اوڑھنا شروع کر چکی تھیں (افغانی چادر ترک کر کے) اور پنجابی آمیز اردو بولنے کی پریکٹس بھی کرتی رہتی تھیں اس کے ساتھ ساتھ ان تین سالوں میں انہوں نے دن رات پنجابی کھانے پکا پکا کر ساس سسر کو کھلائے' آدھی آدھی رات تک ساس کی ٹانگیں دبائیں...... ان تمام کاوشوں کے باوجود وہ ساس کی نظر میں معتبر نہ ٹھہر سکیں جبکہ سمیرا یعنی میری ممی چوہدری ہاؤس میں آنے سے پہلے ہی دادو کی پسندیدہ اور چہیتی بہو کی سند پا چکی تھیں کیوں کہ وہ پنجابی تھیں' برادری کی تھیں اور سب سے بڑھ کر دادو کا اپنا انتخاب۔

اسی شادی پہ ایک اور دھماکا ہوا اور وہ تھا بڑے پاپا کی اپنی فرنچ بیوی کے ساتھ اچانک آمد۔ دادو کو اپنی من پسند بہو لانے کا سارا مزا کرکرا ہوتا محسوس ہوا۔ جتنا ہوسکتا تھا بیٹے سے ناراضی دکھائی برا بھلا کہا لیکن ایک تو شادی کا موقع' دوسرے گھر میں مہمانوں کا تانتا اور سب سے بڑھ کر نئی آنے والی میم بہو کی خوب صورتی' بات دو چار دنوں میں دب ہی گئی لیکن دادو نے اتنی جلدی دل صاف نہ کیا۔ بڑے پاپا اپنی نئی نویلی دلہن امیریل کے ساتھ اگلے ہی ہفتے واپس چلے گئے۔ یوں بھی ان کی شادی کو چند ہی روز ہوئے تھے اور ان کی من چاہی بیوی کا سواگت اتنے کھلے دل سے نہ ہوا تھا کہ وہ مزید رکنے کا سوچتے۔

میری ممی کو چوہدری ہاؤس میں ایک خاص اسٹیٹس حاصل ہوا۔ وہ باقی دونوں بہوؤں کے مقابلے میں اپنی اپنی تھیں' اس لیے ان کی آؤ بھگت زیادہ ہوئی۔ دادو نے بڑی بہو کے مقابلے میں ان کو واضح اہمیت دینی شروع کی۔ ان کے ناز نخرے کسی شہزادی کی طرح اٹھائے گئے لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ ان کا دل اس محل نما کوٹھی میں نہ لگ سکا۔ اس وقت اتنے لوگ تو نہ رہتے تھے یہاں کہ وہ تنگ پڑتیں لیکن وہ تنگ آ گئیں اور بہت جلدی تنگ آ گئیں۔ مستزاد یہ کہ انہوں نے دوسروں کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیا۔ پاپا پر وہ شادی کے چھ ماہ بعد ہی الگ گھر کے لیے زور ڈالنے لگیں۔ پاپا کے لیے ان کی اس فرمائش پہ عمل کرنا مشکل تھا وہ ٹالنے لگے تو ممی دوسرے حربے آزمانے لگیں۔

انہوں نے دادو اور ددا کے اصول وضوابط کی کھلم کھلا خلاف ورزی شروع کر دی۔ محض ایف اے تک کی تعلیم کے زعم میں نوکری کرنے کا اعلان کر دیا جبکہ ان دنوں وہ امید سے بھی تھیں ظاہر ہے کہ ساس سسر نے مخالفت ہی کرنا تھی اور ایسی صورت میں جب ملازمت بھی کوئی قابلِ احترام نہ تھی۔ کئی کئی دن تک وہ کمرے سے نہ نکلتیں' کھانا اندر منگواتیں' گھر آئے عزیز واقارب کو سلام کیے بغیر آرام سے پاس سے گزر جاتیں۔ بغیر کسی کو بتائے' اجازت لیے کہیں چلی جاتیں' دادو کے سارے لاڈ نخرے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اپنے انتخاب کے کرتوتوں پہ وہ شوہر اور بیٹے سے منہ چھپائے پھرتیں۔

پھر شاداب کی پیدائش ہوئی۔ روایت کے مطابق پہلی اولاد ننھیال میں ہوتی ہے لیکن شاداب کو پیدا ہوئے سات ماہ گزر گئے اور ممی نے سسرال میں قدم رکھنا گوارا نہ کیا۔ ان کی ایک ہی ضد تھی۔ الگ گھر...... ناچار دادو اور ددا کو گھٹنے ٹیکنے پڑے' انہیں اس فیصلے تک لانے میں بڑے ابو کا بھی ہاتھ رہا۔ ان کے جانے کے بعد دادو اور ددا کو پھر سے بڑی امی نے ہی سنبھالا۔

ایسے میں بڑے پاپا کی طرف سے یہ خبر ان کے مردہ دلوں میں نئی جان ڈالنے کا سبب بنی کہ وہ ایک بیٹے کے باپ بن چکے ہیں۔ ددا کی خواہش پہ پہلے پوتے کا نام عطا اللہ رکھا گیا حالاں کہ اس سے پہلے بڑے ابو کی بیٹیوں کے نام رکھنے میں کسی نے دلچسپی نہ لی اور بڑی امی خود ہی اپنے افغانی ٹائپ نام رکھتی گئیں۔ پہلے گل لیلیٰ' پھر گل رخ اور عطا اللہ کے چند ماہ بعد ہونے والی گل بین۔ ماں باپ کی خواہش پہ بڑے پاپا بیٹے اور بیوی کو لے کر پاکستان چلے آئے۔ اپنی فرنچ بہو کو دیکھ کر دادو اور ددا کو ایک اور خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ امیریل اب رابعہ نعمت بن چکی تھی۔ انہوں نے اسلام کو محض شوہر کا مذہب جانتے ہوئے نہیں بلکہ دل اور روح کی گہرائیوں سے قبول کیا تھا۔ یہ بات ان کے ہر عمل سے واضح تھی۔

یوں ممی کے جانے کے بعد دادو کی پسندیدہ بہو کا عہدہ رابعہ آنٹی نے سنبھال لیا۔ یوں بھی اب وہ ایک عدد بیٹے کی ماں تھیں یعنی جو کارنامہ اب تک ان کی دونوں بہوؤں نے نہ کیا تھا وہ انہوں نے انجام دیا۔ بعد میں بھی یہ ریکارڈ بہ دستور قائم رہا یعنی عطا اللہ کے بعد بڑے چوہدری صاحب کے کسی بیٹے کو اولادِ نرینہ نہیں ہوئی البتہ ان کی زندگی میں بیٹی کی جو کمی رہ گئی تھی وہ ہر سال آنے والی پوتیوں نے پوری کر دی یہاں تک کہ دادو بوکھلا گئیں۔

''آئے ہائے' گھر ہے کہ گوال'' (بکریوں کے رہنے کی جگہ۔)

ان کے چھوٹے صاحب زادے چوہدری حبیب اللہ یعنی چاچو کے لیے دلہن کا انتخاب بھی بڑے پاپا اور رابعہ آنٹی نے کیا۔ فضیلہ آنٹی بڑے پاپا کے ایک پروفیسر کی بہن تھیں۔ دادو کو کوئی اعتراض نہ ہوا' ہوتا بھی کیسے' فضیلہ آنٹی ہر اعتبار سے پسند کیے جانے کے قابل تھیں۔ خوب صورت' باوقار' اعلا فیملی بیک گراؤنڈ کے ساتھ تعلیم یافتہ بھی تھیں۔

اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی نیت کرتے ہوئے انہوں نے دادا سے ملازمت کی اجازت مانگی۔ انہیں ایک اچھے تعلیمی ادارے سے لیکچرر شپ کی آفر ہوئی تھی جسے انہوں نے شادی کی وجہ سے ٹال دیا تھا۔ ان کا اجازت طلب کرنے کا انداز اتنا پیارا تھا یا ملازمت بہت باوقار تھی یا پھر شاید بدلتے وقت کا تقاضا تھا کہ وہ مان گئے۔ یہ خبر دوسرے شہر میں سارے خاندان سے کٹ کر بیٹھی میری ممی تک پہنچی اور وہ تڑپ گئیں۔ لڑنے جھگڑنے کو ایک نیا وضوع مل گیا۔ پاپا نے لاکھ سمجھایا۔

''وہ گولڈ میڈلسٹ ایم ایس سی' ایم فل ہے۔ اتنے عمدہ کالج میں لیکچرر لگی ہے جبکہ تم ایک گھٹیا سے آفس میں اسٹینو کی جاب کرنے چلی تھیں' کیسے اجازت ملتی۔''

لیکن یہ تلخ سچائی ممی سے ہضم نہ ہوئی اور جھگڑے روز بروز بڑھنے لگے۔ شاداب کے بعد میں آئی اور پھر سیماب کی آمد آمد تھی کہ ایک زوردار جھگڑے کے بعد ممی میکے چلی گئیں۔ میں اور شابو پاپا کے پاس ہی تھے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد وہ روٹھ کر میکے جاتیں اور پھر پاپا منا کر لاتے۔ اس بار شاید پاپا زیادہ غصے میں تھے' منانے نہ گئے۔ تین ماہ گزر گئے اس بے نیازی نے ممی کو کھولا کر رکھ دیا اور اسی عالم میں انہوں نے انتہائی قدم اٹھا لیا۔ پاپا کو خلع کے نوٹس کے ساتھ ہی دو ہفتے کی سیماب بھی موصول ہوئی۔

چند مشکل ترین دن اور راتیں گزارنے کے بعد وہ اس خود ساختہ سزا سے گھبرا گئے اور ماں کے دامن میں پناہ لینے دوڑے آئے اور وہی دن تھا' میرا چوہدری ہاؤس میں پہلا دن۔

دادو کو بیٹے کی رہائی اور واپسی سے جہاں خوشی ملی وہیں بکریوں کے ریوڑ میں اضافے نے افسردہ کر دیا۔ بڑے ابو کے ہاں گل بین کے بعد گل بیلا آ چکی تھی۔ بڑے پاپا کے عطا اللہ کے بعد کشف اور کائنات نے ان کی فیملی مکمل کر دی تھی جبکہ چاچو اور فضیلہ آنٹی کی فیملی مختصر تھی' رحمہ اور حمنہ۔

ایسے میں ہم تینوں کی آمد نے عطا اللہ کی قدر اور بڑھا دی۔ وہ سج بن کے دادو کے

پلنگ پہ بیٹھا رہتا اور وہ اسے حلوے' انڈے' مٹھائیاں' کیک' پیسٹریاں اور پھل کھلا کھلا کر موٹا کرتی رہتیں۔ عجیب ٹھس سا بچہ تھا۔ نہ کھیلتا' نہ شرارتیں کرتا' بس دادو کی گود میں بیٹھا کچھ نہ کچھ ٹھونستا رہتا۔ ہم سب اس کی آؤ بھگت سے حسد کرتیں اور جہاں موقع ملتا بدلہ لینے سے نہ چوکتیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لڑکیوں کے اس جتھے کے جتھے سے بڑا گھبراتا۔ ذرا اکیلا ہوتا تو کبھی شاداب بھوت کا ماسک پہن کر ڈرا دیتی' کبھی میں ٹانگ اڑا کر گرا دیتی' کبھی گل بیلا اس لڑھکتے ہوئے گیند کو زوردار دھکے کے ساتھ آگے گرا دیتی' کبھی گل بین چپکے سے اس کی ہوم ورک کاپی کا ورق پھاڑ لاتی۔

ددا کی اچانک وفات نے دادو کو بہت چڑچڑا کر دیا اب وہ کبھی عطا اللہ کو آزاد بھی چھوڑنے لگیں۔ ذرا ان کی عنایات کم ہوئیں تو ہم سب کے دلوں میں بھی اس کے خلاف نفرت کم ہونے لگی۔ باشعور ہوتے ذہنوں میں اس کے اکلوتے ہونے کا احساس شدت سے جڑ پکڑنے لگا۔ دوسرے وہ تھا بھی ذرا بے ضرر سا لڑکا۔ ہم سب کے مقابلے میں بے حد سیدھا اور احمق سا۔ رفتہ رفتہ دشمنی دوستی میں بدلنے لگی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بڑی امی اور رابعہ آنٹی کی پرشفقت تربیت ذہن سنوارنے کا کام دے رہی تھی۔

بڑی امی کا اب بھی وہی حال تھا۔ چار چار بیٹیوں کی ماں ہونے کا جرم انہیں دادو سے کبھی قریب نہ کر سکا۔ دادو کے آخری دنوں میں انہوں نے جی جان سے ان کی خدمت کی مگر وہ مقام نہ پا سکیں جو رابعہ آنٹی کا تھا لیکن انہوں نے کبھی رابعہ آنٹی سے حسد محسوس نہ کیا نہ ان کی اہمیت پہ' نہ ہی بیٹے کی ماں ہونے پہ' کیوں کہ رابعہ آنٹی بہ ذاتِ خود اتنی اچھی تھیں کہ کوئی ان سے کدورت رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کی ستھری اور نکھری شخصیت کے سارے رنگ ان کی اولاد میں واضح تھے۔ عطا اللہ جو دادو کے اتنے بے جا لاڈ پیار کے باوجود بگڑنے نہ پایا تھا اور نہ ہی خاندان بھر کے اکلوتے لاڈلے سپوت ہونے کا غرور اسے تباہ کر پایا تھا' اس کے بعد کشف جو میری ہم عمر تھی اور اب سائیکالوجی میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ اس کی واحد دلچسپی تعلیم تھی ــــ بے حد معصوم ذہنیت والی میری یہ کزن ہم سب میں سے کم عمر نظر آتی حالاں کہ میں بیلا' رحمہ اس کی عمر کے تھے۔ اس سے چھوٹی کائنات فرسٹ ایئر فول تھی' ویسے وہ فرسٹ ایئر میں جانے سے پہلے بھی فول ہی تھی اور آئندہ بھی ان شاء اللہ۔

بڑی امی کی شخصیت کا سب سے گہرا رنگ بے لوث خدمت اور خلوص تھا۔ اپنی چار بچیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہم تین بن ماں کی بچیوں کو بھی سنبھالا۔ وہ تو شاید بھول

ہی گئیں کہ ان ساتوں میں سے ان کی اپنی بیٹیاں کون سی ہیں۔ ایک روایتی ماں کی طرح ان کے دل میں بھی بیٹے کی آرزو ہمیشہ زندہ رہی۔ سارے چاؤ انہوں نے کسی رقابت کے بغیر عطا پر پورے کیے' وہ بھی اپنی ماں جیسی ہی تعظیم انہیں دیتا۔

وہ گل لیلیٰ کی شادی کا ارمان بھی خاصے عرصے سے پالے ہوئے تھیں کیوں کہ ان سے چھوٹی گل رخ جنہیں سب رخے آپی کہتے تھے' دو سال پہلے بیاہ کر کینیڈا چلی گئیں اور جانے سے پہلے اپنے اکلوتے دیور سے گل بین کی بات بھی پکی کر گئیں اور...... لیلیٰ آپی اپنی ضد پہ قائم تھیں۔ وہ ڈاکٹر تھیں جبکہ گل بین نے بہ مشکل بی اے کر کے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا اور اپنی شادی ادر جہیز کی تیاریوں میں راضی خوشی' مگن تھی۔

سب سے چھوٹی گل بیلا یعنی بیلا جو میری دوست' کلاس فیلو اور ہم مزاج بھی تھی۔ بس چند ایک باتوں کے علاوہ ہماری سب ہی عادتیں' پسند ناپسند ملتی جلتی تھیں۔ ہم دونوں ہی بی ایس سی کے پیپرز دے کر فارغ تھے۔

مجھ سے بڑی شاداب نے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا اور آج کل کچھ کمپیوٹر کورسز کر رہی تھی۔ شاداب نے ممی کی چند عادتیں خاصی حد تک اپنالی تھیں۔ اسے ہر کسی سے بلاوجہ بدگمان رہنے کی عادت تھی۔ دادو زندہ تھیں تو ان کی ڈانٹ ڈپٹ کو' لعنت ملامت کو ہم کبھی ہنس کر کبھی منہ لٹکا کر سن لیتے اور پھر بھول بھال جاتے لیکن وہ گھنٹوں کڑھتی رہتی۔ بڑی امی کی عنایات بھی اسے زہر لگتیں' جب کوئی ان کی بے لوث قربانیوں کا ذکر کرتا کہ ''شیریں نے تو دیورانی کی بچیاں کلیجے سے لگا کر پالی ہیں'' تو وہ بے تحاشا چڑ جاتی۔ کسی کا احسان قبول کرنا اس کی فطرت میں ہی نہ تھا۔

جب کہ سیماب مجھ جیسی تھی البتہ تعلیمی میدان میں وہ بلاشبہ مجھ سے آگے تھی۔ میں نے گریڈ بنانے کے چکر میں ایف ایس سی کے پیپرز دو بار دیے تھے جب کہ وہ اسکول میں ہی ایک سال میں دو دو کلاسز پھلانگتی اب ایم بی بی ایس کے فرسٹ ایر میں تھی۔ تعلیمی میدان میں آگے ہونے کے باوجود اس کی دوستی میٹرک میں پڑھنے والی حمنہ اور فرسٹ ایر فول کیٹی سے تھی کیوں کہ تینوں کی عمروں میں ایک آدھ سال کا فرق تھا۔

فضیلہ آنٹی کی دونوں بیٹیاں ان کی ہی طرح سنجیدہ مزاج مگر سادہ اور پرخلوص طبیعت کی تھیں۔ رحمہ این سی اے کی اسٹوڈنٹ تھی اور حمنہ اسکول کے آخری دن نمٹا رہی تھی۔

اور چوہدری عطا اللہ نعمت' جو اپنے پورے نام پہ خوامخواہ چڑ جاتا تھا' نے ہم سب کی

توقعات کے بالکل برعکس آرمی جوائن کر لی۔ اس جیسے ناز و نعم میں پلے بھالو سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ فوج کی سخت زندگی کے تکلیف دہ شب و روز برداشت کر لے گا لیکن دادو کی وفات نے اس کے معمولات پہ خاصا اثر ڈالا تھا۔ ان کا پیار اور عطا کی ان سے انسیت اپنی جگہ لیکن سچ تو یہ ہے کہ گود میں بٹھا بٹھا کر دادو نے اس کی شخصیت کو پروان نہ چڑھنے دیا۔ اب یہ تو اس کی اپنی فطرت کی اچھائی تھی یا رابعہ آنٹی کی تربیت کی سختی کہ موقع ملنے پہ اس کی شخصیت کی تمام تر مضبوطی سامنے آ گئی۔ آج کل وہ رسال پور میں تھا اور سارے گھر کو اس کی ویک اینڈ کی چھٹی کا انتظار رہتا۔ پچھلے دو ماہ سے وہ ایک دن کے لیے بھی گھر نہیں آیا تھا اور اب اکٹھی چھٹیاں لے کر آ رہا تھا۔ اس خبر نے گھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔

سوائے بیلا کے سب ہی پرجوش تھے۔ وہ پگلی اب تک بچپن کی تلخیاں دل سے لگائے بیٹھی تھی۔ دادو کا پوتیوں کو تحقیر بھرے اور نفرت انگیز طریقے سے پکارنا اسے بھولا نہیں۔ سب لڑکیوں میں اس نے اس بات کو زیادہ حساس انداز میں لیا اور غیر محسوس طریقے سے وہ رفتہ رفتہ اس بارے میں فکرمندی کا اظہار' اسے دادو کے کلمات یاد دلا دیتا۔ عطا کو ملنے والا پیار اور توجہ اسے حسد میں مبتلا کر دیتا۔ وہ اکثر ہم سب کو عطا کے آگے پیچھے گھومنے پہ لتاڑتی رہتی۔ چھوٹی تینوں مکمل طور پر اس کے لیکچرز کے اثر میں تھیں لیکن عطا کے معاملے میں وہ تینوں بھی اس کے ہاتھ نہیں آتیں البتہ باقی باتیں وہ بیلا ہی کی مانتیں۔ بیلا کا بس چلتا تو مجھ سمیت کشف' رحمہ اور بینا کو بھی اپنی مرضی اور اصولوں پہ چلاتی۔ اب بھی شبنم پھپھو کی آمد کی خبر پہ وہ تلملائی ہوئی پھر رہی تھی۔

❋ ❋ ❋

''میں ایک بار پھر کہے دے رہی ہوں' اس گھر میں کوئی افسانوی سچویشن نہیں دہرائی جائے گی۔'' رات کو جب تیاریاں مکمل ہونے کے بعد ہم سب چائے پی کر تھکن اتار رہے تھے بیلا نے ایک بار پھر تنبیہہ کی۔

''اوہو' ایک تو تم اور تمہاری نصیحتیں......'' بینا نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔

''یار ایک بات تو بتاؤ' اس گھر میں مزید کسی افسانوی سچویشن کی گنجائش ہے؟ پہلے ہی خاصا فلمی اور افسانوی ماحول ہے۔ ڈھیر ساری خوب صورت لڑکیاں' ایک سے ایک باکمال' تعلیم یافتہ اور سگھڑ...... ایک طرح دار سی پھوپھو کی دو جوان گبھرو بیٹوں کے ساتھ آمد...... وغیرہ وغیرہ' بنا بنایا خاتونی برانڈ ناول ہے۔'' میں نے ہنسی اڑائی۔

''اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ اب مزید پھندنے ٹانکنے کی ضرورت نہیں۔ پھوپھو کہہ چکی ہیں کو وہ یہاں بہوویں ڈھونڈنے آ رہی ہیں۔ اب اگر تم لوگ زیادہ آگے پیچھے پھرو گی تو وہ یہی سمجھیں گی کہ تم سب اپنے اپنے نمبر بنانے میں مصروف ہو۔ ڈوب مرنے کا مقام ہوگا یہ۔'' اس نے شرم دلائی تو کشف بھی متفق ہوگئی۔

''ہاں کہتی تو تم بھی ٹھیک ہو۔''

''اور یار! رشتوں کی کمی انہیں ہوگی جو اپنے بیٹوں کو لیے گھر گھر پسند کرواتی پھر رہی ہیں' ہمیں نہیں۔'' شاداب نے اپنی لمبی دودھیا گردن اکڑائی۔ اس ایک سال کے دوران اس کے تین پروپوزل آ چکے تھے۔ ایک تعلیم کی وجہ سے مسترد کر دیا گیا' دوسرا لڑکے کی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے اور تیسرے پروپوزل میں بڑے ابو کو لڑکے والوں کی 'جلدی' مشکوک کر گئی۔

سب کو متفق ہوتے دیکھ کر بیلا پرجوش ہوگئی۔ ''تو پھر کان کھول کر سن لو سب لڑکیاں میری ہدایت پہ عمل کریں گی۔ سب سے پہلے تو خبردار جو کسی نے اس پورے مہینے میں بیوٹی پارلر کا رخ بھی کیا ہو تو۔'' اس عجیب سی دھمکی پہ شاداب اور کشف دونوں کا موڈ خراب ہوگیا۔ دونوں ہی خود کو پورے گروپ میں سب سے خوب صورت سمجھتی تھیں۔

''ہاں...... جیسے ہم بیوٹی پارلر کے ہی تو محتاج ہیں نا! تمہارا تھوبڑا ہوگا بیوٹی پارلر کا محتاج' میں تو تین سال منہ نہ بھی دھوؤں تو تم سے زیادہ میری جلد چمکے۔'' ان دونوں کے بجائے گل بین عرف بینا چمک کے بولی تو سب کو اس کے تین سال منہ نہ دھونے والی بات پہ ہنسی آ گئی۔

''ویسے بھی دو دن بعد تو پہلا روزہ ہے' روزوں میں کہاں یہ سب ہوگا۔'' رحمہ نے بلا مقصد بحث سمیٹی۔ ''اور ہاں افطاری پہ سحاب تمہیں اور بینا کو زیادہ کارکردگی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ تم دونوں سارا سال کچن میں بھلے نہ جھانکو لیکن روزوں میں نت نئے پکوڑے' رولز اور چاٹ بنانے کے تجربے ضرور کرتی ہو۔ اس سال خدا کے لیے اپنے سگھڑاپے کے ٹریلر مت چلانا۔''

''سحاب کی تو چلو بات سمجھ میں آتی ہے۔ مجھ پہ پابندی کیسی؟ بھئی میں تو انگیجڈ ہوں۔'' بینا نے ناز سے دائیں ہاتھ کو لہراتے ہوئے منگنی کی انگوٹھی دکھائی۔

''اس غلط فہمی میں مت رہنا۔ شبنم پھوپھو کے آنے سے پہلے ہی ابو' چاچو وغیرہ جیسے غائبانہ نثار ہو رہے ہیں ان سے کوئی بعید نہیں کہ پھوپھو کو پسند آ جانے کی صورت میں وہ

تمہاری اس دو سالہ پرانی منگنی کو بھی خاطر میں نہ لائیں۔''

''ہائے اللہ...... نہیں۔'' اس نے انگوٹھی والا ہاتھ جھٹ سے پلو میں چھپا لیا۔

''اور سحاب تم کم از کم بیسن یا انڈوں کا حلوہ مت بنانا۔'' اس کے اس نئے آرڈر پر میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ سب جانتے تھے مجھے میٹھا کھانا بھی پسند ہے اور بنانا بھی۔

''ہاں ہاں کیوں کہ افسانوں میں' میں نے پڑھا ہے یہ لڑکے اور ان کی مائیں اکثر و بیشتر یہی دو حلوے کھا کر لڑکیوں پہ لٹو ہوتے ہیں۔''

''صبح صبح جاگنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ بدیسی مائیں صبح خیزی کی عادت پہ بھی ریجھ سکتی ہیں۔''

''لیکن روزوں میں تو سحری اور پھر فجر کی نماز کے بعد دوبارہ سونے کا ہمارے گھر میں کوئی رواج نہیں۔'' کشف نے نکتہ اٹھایا۔

''اچھا تو پھر کم از کم نماز کے بعد لان میں ٹہل ٹہل کر موتیے کی کلیاں اکٹھی کرنے کی زحمت مت کرنا۔''

''تم نے دیکھا ہے اس سے پہلے کبھی کسی کو یہ نامعقول حرکت کرتے ہوئے۔'' دھیمے مزاج کی رحمہ بھی زچ ہوگئی اس کی فضول تاکیدوں سے لیکن اس کے منہ کے بگڑتے زاویوں کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے اپنا ہدایت نامہ جاری رکھا۔

''اور ان کے بیٹے چاہے ہریتک روشن' ارجن رام پال اور میل گبسن کی پرسنالٹی کو ہی کیوں نہ مات دیتے ہوں' سب نے اپنے اپنے دل قابو میں رکھنے ہیں۔'' اب تو بات سب کی برداشت سے باہر ہوگئی۔

''تمہیں ہم سب اتنی دل پھینک نظر آتی ہیں۔'' شاداب نے اٹھا کے پاس پڑا میگزین اس کے سر پر دے مارا۔

''اب ایک نصیحت تم بھی میری کان کھول کے سن لو۔ گھنٹہ بھر سے تم نے افسانوی سچویشن کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کیا تم نے افسانوں میں یہ بات نوٹ نہیں کی کہ صبح صبح جاگنگ کرتے ہوئے' لان میں ٹکرانے والی' حلوے پراٹھے پکا پکا کے کھلانے والی' پارلر سے سج بن کے آنے والی اور پہلی نظر میں دل ہار جانے والیاں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں اور ہیرو صاحب کو بمعہ ان کی والدہ کے وہ کونے میں دبکی رہنے والی' گمنام دوشیزہ بھا جاتی ہے جو سر جھاڑ منہ پھاڑ رہنے کی عادی ہے' جو کسی فارن ریٹرن خوبرو شہزادے کو قطعی لفٹ

نہیں کراتی اور انتہائی بدمزہ چائے بناتی ہے۔ اس لیے محترمہ گل بیلا ہدایت! آپ بھی ذرا اپنی بے اعتنائیوں' کج ادائیوں اور بے نیازیوں کو انڈر کنٹرول کریں یہ نہ ہو آپ کی یہی ادا انفرادیت کی وجہ سے کسی کو لوٹ جائے۔'' میں نے خبردار کیا اور بیلا واقعی اچھے سمجھ دار بچوں کی طرح سر ہلانے لگی۔

* * *

اور اگلی صبح تڑکے تڑکے شبنم پھوپھو کی آمد بمعہ ان کے صاحب زادوں کے ہو ہی گئی۔ بڑے فخر کے ساتھ انہوں نے اپنے دائیں بائیں کھڑے لمبے تڑنگے گبھروؤں کا تعارف کرایا۔

''یہ صداقت ہے اور یہ شجاعت۔''

''آپی! یہ نام تو بہت سنے ہوئے لگ رہے ہیں۔'' حمنہ نے میرے کان میں سرگوشی کی اور یہ سرگوشی اتنی بلند تھی کہ مجھے فوراً اسے کہنی مارنی پڑی۔

''تم نے اپنی اردو کی بک میں پڑھے ہوں گے۔'' فرسٹ ایئر فول کیٹی کے کانوں تک یہ تبصرہ بہ آسانی پہنچ گیا۔ ''وہ ہے ناں علامہ اقبال کا شعر...... سبق پھر پڑھ صداقت کا' شجاعت اور کسی اور کا بھی' ہیں آپی وہ تیسرا کون تھا؟''

''میرا خیال ہے لیاقت تھا......'' حمنہ کو یاد آ گیا۔

''تو پھوپھو انہیں کیوں نہیں لائیں۔'' کیٹی اچک اچک کر آنٹیوں سے گلے ملتی' پھوپھو کے عقب میں کسی لیاقت صاحب کو ڈھونڈنے لگی۔

میں نے اس کے تیل چڑے بالوں میں چپت لگا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ شجاعت صاحب دلچسپی سے میری حرکت نوٹ کرنے لگے تو میں خجل ہوگئی۔ ان دونوں چھوٹیوں کے مذاکرات انہوں نے کہیں سن نہ لیے ہوں...... وہ کیا جانیں یہ دونوں اس وقت سنجیدگی سے کسی مسئلے کو ڈسکس کر رہی ہیں نہ کہ ان کے ناموں کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ بڑے صاحب زادے صداقت علی شکلاً مزاجاً لباساً ہر لحاظ سے سنجیدہ ترین لگ رہے تھے جب کہ شجاعت علی کے لبوں پہ مسلسل پھیلی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ موصوف کو خوامخواہ خوش اخلاقی بگھارنے کا عارضہ تھا۔ کڑی ہدایت کے زیر خوف ہم میں سے کسی نے اس مسکراہٹ کا جواب مسکرا کر دینے کی ہمت نہیں کی حتیٰ کہ بینا نے بھی نہیں۔

لیلیٰ آپی سے مہمانوں کی فوری ملاقات تو نہ ہوسکی کیوں کہ نائٹ ڈیوٹی کی وجہ سے اس وقت وہ گھر پر نہیں تھیں اور جب ان کی آمد ہوئی' مہمان ناشتے اور غسل سے فارغ

ہو کر آرام کرنے جا چکے تھے۔ آپی نے بھی شاور لینے کے بعد ناشتے اور دوپہر کے کھانے کو اکٹھا نمٹایا اور نیند پوری کرنے کی غرض سے کمرہ بند کرلیا۔ پھر کئی گھنٹوں تک بقول بینا کے آپی اور مہمانوں کے درمیان نیند کا میچ ہوتا رہا۔ آپی کی ملاقات ان سے رات کے کھانے پر ہوئی۔ ڈائننگ چیئر گھسیٹتی شبنم پھوپھو اندر داخل ہوتی لیلیٰ آپی کو دیکھ کر جہاں کی تہاں رہ گئیں۔

''یہ...... یہ گل ہے......؟ گل لیلیٰ......؟'' انہوں نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگا لیا۔ آپی اس بے ساختہ پزیرائی پہ جھینپ گئیں۔ ان کے انار سے گال مزید دہکنے لگے۔ متانت سے بیٹھے صداقت علی کی سنجیدہ اور خشک سی صورت پہ پہلی بار خوشگوار تاثرات پیدا ہوئے۔ بینا نے ٹھوکا مار کر مجھے اس طرف متوجہ کرنا چاہا حالاں کہ میں پہلے ہی نوٹ کر چکی تھی۔ میں نے آگے تک یہ رپورٹنگ پہنچانے کی غرض سے کن انکھیوں سے کشف اور رحمہ کو اشارہ کیا۔ کشف تو دیکھ کر مسکرا دی لیکن رحمہ ہونقوں کی طرح گردن گھما گھما کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بیلا کے کان میں سرگوشی کی۔

''اف یہ آپی آج لگ بھی کتنی غضب کی رہی ہیں۔''

''یہ تم جملہ اتنا توڑ مروڑ کے کیوں کہتی ہو۔ کہیں کا لفظ کہیں لگا کر ساری بات کو عجیب لہریا سا بنا دیتی ہو۔''

اس نے میری گرائمر کی غلطیاں نکالیں تو میں شکایتاً ایک ناراض سی نظر ڈال کر پھر سے لیلیٰ آپی کی طرف متوجہ ہوگئی جو سرسری سے تعارف کے بعد خود پہ پڑنے والی پراشتیاق نظروں سے بے نیاز پلیٹ میں چاول ڈال رہی تھیں۔ لیلن کا پلین بلیک سادہ سی تراش والا شلوار قمیص تھا جس کی ڈھیلی ڈھالی آستیوں اور گلے پہ میرون دھاگے کے ساتھ ہلکی سی کڑھائی تھی۔ ابھی ابھی جاگنے کی وجہ سے جلد چمک رہی تھی' بادامی آنکھوں کے غلافی پپوٹے ہلکے ہلکے سوجے ہوئے تھے' تازہ تازہ دھلا چہرہ سادگی میں بھی سب سے نمایاں تھا۔

بڑی امی کی بڑی تینوں بیٹیاں بالکل ننھیال پہ پڑی تھیں' سوائے بیلا کے۔ گل بیلا نے بوٹا سا قد' لمبی کھنچی ہوئی خوابیدہ آنکھیں دادو سے لی تھیں اور بڑے پاپا کے جیسے سیاہ گھنگھریالے بال' ددھیال کی مخصوص گندمی رنگت کے ساتھ وہ خاصی پرکشش نظر آتی لیکن باقی بہنوں سے قدرے مختلف بھی۔ گل رخ اور گل بین تو ہوبہو بڑی امی کی کاپی تھیں' لمبے تڑنگے سراپے' چوڑے چوڑے مضبوط ہاتھ پیر' سرخ وسفید رنگت' بھورے بال اور کرنجی

آنکھیں...... رخ آپی تو شادی کے اگلے سال ہی پھول پھول کر بڑی امی کے سائز کی ہوگئیں جبکہ بینا نے مسلسل ڈائٹنگ اور ایکسر سائز کے ذریعے خود کو قابو میں رکھا ہوا تھا۔

لیلیٰ آپی البتہ بڑی امی جیسی لگنے کے باوجود ویسی نہیں لگتی تھیں۔ ان کے بال بھی بھورے تھے لیکن گھنے اور لمبے بے حد تھے' آنکھوں کی کرنجی رنگت میں تیزی کم اور بادامی نرمی زیادہ تھی اور سب سے بڑھ کر نزاکت جو انہیں سب سے ممتاز کرتی تھی۔ یہ نزاکت ہی ان کا خاصا تھی جو ہر بات سے جھلکتی تھی' لمبے سروقد' جسم کے لچکیلے پن میں بھی' لمبی لمبی موی انگلیوں کی برف سی سفیدی میں بھی' مڑی ہوئی پلکوں کے اٹھنے گرنے میں بھی' مہربان سے لہجے کے شائستہ اتار چڑھاؤ میں بھی اور سج سج اٹھتے باوقار قدموں میں بھی۔

صداقت علی کی ساری بے نیازی ہوا ہوگئی تھی۔ ان کا بار بار لیلیٰ آپی کو کن انکھیوں سے دیکھنا کسی سے بھی نہ چھپ سکا' حتیٰ کہ شبنم پھوپھو سے بھی نہیں اور حیرت انگیز طور پر کچھ منٹ قبل لیلیٰ آپی پہ نثار ہوجانے والی پھوپھو کا چہرہ تن گیا اور انداز روکھا سا ہوگیا۔ بیلا نے معنی خیز نظروں سے مجھے جتایا۔ میں کندھے اچکا کے رہ گئی۔ ہم ''بکریوں'' کی تفتیشی کارروائیوں اور دانش ورانہ تجزیہ نگاری سے بالکل الگ بڑے ابو' بڑے پاپا' پاپا اور چاچو بھانجوں کی خاطر مدارت میں مصروف تھے جب کہ ہماری سادہ لوح مائیں نند کے بگڑتے مزاجوں سے ناواقف مسلسل مہمان نوازی کے فرائض نبھا رہی تھیں۔

* * *

''تم نے دیکھا سحاب' کتنا چھچھورا نکلا یہ صداقت علی ولد رفاقت علی پتہ...... پتہ نہیں کیا۔ بالکل اچھرہ بازار میں چوڑیوں کے اسٹال لگانے والے لونڈوں کی طرح منہ اٹھائے آپی کو تاڑ رہا تھا۔'' بیلا نے موقع ملتے ہی مجھ پہ دل کا غبار نکالا۔

''نہیں خیر' ایسی بات بھی نہیں۔ ہاں' دو تین بار نظر ضرور ڈالی تھی اس نے آپی پہ' سراہنے والی یا پھر شاید متاثر ہوجانے والی مگر جو مثال تم دے رہی ہو' ویسی کھا جانے والی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سالم نگل جانے والی نظر تو نہیں ڈالی انہوں نے۔''

''یہ شبنم پھوپھو کیا کررہی ہوں گی اس وقت؟''

''کرنا کیا ہے؟ امی اور آنٹیوں کے نرغے میں ہیں۔ امی بہانے بہانے سے ان سے اگلوانے کی کوشش میں ہیں کہ بیٹوں کے لیے وہ کس قسم کی بہوئیں تلاش کرنا چاہتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔''

''ہیں...... دیکھا سحاب! میں نہ کہتی تھی...... امی باز نہیں آئیں گی۔ تم چلو ذرا

میرے ساتھ۔'' وہ جوش سے اٹھی مگر میں نے ہاتھ کھینچ کر پھر سے اسے کارپٹ پہ گرالیا۔

''تم بھلا کیا کرلو گی وہاں جاکر' بڑی امی کے منہ پہ ہاتھ رکھ لو گی یا پھوپھو کے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لو گی۔''

''کچھ تو کروں گی' بہرحال امی کو یوں دوسروں کے آگے مذاق نہیں بننے دوں گی۔'' وہ نہیں رکی اور مجھے تو اس کے ساتھ جانا ہی تھا' کن سوئیاں لینے کی شوقین بینا بھی پیچھے پیچھے چل پڑی۔

''اے شبنم! لڑکوں کے ددھیال میں بھی اک نظر دوڑا لیتیں۔ چچا' تایا' پھپھوی' کسی کی لڑکی پسند نہیں آئی؟'' بڑی امی نے ٹوہ لینا چاہی۔ بیلا چپکے سے ماں سے جڑ کر بیٹھ گئی تاکہ موقع ملتے ہی کچھ فوری سدباب کرسکے۔ اپنی دھیان میں وہ غور نہ کرسکیں کہ بڑوں کی محفل میں آنے سے حد درجہ گریز رکھنے والی یہ آدم بےزار بیٹی اس وقت یہاں کیا کررہی ہے۔

''شیریں بھابی! سسرال کا کیا پوچھتی ہیں۔ برادری خاصی بڑی سہی لیکن رفاقت کے بعد آپ تو جانتی ہیں کہ ان کے پھیلے ہوئے کاروبار کی وجہ سے میں ساؤتھ افریقہ چھوڑ کر پاکستان نہ آسکی' اس لیے رشتے کے بھائی بہنوں سے اتنا میل ملاپ رہا نہیں اور نہ ہی اب نئے سرے سے قائم کرنے کی تمنا ہے اور جو سگے بہن بھائی ہیں رفاقت کے تو خیر ان سے تو خون کا رشتہ ہے میرے بچوں کا اسی لیے یہاں لے کر آتی ہوں لیکن نئے رشتے جوڑنے کا کوئی امکان نہیں۔ میرے سسرال میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے لکھانے کا رواج نہیں دونوں نندوں کی ایک ایک بیٹی تھی' سالوں پہلے بیاہ کر فارغ ہوچکیں اور رفاقت کے بڑے بھائی صاحب کے تو خیر چونگے کا ایک ہی بیٹا ہے۔''

''بس...... بس ایک ہی' بیٹی بھی کوئی نہیں؟ بڑی امی رشک وحسد کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہوکر عجیب حسرت بھرے لہجے میں پوچھ بیٹھیں۔

''ہاں ایک ہی بیٹا ہے۔ پروفیسر ہے' اس کی ماں تو خود کب سے بہو تلاشتی پھر رہی ہے میرے پاس بھی فون آیا تھا کہ وہاں ساؤتھ افریقہ میں کوئی ہو تو بتاؤں۔ اب بھلا ہوتی تو میں اتنی دور کیوں آتی۔''

''ہاں رشتے طے کرنا بھی ایک مسئلہ ہے' چاہے بیٹوں کا ہو چاہے بیٹیوں کا۔''

بڑی امی نے سرد آہ بھری۔ بیلا کو بےچینی سی محسوس ہوئی اس سے پہلے کہ بڑی امی مزید کچھ کہہ کر اس کو اور ڈسٹرب کرتیں' سیما اور حمنہ کی خوشی سے بھرپور چیخوں نے سب کو

ہلا کر رکھ دیا۔ رابعہ آنٹی کے چہرے پہ مسکراہٹ کھل گئی' شاید ماں کو فضا میں ہی اپنے لاڈلے کے آنے کی خبر مہک بن کر مل گئی تھی۔

''عطی بھیا آ گئے' عطی بھیا آ گئے۔''

''خیر سے میرا شہزادہ آ گیا۔'' بڑی امی کے چہرے پہ پھیلا ملال اور حسرت بھی آناً فاناً غائب ہوگئی' پھر کتنی ہی دیر تک سب کی توجہ کا مرکز عطا ہی رہا بمع شبنم پھوپھو کے۔ انہیں بھی اپنے میکے کا یہ اکلوتا وارث بڑا بھایا تھا۔ بڑی امی کو ایک ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ سبزیوں اور دالوں کو دیکھ کر غش کھانے والا ان کا چٹورا بھتیجا میس کے کھانے کیسے زہر مار کرتا ہوگا۔

''آئے ہائے اتنا سا منہ نکل آیا میرے چاند کا۔'' اور اتنا سا منہ سن کر میری تو ہنسی ہی چھوٹ گئی۔ بیبا بچہ بن کر بیٹھے عطا نے مجھے گھور کر دیکھا۔

''ہائے اللہ بڑی امی! ایسے تو مت کہیں' آپ کے لڈو پیڑے کے چہرے کے طول وعرض پہ کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوسکتی۔''

''ہاں تو ٹھیک ہے' جو بھی کھاتا ہوں نظر تو آتا ہے تمہاری طرح نہیں کہ منہ چوہی اور ٹیڈ کھوئی۔'' (منہ چوہے جیسا اور پیٹ کنویں جیسا)

''واہ جی واہ' ہمارے اونگے بونگے عطی کے تو بڑے پر پرزے نکل آئے رسال پور جاتے ہی۔ اب تو پٹر پٹر جواب دیے جا رہے ہیں اور وہ بھی سحاب بی بی کو جسے سامنے پاتے ہی تمہاری گھگھی بندھ جایا کرتی تھی۔'' شاداب نے خوامخواہ کی بزرگانہ شفقت دکھاتے ہوئے اس کے بکھرے بالوں پہ ہاتھ پھیر کر مزید بگاڑ پیدا کیا۔

''ہاں جی اب تو موصوف مردِ مجاہد ہیں اتنی ہمت تو پیدا ہوگئی ہوگی۔'' بیلا نے میگزین کی اوٹ سے جملہ پھینکا۔ عطا اللہ' میگزین کے سرورق پہ دھری لمبی لمبی انگلیوں اور ذرا اوپر سے جھانکتی گھنی گھنگھریالی لٹوں کو دیکھ کر مسکرا کر رہ گیا۔ ''نہیں...... ابھی اتنی ہمت نہیں ہوئی۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بہ ظاہر کیٹی کی گود میں کھلی البم کی طرف متوجہ ہوگیا۔

بعد میں رات کو لان میں واک کرتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا شبنم پھوپھو کے آنے کا مقصد وہی ہے جو میں سمجھ رہا ہوں۔''

''اب میں کیا جانوں تم کیا سمجھے بیٹھے ہو۔'' میں نے ذرا آگے ٹہلتے ہوئے صداقت اور شجاعت کے خیال سے بہت آہستہ آواز میں کہا۔

''یہی کہ وہ پتھراؤ کرنے آئی ہیں۔''

''پتھراؤ؟''

''ہاں ایک آدھ بیری ہو تو آنگن میں کنکری آتی ہے اور جہاں بیریوں کا جنگل کھڑا ہو وہاں تو پتھراؤ ہی ہوگا نا۔''

''ہاں' پہنچے تو تمہارے خیال کے گھوڑے بھی ٹھیک ہی جگہ ہیں۔''

''تمہاری یہ فضول عادت نہیں گئی۔ سیدھے سادے جملے کے الفاظ آگے پیچھے کر کے عجیب پہیلی سا کر دیتی ہو۔ بات کا مطلب سمجھنے میں ہی کتنی دیر لگ جاتی ہے۔'' وہ ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔ ''سیدھی طرح کہو کہ تمہارے خیال کے گھوڑے ٹھیک جگہ پہنچے ہیں۔''

''بات سمجھ میں آ گئی ہے نا......؟ تو پھر اتنا گرم ہونے کی کیا ضرورت ہے اور کسی کو تو اعتراض نہیں' ایک وہ بیلا ہے اور ایک تم ہو......'' میری بات کاٹ کر وہ جلدی سے بولا۔

''ذرا پھر سے کہو......ایک بیلا ہے اور ایک میں۔''

''کیا......کیا مطلب......؟'' میں کچھ بھی نہ سمجھی اور پیچھے سے سیما عطا کا بازو کھینچ کر دوسری طرف لے گئی' وہ مجھے سمجھا بھی نہیں سکا۔

٭٭٭

''سحاب! تم ٹھیک کہتی تھیں۔'' رات کو فرنی کے پیالے کو انگلیوں سے چاٹتے ہوئے بیلا نے زور زور سے سر ہلا کر رائے دی۔ آج پہلا روزہ تھا اور حسبِ روایت پہلی افطاری خاصی پُراہتمام تھی اور کچھ مہمانوں کے خیال سے اور بھی رونق تھی ڈائننگ ٹیبل پہ اتنا پیٹ بھر گیا تھا کہ سویٹ ڈش کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ اب تراویح ادا کرنے کے بعد دوبارہ چائے کا دور چلا تو میں اپنے بیلا کے اور کشف کے حصے کی فرنی اٹھا لائی۔

''تم بالکل صحیح کہہ رہی تھیں' میں فضول میں تم لوگوں کو ہدایتیں دے دے کر کھپ رہی تھی۔ واقعی پس منظر میں رکھی گئی چیز زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ صداقت صاحب بھی لٹو ہوئے تو لیلیٰ آپی پہ جنہوں نے شاید انہیں ایک نظر بھر کے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتی ہوں گی کہ پھپھو کے ساتھ آنے والے ان کے بیٹے تین ہیں یا دو' ان کے نام کیا ہیں اور اگر نام جانتی ہوں گی تو یہ پتہ نہ ہوگا کہ صداقت علی کون ہے اور شرافت علی کون۔''

''شرافت نہیں' شجاعت۔'' کشف نے تصحیح کی۔

''وہی وہی۔'' وہ بدمزا ہوئی ٹوکے جانے پر۔ ''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ان صداقت میاں نے بڑی غلط جگہ دل ٹھہرا لیا۔ لیلیٰ آپی تو وہ پتھر ہیں جنہیں اتنے سالوں سے امی اور ابو انچ برابر نہ ہلا سکے تو یہ سات سمندر پار سے آنے والے پردیسی کی بساط ہی

کیا۔''

''پہلی بات تو یہ کہ تم یہ ثابت نہیں کر سکتیں کہ صداقت علی نے واقعی دل ٹھہرا لیا ہے یا پھر صرف نظر جمائی ہے۔ میرا مطلب ہے' یہ صرف پسندیدگی بھی تو ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے ان کی والدہ انہیں لکھا پڑھا کر ہی لائی ہوں گی' اسی نیت سے وہ ہر لڑکی کو جانچتے ہوں گے۔ فی الوقت انہیں لیلیٰ آپی پسند آئی ہیں' ہو سکتا ہے ان کی طرف سے انکار ہونے پر وہ نظروں کا رخ بدل کر کہیں اور فوکس کر لیں۔ یہ بات تو طے ہے کہ لیلیٰ آپی کو انکار ہی کرنا ہے۔'' میں نے ماہرانہ تجزیہ پیش کیا۔

''ظاہر ہے وہ اپنا سالوں پرانا ریکارڈ تو نہیں توڑیں گی۔''

''اور توڑنا بھی نہیں چاہیے' کوئی تو ہو اس سسٹم سے بغاوت کرنے والا اسی لیے تو لیلیٰ آپی میرا آئیڈیل ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر ارادہ مضبوط اور نیت نیک ہو تو ''چوہدری ہاؤس'' جیسے روایتوں اور ضابطوں میں جکڑے گھر میں رہ کر بھی کوئی لڑکی اپنا آپ منوا سکتی ہے۔ اس گھر میں کوئی مسز چوہدری ہے تو کوئی ڈاٹر آف فلاں فلاں چوہدری صرف وہی ہیں جنہیں ان کے اپنے نام سے بھی دنیا جانتی اور پہچانتی ہے' ڈاکٹر گل لیلیٰ چوہدری کی نیم پلیٹ ددا' ابو اور بڑے پاپا کے ناموں سے ذرا الگ ہی سہی مگر اس کوٹھی کے باہر آویزاں تو ہے۔''

اس نے عقبی حصے میں بنے آپی کے اس کلینک کا حوالہ دیا' جہاں شام کو وہ عورتوں اور بچوں کا مفت علاج کرتی تھیں۔

''لیکن اس سارے معاملے کا شادی سے کیا تعلق؟'' کشف نے نکتہ اٹھایا۔ ''بہت سی ڈاکٹر' انجینئر' پروفیسر اور بیوروکریٹ لیڈیز میرڈ ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ شادی کسی بھی طرح کسی عورت کے کیریئر پہ اثر انداز ہو سکتی ہے۔ ہاں بس عورت میں اتنے گٹس ہونے چاہئیں کہ وہ میرڈ لائف اور پروفیشنل لائف کو بیلنس رکھ سکے۔ جو یہ نہیں کر پاتی وہ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتی ہے۔'' کشف کی رائے سے میں بھی پوری طرح متفق تھی۔

''جب ایک مرد پوری طرح اپنی بیوی پہ حاوی ہو جاتا ہے' اس کی ہر پسند ناپسند پہ اثر انداز ہو جاتا ہے تو وہ بے چاری عورت اپنی پروفیشنل لائف اور ڈریمز کو کیسے اس کے اثر سے بچا سکتی ہے۔'' وہ اپنے مؤقف پہ ڈٹی ہوئی تھی۔

''بات یہ ہے گل بیلا صاحبہ! کہ آپ کو ڈائی کیے ہوئے چھوٹے چھوٹے بالوں والی'

کالے ہونٹوں میں دبے سگریٹ کے کش لگانے والی اور چھوٹے چھوٹے بلاؤزوں کے ساتھ باریک باریک ساڑھیاں پہننے والی سوشل ورکر لیڈیز کی طرح ''بے چاری عورت' بے چاری عورت'' کہنے کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔''

''بالکل غلط......'' وہ میرے سچ کی تاب نہ لا سکی اور بپھر کر چلّا اٹھی۔ ''میں عورت کے ساتھ لگے اس دم چھلے ''بے چاری'' ہی کے تو خلاف ہوں یا تو اس کے نام کے آگے مسز لگا ہوگا اور اگر نہ ہو تو از خود بے چاری کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ ایسے میں لیلیٰ آپی کی مثال ہمارے لیے قابلِ تقلید ہے' انہوں نے نہ خود کو بے چاری کہلانے دیا نہ ہی مسز ہونے کا سہارا لیا۔ آج ان کا سوسائٹی میں مقام ہے' اپنی ایک جگہ ہے' ایک محفوظ اسٹیٹس ہے۔ گھر میں بھی انہیں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔''

''ہاں لیکن...... میرے خیال میں تو وہ بے چاری ہی ہیں اور یہ جو بڑی امی' بڑے ابو' ان کے ہر رشتے پہ انکار کو آرام سے پی جاتے ہیں اور دل ہی دل میں ان کی بڑھتی عمر اور اس سے بھی بڑھتی ہٹ دھرمی پہ فکر مند ہونے کے باوجود ان سے زبردستی کرنے سے ہچکچاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کے قابل ڈاکٹر اور سرجن ہونے سے مرعوب ہیں۔ اس کی وجہ وہ احساسِ جرم اور پشیمانی ہے جو انہیں بیٹی کو بے آباد دیکھ کر ستاتا ہے۔ انہیں اس حد تک پتھر کرنے کے ذمے دار وہ خود ہیں ورنہ...... ورنہ یہ وہی آپی ہیں ان کی آنکھوں میں بھی خواب کروٹیں بدلتے تھے' ان کے لب بھی کسی کی صدا کے جواب میں کھل اٹھتے تھے۔'' ان دونوں کی بحث نے کچھ اس طرح طول کھینچتے ہوئے مجھے اپنی لپیٹ میں لیا کہ کئی سالوں سے کسی مقدس راز کی طرح سینے میں چھپائی یہ حقیقت میں جوشِ بیاں میں عیاں کر بیٹھی اور اب وہ دونوں مجھ سے پوری تفصیل سنے بغیر تو میری جان نہیں چھوڑنے والی تھیں۔

''یہ اس وقت کی بات ہے جب آپی نے ایف ایس سی میں پوزیشن لینے کے بعد کنگ ایڈورڈ میں ایڈمیشن لیا تھا۔ ابھی وہ ایم بی بی ایس کے فرسٹ ایئر میں ہی تھیں کہ فائنل ایئر کے عمر رحمٰن سے ایک خوب صورت سے رشتے میں بندھ گئیں۔

بندہ شریف تھا اور ظاہر ہے کہ مخلص بھی اس لیے سیدھے سبھاؤ اپنے ماں باپ کو چوہدری ہاؤس رشتہ دے کر بھیج دیا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ددا کی وفات ہو جانے کے بعد دادو ان کے وضع کردہ اصولوں کے بارے میں پہلے سے بڑھ کر اٹل اور حساس ہو چکی تھیں۔ عمر رحمٰن سرائیکی بولنے والے ملتانی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ کس ذات

برادری سے تعلق رکھتا تھا لیکن دادو کے بہ قول اس ذات کے لوگوں کا قدیم پیشہ چارپائی بننا اور چھری چاقو تیز کرنا تھا۔ اب بھلے سے عمر رحمٰن کے باپ دادا زمیں دار ہوں' انہیں کیا۔ وہ تو چاقو چھری تیز کرنے والے اور گلی محلوں میں گھوم گھوم کر منجی کسوا لو کی صدائیں دینے کی شہرت رکھنے والے خاندان میں بیٹی دینے پہ تیار نہ تھیں۔''

''لیکن دادو نے ان کی سات پشتیں کیسے کھنگالیں؟'' کشف نے سوال کیا۔

''ارے یہ پرانے زمانے کے لوگ ایک ہی علم تو حاصل کرتے تھے' دوسروں کے حسب نسب اور شجرہ کا حساب کتاب یاد رکھنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔'' بیلا جل کر بولی۔

''اور پھر ضروری نہیں کہ یہ سب سچ ہی ہو۔ کچھ باتیں یوں ہی مشہور ہو جاتی ہیں لیکن لوگ ان پہ اندھا یقین کرنے لگتے ہیں۔ یہی حال دادو کا تھا وہ کہتی تھیں کہ شیخ برادری حد درجہ کنجوس ہوتی ہے' عورتوں پہ پیسہ خرچ کرنے کی روادار نہیں اس لیے وہاں بیٹی دینے کا مطلب ہے اسے فاقوں مارنا اور ایک ایک چیز کے لیے ترسانا۔'' میری بات کی تردید کشف نے فوراً کی۔

''خیر' یہ تو غلط ہے۔ میری دوست روشانے کو تو جانتی ہو گی تم! وہ بھی شیخ گھرانے سے ہے۔ اللہ کیا بتاؤں کس حد تک فضول خرچ ہے ساری فیملی۔ خود پہ تو لاکھوں خرچ کرتے ہی ہیں' صدقہ خیرات پہ بھی کروڑوں وقف کر رکھا ہے۔ پچھلے سال گئی تھی میں اس کے بھتیجوں کے عقیقے پر ایک ایک عورت کئی کئی کلو سونا لادے ہوئے تھی۔ دس تو ڈشز تھیں ڈنر میں اور ایمان سے کیا شان دار فنکشن تھا۔ اس لحاظ سے تو ہم کنجوس ہوئے۔ کسی کی برتھ ڈے پہ کبھی ایک پونڈ کا کیک تک نہیں کٹا۔''

''وہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ بات میں حقیقت ہو یا نہ ہو' اگر شہرت ہو جائے تو سب ہی یقین کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح دادو اپنے موقف پہ سختی سے قائم تھیں کہ بے شک عمر رحمٰن کی فیملی شادمان میں رہتی ہے' بے شک اس کی بہنیں کالج میں پڑھتی ہیں' بے شک اس کے والد نے زمین داری ترک کر کے ڈرروڈ پہ الیکٹرونکس کا بزنس شروع کر رکھا ہے لیکن اگر وہ ملتانی ہے تو پھر ضرور اس کے آباؤ اجداد چارپائیاں بنتے اور پیڑیاں ٹھونکتے ہوں گے اور اگر اس کی ماں سرائیکی بولتی ہے تو ضرور لڑاکا اور ہتھ چھٹ بھی ہو گی اس لیے وہاں ہرگز ہرگز اپنی پوتی نہیں دینی۔''

''کمال ہے' بیٹوں کے لیے تو ایسے سخت اصول نہیں تھے۔ بڑی بہو' افغانی' دوسری

فرانسیسی' چھوٹی والی اردو اسپیکنگ فیملی سے۔ یاد ہے نا کبھی کبھی دادو جب پنجابی بولنے کے لیے ترس جایا کرتی تھیں تو یہ کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتیں کہ قسمت نے بھی کیا بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والی بہوویں ان کے سر منڈھ دی ہیں' کسی کے مذکر مونث کی سمجھ نہیں آتی تو کسی کی فراٹے بھرتی رواں اور شستہ اردو سر سے گزر جاتی ہے۔''

''یہی تو دہرے معیار ہیں ہماری سوسائٹی کے' گھر میں آنے والیوں سے ایڈجسٹمنٹ کی توقع رکھی جاتی ہے لیکن اپنی بیٹیوں کو کسی بھی متوقع پریشانی سے بچانے کے لیے ہمارے بزرگ شدید جذباتی سوچ رکھتے ہیں۔''

''چاہے بیٹی اسے فیس کرنے پر دل و جان سے تیار ہی کیوں نہ ہو۔'' بیلا نے گفتگو کا رخ پھر سے آپی کی طرف موڑا۔ ''ویسے یار دادو کو پتہ چل گیا تھا کہ آپی کی پسند بھی اس میں شامل ہے؟''

''ہاں اور اصل مصیبت ہی تب شروع ہوئی۔ عمر رحمٰن کی والدہ کو صاف انکار ہونے کے بعد آپی نے ہی رخے آپی کے ذریعے بڑی امی تک بات پہنچائی۔ دادو کو علم ہوا تو جیسے طوفان آ گیا۔ اسی دن وہ خاتون دوبارہ رشتہ لیے چلی آئیں اور اس دن دادو نے غیض و غضب میں گھر آئے مہمان کا لحاظ تک نہ کیا۔'' میں نے بتایا تو کشف چپ نہ رہ سکی۔

''ایک بات تو بتاؤ' تمہیں اتنی تفصیلات کا علم کیسے ہے؟ اگر تمہاری جگہ بینا یہ سب بیان کر رہی ہوتی تو بات ہضم بھی ہوتی ہے اسے شروع ہی سے کن سوئیاں لینے کی عادت ہے۔ تم نے اتنے ڈھکے چھپے معاملے کی تفصیلات کہاں سے چرائیں۔ ہم نے تو اتنے سالوں سے کبھی ہلکا سا تذکرہ بھی نہیں سنا۔''

''بس اتفاق کی بات ہے۔ یاد ہے جب تم' کیٹی اور عطا آنٹی کے ساتھ پیرس گئے تھے اپنے گرینڈ پا سے ملنے اور بیلا' بینا دونوں اپنے ماموں کے پاس ڈیرہ اسمٰعیل خان گئی ہوئی تھیں۔ گرمیوں کی طویل لمبی دوپہریں تھیں اور تعطیلات میں اکیلے رہنے کی بوریت میں اکثر رخے آپی کے کمرے میں گھس جاتی اور ان کے ڈائجسٹ چاٹا کرتی' وہ اندر آتیں تو جلدی سے سوتی بن جاتی کیوں کہ انہیں بچیوں کا افسانے ناول پڑھنا پسند نہیں تھا ایسی ہی ایک دوپہر میں دیوار کی طرف کروٹ لیے ایک رومانٹک سا افسانہ پڑھ رہی تھی کہ دروازے پہ آہٹ ہونے پر جلدی سے رسالے والا ہاتھ نیچے کر کے پلنگ کے نیچے چھپا لیا اور آنکھیں میچ لیں۔ رخے آپی' روتی ہوئی لیلیٰ آپی کو گھسیٹ کر اندر لا رہی تھیں۔ کھلے

دروازے سے زور زور سے بولتی دادو کی غضب ناک آوازیں آئیں۔ کسی نے زور سے دروازہ بند کیا تو یہ شور تھما۔

"پاگل ہوئی ہو لیلیٰ! اس وقت دادو کے آگے کھڑا ہونا آپ اپنی شامت بلوانے کے مترادف ہے۔" رخے آپی کی آواز آئی۔ جواب میں آپی کی سسکیوں بھری فریاد۔

"لیکن رخے! ذرا دیکھو تو دادو کیا کچھ کہہ رہی ہیں عمر کی امی کو۔ اتنے تذلیل بھرے القابات اور اتنی بے عزتی...... اف...... کوئی انہیں روکتا کیوں نہیں۔"

"کون روک سکتا ہے؟ امی وہ بے چاری تو خود لپیٹ میں آئی ہوئی ہیں' صبح سے متواتر انہیں بیٹیاں پیدا کرنے اور پھر ان کی غلط تربیت کرنے کے طعنے مل رہے ہیں۔ رہے ابو تو ویسے تھے نہیں جیسے دادا کی وفات کے بعد دادو نے انہیں بنا دیا ہے یہ کہہ کہہ کر کہ اب دادا کے بعد وہی چوہدری ہاؤس کی روایتوں اور رواجوں کے امین ہیں۔ وہ بیٹی کی محبت میں ماں سے نافرمانی کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ ہاں بڑے پاپا یا چاچو ہوتے تو شاید کچھ بات بنتی۔"

"بے شک انکار کر دیں' لیکن مجھ پہ' عمر پہ اور ہمارے مخلص سے معصوم جذبے پہ اتنے گھناؤنے الزام تو نہ لگائیں۔ اس شریف عورت کی سات نسلوں کے پرخچے تو نہ اڑائیں جو ایک بار صاف انکار کے باوجود صرف بیٹے کی خوشی کو مدنظر رکھتے ہوئے دوبارہ یہاں ذلیل ہونے چلی آئی ہے۔"

"فکر مت کرو' وہ جا چکی ہیں' دادو تو یونہی اب کئی گھنٹے بولتی رہیں گی۔ کاش رابعہ آنٹی ہوتیں یا پھر بڑے پاپا تو اتنی بدمزگی پیدا نہ ہوتی۔ بات سلیقے سے بھی تو ختم کی جا سکتی تھی۔ خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔"

"بہت برا ہوا ہے' بہت برا...... اتنا برا کہ تم میں سے کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔ معاملے کی سنگینی کا اندازہ امی' ابو اور دادو کو رفتہ رفتہ ہوگا۔ ان لوگوں نے مجھ سے میری خوشی مانگ لی ہوتی تو میں ماں باپ کی مرضی پہ خود کو قربان کر دیتی۔ خوشی خوشی اپنی آنکھوں کے پہلے خواب کو توڑ دیتی لیکن جس بے دردی سے اس خواب کو نوچا گیا جس گندے طریقے سے میری محبت کو بدنام کیا گیا ہے اور جس ظالمانہ طریقے سے ایک شریف انسان کی بے عزتی کی گئی ہے جس طرح میری ماں کی تربیت کو گالیاں دی گئی ہیں اور میری تعلیم پہ چار حرف بھیجے گئے ہیں' وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔"

"بھول جاؤ لیلیٰ! یہی بہتر ہے تم اور کر بھی کیا سکتی ہو۔"

"کرنے کو تو بہت کچھ کر سکتی ہوں اور کچھ نہیں تو دادو کے بے بنیاد گندے الزامات کو سچ بھی ثابت کر کے دکھا سکتی ہوں لیکن میں ایسا کروں گی نہیں۔ نہ تو ان کے کہنے سے میری ماں کی تربیت کے رنگ ہلکے پڑ سکتے ہیں اور نہ ہی عمر رحمٰن کوئی ایسا نیچ انسان ہے جو بے عزتی کے بدلے بے عزتی کرے۔ میں کچھ نہیں کروں گی صرف ابو اور امی کو زندگی میں کبھی نہ کبھی یہ تسلیم کرنے پہ مجبور کروں گی کہ وہ غلط ہیں' انہوں نے میرے ساتھ غلط کیا۔ میں اور کچھ نہیں تو انہیں یہ احساس ضرور دلاؤں گی کہ خاندان اور بزرگوں سے عقیدت اپنی جگہ لیکن ان کی اولاد کا بھی ان کی زندگیوں پہ کوئی نہ کوئی حق ضرور ہوتا ہے۔ اولاد کے دل کا خون کر کے ماں کے قدموں میں رکھنے کا شرف حاصل کرنا' جنت کا شارٹ کٹ رستہ نہیں ہے۔"

میں نے سالوں پہلے اپنے دل و دماغ میں نقش ہونے والے گل لیلیٰ آپی کے پرعزم جملے من و عن دہرا دیے۔ اپنی کم عمری کے باوجود ان کے دل کی تمام حسرتیں میں نے شدت سے محسوس کی تھی۔ اس وقت میں جس کیفیت سے گزری' اس وقت کشف اور بیلا بھی اسی احساس کے زیر اثر تھیں لیکن بیلا شاید کچھ اور بھی سوچ رہی تھی۔ شاید اسے اپنے آئیڈیل کے ٹوٹنے کا ملال تھا۔

* * *

"اتنے سال ہو گئے برخوردار تمہیں شیو نہ کرنا آئی۔" چاچو کی آواز پہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے اترتا عطا ڈھیلا پڑ گیا۔

"وہ...... چاچو...... یہ تو بس......" وہ زخموں سے چور چور چہرہ سہلا کر رہ گیا۔

"صداقت اور شجاعت کو لاہور تو گھما پھرا لاؤ۔ یوں تو میں بھی فارغ ہوں لیکن تمہاری کمپنی میں یہ دونوں زیادہ اچھا فیل کریں گے۔"

"چلیں چاچو! آپ نے یہ تسلیم تو کیا کہ آپ بزرگ ہو چکے ہیں۔"

"ایسی بات بھی نہیں' اب کیا کیا جا سکتا ہے جو قسمت نے تم جیسے جوان جہان لڑکوں کا ماما' چاچا بنا دیا ہے۔ میں اسی لیے تو تم لوگوں کے ساتھ باہر نکلنے سے پرہیز کرتا ہوں' میری اچھی بھلی پرسنالٹی کا امیج خراب کر دیتے ہو' چاچو' چاچو کہہ کر اور اب یہ ماموں کہنے والوں کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔" وہ شگفتگی سے کہہ کر صداقت اور شجاعت کو عطاء اللہ کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے نکلنے کی تاکید کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"چلو یار! اسی بہانے ہم بھی عرصے بعد لاہور کو ذرا تفصیلی دیکھ لیں۔"

"تمہیں تو لاہور بہت یاد آتا ہوگا' وہاں جا کر...... کیا نام ہے اس جگہ کا سنا ہے چھوٹا سا قصبہ نما شہر ہے۔"

"ہاں مگر بہت خوب صورت اور پرفضا اور وہاں میری روٹین اتنی ٹف ہے کہ کسی کو یاد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاں کچھ یادیں بڑی ڈھیٹ ہوتی ہیں' آپ کرو نہ کرو وہ خود ہی ہر وقت سر پہ سوار رہتی ہیں۔"

"واٹ؟" شجاعت اتنی جلدی عطا کی بے ربط گفتگو کا عادی کیسے ہوسکتا تھا۔

"میرا مطلب ہے وہاں رہ کر تو زیادہ احساس نہیں ہوتا لیکن دو چھٹیاں بھی گھر گزار لوں تو اگلا سارا دن رسال پور میں بڑا بے مزہ گزرتا ہے۔ ہواؤں میں نسوار کی بو رچی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہر چیز سلوموشن میں حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ لاہور سے بچ کر رہنا یہ بڑی جلدی اپنا عادی بنا لیتا ہے۔" اس نے وارننگ دی اور پھر اچانک میری طرف مڑا۔ میں قریب ہی ڈائننگ ٹیبل کی صفائی کر رہی تھی۔

"تمہیں کیا روزہ بہت لگ رہا ہے۔ بڑی چپ چاپ ہو۔"

"ویسے ہی...... بس نیند آ رہی ہے۔" میں نے ٹالا۔

"آپ لوگ سحری پہ اتنا اہتمام کرتے ہیں' ضرور کئی گھنٹے پہلے جاگ کر تیاری شروع کرتی ہوں گی۔ پلیز آپ اتنا تکلف مت کیجیے' بہت شرمندگی ہوتی ہے آپ کو بے آرام دیکھ کر۔" صداقت علی جو خاموشی سے سی این این پہ نیوز دیکھ رہے تھے' سنجیدگی سے کہنے لگے۔

"جی ہاں بھائی! ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ یقین کیجیے ہم وہاں بریڈ' جیم اور چیز کے ساتھ کھا کر بھی روزہ رکھ لیتے ہیں۔"

"لیکن یہ پاکستان ہے میرے بھائی! یہاں عید تو عید' سحری بھی منائی جاتی ہے۔ افطاری کو بھی سیلیبریٹ کیا جاتا ہے۔" عطا نے کہا۔

"جی...... یہ بالکل درست ہے ہم لوگ واقعی روزوں کو اہتمام سے رکھتے ہیں نہ کہ سر سے بوجھ کی طرح اتارتے ہیں اور مہمان نوازی میں جو لطف ہے اس سے تو آپ ہمیں محروم کرنے کی بالکل بھی کوشش مت کیجیے گا۔"

فضیلہ آنٹی نے اندر آتے ہوئے کہا اور میری مشکل آسان کی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گفتگو کا رخ کیسے موڑوں میری ڈسٹربنس کی وجہ لیلیٰ آپی تھیں۔ صبح معمول کے مطابق ان سے سامنا ہوا۔ ان کا راز یوں افشا کر دینے پہ میں دل ہی دل میں ان سے

شرمندہ تھی اور نظر نہیں ملا پا رہی تھی حالاں کہ وہ تو یہ بھی نہ جانتی تھیں کہ ان کے ماضی کے اس راز سے ہم چھوٹوں میں بھی کوئی واقف ہے' پھر بھی اندر ہی اندر میں خاصی شرمندگی محسوس کر رہی تھی کہ یونہی بات سے بات نکلنے میں میں کیا کچھ کھول گئی۔

کچھ ہی دیر بعد میری توجہ بٹ گئی اور اس کی وجہ گھر میں ہونے والی وہ میٹنگ تھی جس میں تقریباً تمام ہی بڑے شریک تھے۔ جیسے ہی عطا' ان دونوں کو لے کر آؤٹنگ پہ نکلا' آپی ہاسپٹل سدھاریں' کیٹی' سیما اور حمنہ اسکول اور کالج شاداب اور کشف دونوں ایگزامز کی تیاری گھر بیٹھ کر کر رہی تھیں جب کہ میں نے اور بیلا نے شوقیہ چھٹی ماری تھی صرف رحمہ تھی جو کلاسز لینے گئی تھی۔ ایسے میں تجسس کی ماری بینا نے آ کر ہماری سونے کی تیاری پہ پانی پھیر دیا۔

"پتا ہے کیا ہوا؟" اس نے کہا اور پھر یہ جانتے ہوئے کہ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں پوچھے گا کہ "کیا ہوا؟" خود ہی بول پڑی۔

"شبنم پھوپھو نے صداقت علی کے لیے گل لیلیٰ آپی کا ہاتھ مانگا ہے۔"

"وہ تو صاف لگ رہا تھا' کل یا پرسوں ایسا تو ہونا ہی تھا۔" میں نے جمائی روکی۔

"لیکن ابو اور امی دونوں نے فوراً انکار کر دیا۔"

"وہ بھی ہونا ہی تھا' ایسا تو کب سے ہوتا آ رہا ہے' نہ جانے یہ لیلیٰ آپی ایسا کر کے کسے سزا دے رہی ہیں' خود کو یا......"

"ایک منٹ...... ایک منٹ۔" کچھ خیال آنے پہ میں بیلا کی بات کاٹتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ "یہ فوراً انکار میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس سے پہلے ہر قابل ذکر رشتے پر بڑے ابو اور بڑی امی' آپی کو قائل کرنے اور منانے کی ایک کوشش ضرور کرتے تھے' چاہے ناکام ہی ہوں۔ پھر آخر شبنم پھوپھو کے رشتے میں ایسی کیا قابل اعتراض بات ہے جو فوراً انکار ہوگیا۔"

"یہی...... تو...... اب بھلا پوچھو کیوں؟" وہ ہم سب کا منہ تکنے لگی جب کہ دل ہی دل میں وجہ جاننے کے لیے بے تاب ہوتے ہوئے بھی ہم نے پوچھنے سے پرہیز کیا۔ اس سے زیادہ انتظار نہ ہوا خود ہی بتانے لگی۔

"دراصل پھوپھو کا انداز بہت عجیب سا تھا۔ زبان سے تو نہیں کہہ رہی تھیں کہ ان کی مرضی نہیں ہے لیکن بار بار جتا ضرور رہی تھیں کہ یہ صداقت کا اپنا فیصلہ ہے اور یہ کہ گل لیلیٰ اپنی بچی ہے اور انہیں بے حد عزیز بھی' پھر کیا ہوا اگر صداقت سے تین چار سال بڑی

ہے تو...... وغیرہ وغیرہ یعنی انہیں آپی اور اپنے بیٹے کے درمیان موجود عمر کے فرق پہ اعتراض ہے جو چار سال کا ہرگز نہیں محض ڈیڑھ دو سال کا ہے جسے وہ خواہ مخواہ لمبا کھینچ رہی تھیں۔ ابو نے ان کی بے دلی بھانپتے ہوئے صاف انکار کر دیا اور انکار کے بعد جوان کے چہرے پہ اطمینان آیا اس سے صاف ظاہر ہو گیا وہ صرف بیٹے کے کہنے پہ مجبور ہوئی تھیں۔''

''چلو خس کم جہاں پاک۔'' بیلا نے ہاتھ جھاڑے اور پھر سے تکیے پہ سر رکھ لیا۔

''اب تو ابو اور چاچو کو اپنی بہن کی اصلیت کا پتہ چل گیا۔''

''ابھی کہاں۔'' بینا نے بھنویں اچکائیں۔ ''ابو اور بڑے پاپا کے خیال میں پھوپھو ٹھیک ہی سوچ رہی تھیں' عمر کا ذرا سا فرق بھی کچھ عرصے بعد خاصا نمایاں ہونے لگتا ہے۔ کسی نے اس بات کو ذرا بھی مائنڈ نہیں کیا اسی لیے تو پھوپھو کی ہمت اتنی بڑھی کہ...... انہوں نے فوراً ہی...... بھلا بتاؤ...... انہوں نے کیا کیا؟'' اس نے تجسس کی لہر دوڑانے کی ناکام سی کوشش کی۔

''ہم کیا بتائیں' پردے کے پیچھے تم چھپی کھڑی تھیں نہ کہ ہم۔'' بیلا نے چڑ کر کہا۔

''چل...... چل کب میں پردے کے پیچھے چھپی تھی میں تو لان میں کھلنے والی کھڑکی کے پیچھے...... اچھا اب پوچھو بھی کہ کیا ہوا؟''

''اگر ہم نہ پوچھیں گے تو کیا آپ نہیں بتائیں گی بینا ڈیئر!'' شاداب نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ہار مان کے وہ بتانے لگی۔

''شبنم پھپھو نے انکار کے بعد صداقت کا رشتہ ایک اور بھیجی کے لیے ڈال دیا ہے۔'' اب کے اس نے واقعی کھلبلی مچا دی۔ شاداب' کشف دونوں سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

''تو گویا انہوں نے باز ہرگز نہیں آنا۔ چوہدری ہاؤس ہی سے کچھ نہ کچھ لے کر جانا ہے۔'' بیلا تلملا کر بولی۔

''تو یہ تو ان کی محبت ہے کہ اتنے بڑے کاروبار' جائداد اور لائق فائق بیٹوں کے ہوتے ہوئے وہ بھائیوں کا بوجھ ہلکا کر رہی ہیں' انہیں ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا ہے لیکن انہوں نے اپنوں کو ترجیح دی۔'' بینا خاصی متاثر تھی۔

''تم تو سدا خود ترسی کا شکار رہی ہو۔'' اسے چھوٹی بہن کی طرف سے طعنہ ملا۔

''ہونہہ...... اب تو تم سب پوچھو گی بھی تو میں ہرگز نہیں بتاؤں گی کہ اب شبنم پھوپھو نے کس کا نام لیا ہے۔ ہاتھ پیر جوڑو گی تو تب سوچا جائے گا۔'' وہ اٹھ گئی۔

''ارے جاؤ منہ دھو رکھو' ہاتھ پیر جوڑیں گے ہم؟'' شاداب نے پیچھے سے آواز

لگائی۔ ''ایسے ہی ترسے بیٹھے ہیں نا نام جاننے کے لیے۔''

''اور اگر جاننا ہی ہوگا تو پردے کے پیچھے چھپنا' کھڑکی کی اوٹ سے سننا ہمیں بھی آتا ہے لیکن ہم اپنی یہ صلاحیتیں صرف وقت پڑنے پہ استعمال کرتے ہیں۔'' میں نے بھی نعرہ لگایا اور اسی وقت سے شاداب نے میری ڈیوٹی لگا دی گھر میں ہونے والی تمام تر تازہ ترین کارروائیوں کی رپورٹ لانے کی۔

اور سوئے اتفاق کہ جب سے میں نے بزرگانہ میٹنگز کی خیر خبر رکھنا شروع کی تب سے ہی یکے بعد دیگرے گھر میں اتنی تیزی سے نت نئے واقعات رونما ہونے لگے کہ میں خود حیران رہ گئی' روز ایک نئی خبر اور انکشاف لیے میں ان چاروں کے روبرو ہوتی۔

اگلے دن میں نے بڑی امی کو فیصلہ آنٹی کے ساتھ سر جوڑے فکر مندی سے کچھ مشورہ کرتے دیکھا تو ٹہلتے ہوئے نامحسوس طریقے سے ان کے پیچھے لگے فش ایکوریم کے پاس چلی گئی اور اس میں فش فوڈ ڈالتے ہوئے کان ان کی سمت لگا لیے۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ اب صداقت علی صاحب کی سنجیدگی کی بھینٹ کس کو چڑھایا جا رہا ہے لیکن اس وقت موضوع گفتگو ہی اور تھا۔ بڑی امی' رخے آپی کی ان کی سسرال سے ناچاقی کے تذکرے بیان کر رہی تھیں۔

''وہ تو شکر ہے صفدر' ماں بہنوں کی الٹی سیدھی پٹیوں میں نہیں آتا ورنہ رخے بتاتی ہے' ان کا تو بس نہیں چلتا بیٹے کو بیوی کے پاس ایک منٹ نہ بیٹھنے دیں۔''

''نہ جانے کچھ عورتیں اتنی تسلط پسند کیوں ہوتی ہیں۔ ساری عمر وہ یہ حقیقت تسلیم کرنے سے گھبراتی ہیں کہ ان کا بیٹا کسی کا شوہر ہونے کے ناتے کچھ اور فرائض بھی رکھتا ہے۔'' آنٹی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''لیکن رخے نے یہ تو بتایا ہوگا کہ اس مسئلے کا حل کیا نکلا؟''

''میں نے بتایا تو ہے کہ صفدر سمجھدار لڑکا ہے۔ گھر میں ہونے والی روز روز کی تلخیوں سے تنگ آ کر اس نے الگ ہونے کا فیصلہ کیا ہے بلکہ رخے بتا رہی تھی کہ صفدر کا ارادہ پاکستان سیٹل ہونے کا ہے۔''

''پھر تو ٹھیک ہے۔ آپ کیوں اتنی فکر مند ہیں؟''

''ارے فکر کیسے نہ کروں' اگر رخے کو سسرال میں رہ کر سب اچھی بری سہنے کا مشورہ دوں تو یہ اس کے ساتھ ظلم ہوگا۔ پردیس میں ویسے ہی لڑکی اکیلی ہو جاتی ہے' اوپر سے ایسی فتنہ ساس نندیں...... اور اگر اس کا الگ گھر بسانے کا سوچتی ہوں تو گل بین کی فکر لگ

جاتی ہے' اس کا رشتہ بھی تو اسی گھر میں طے ہے۔ ماں بیٹے کے رشتے کا کیا ہے' بیٹا الگ گھر بسا بھی لے تو ماں ناراضی کے باوجود اس سے تعلق تو نہیں توڑے گی لیکن بہو سے ساری عمر دل صاف نہیں رکھے گی' خواہ مخواہ کا بیر باندھ لے گی۔ سب سے پہلے تو یہ رشتہ ٹوٹے گا۔"

"یہ تو صاف ظاہر ہے۔" فضیلہ آنٹی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "لیکن بھابھی! ایک لحاظ سے بینا کے لیے اچھا ہی ہے۔ جب رخے جیسی سمجھ دار اور معاملہ فہم لڑکی ایسی سسرال کو ہینڈل نہ کر سکی تو بینا تو پھر نا سمجھ ہے اور مزاجاً تیز بھی۔ اس کا گزارہ بھی مشکل سے ہی ہوگا اور یہ ضروری تو نہیں کہ صفدر کی طرح محمود بھی انصاف پسند شوہر ثابت ہو۔ ہوسکتا ہے اس میں اللہ کی کوئی مصلحت ہو۔"

"ہاں...... بس اللہ کی مرضی کہہ کر دل کو تسلی دے لیتی ہوں۔ تمہارے بھائی صاحب بھی بالکل وہی کہتے ہیں جو تم کہہ رہی ہو لیکن یہ بھی تو دیکھو' رشتہ ملنا کتنا مشکل ہے' ٹوٹنا تو آسان ہے۔ لیلیٰ ہے تو ماں باپ سے ضد باندھے' اس کا غم کم نہیں کہ اب گل بین کی طرف سے جو اطمینان تھا وہ بھی غارت ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ لوگوں کی بیٹیاں خاندان میں ہی کھپ جاتی ہیں۔ ہمارے تو دیکھو لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ اماں جی صحیح کہتی تھیں بکریوں کا ریوڑ ہے اس گھر میں۔ دو سال منگنی رہی سارے شہر کو پتہ ہے۔ بات ختم ہو جانے کے بعد رشتہ ملنا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ مسئلہ ہی مسئلہ ہے۔ مرد یہ نزاکتیں کیا جانیں' تمہارے بھائی صاحب نے تو کہہ دیا ہے کہ وہ گل بین کی طرف سے فکر مند نہ ہوں اور بغیر کسی ذہنی دباؤ کے وہ فیصلہ کرے جس سے وہ اور اس کا میاں راضی ہوں۔ اب بتاؤ بھلا' صفدر کی ماں سے یہ توقع کیسے رکھی جا سکتی ہے کہ وہ کوئی لحاظ' مروت قائم رکھے۔ یہ رشتہ تو اب ختم ہی سمجھو۔"

بڑی امی افسوس سے ہاتھ مل رہی تھیں۔ وہ پچھلے دو سال سے بینا کی طرف سے جتنی بے فکر تھیں اب ان کی فکروں میں ایک تازہ ترین فکر کا اضافہ مجھے اداس کر گیا۔ ان کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ مسئلہ واقعی سنگین تھا خصوصاً ان کے لیے اس بات کا احساس شاید آنٹی کو بھی تھا اس لیے بجائے کوئی صلاح دینے کے وہ ان کے ہاتھ ہمدردی سے سہلانے لگیں۔

میں رشتہ بندھنے والی خوش نصیب کا نام جاننے کی امید لیے یہ جاسوسی کرتی پھر رہی تھی اور ہاتھ آئی تو رشتہ ٹوٹنے کی خبر...... مایوس قدموں کے ساتھ پلٹ کر میں اوپر

جانے کو تھی کہ اپنے پیچھے کھڑی بینا کو دیکھ کر جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اس کا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔ لبوں کی کپکپاہٹ اور آنکھوں کی جھلملاہٹ اتنی واضح تھی کہ اسے اپنا آپ چھپانے کے لیے الٹے قدموں لوٹنا پڑا۔ میں دکھ سے اس سادہ سی لڑکی کے ڈولتے قدموں کی تھکن محسوس کرنے لگی۔

"کیا بینا محمود سے محبت کرنے لگی تھی؟" سارا واقعہ سن کر رحمہ نے سوال کیا۔

"اس کی دگرگوں حالت سے لگ تو ایسا ہی رہا تھا۔" میں نے قیاس ظاہر کیا۔

"ایسا لگ رہا تھا...... یہ کہتے ہیں' ہمیشہ لفظ آگے پیچھے کر دیتی ہو۔" بیلا اس موقع پر بھی میرے جملے کی تصحیح کرنے سے باز نہ آئی۔

"توبہ...... ایک تم اور ایک وہ عطا......" اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ یہی جملہ ایک دو دن پہلے میں نے عطا سے بھی کہا تھا اور اس نے نہ جانے جواب میں ایسا کیا کہا تھا کہ ذہن الجھ سا گیا تھا۔

آخر کیا کہا تھا اس نے...... اور کیوں کہا تھا...... اچھا کیوں کو چھوڑو' یہ بعد کی بات ہے پہلے اتنا تو یاد آ جائے...... اس نے کہا کیا تھا اور کہنے کے بعد اچانک چپ سا ہو کر فرار کیوں ہو گیا تھا۔

میں یاد کرنے لگی۔ اصل میں اس کا اچانک بات ادھوری چھوڑ کر سیما کے ساتھ بیڈ منٹن کھیلنے چلا جانا ہی مجھے الجھا گیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا وہ بے اختیاری میں کچھ کہہ دینے کے بعد چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی اس حرکت نے میرے ذہن سے وہ بات بھی نکال دی اور اب بیلا کے یاد دلانے پہ میں پھر ذہن پر زور دینے لگی۔

"محبت وحبت اس بے وقوف لڑکی کو کیا ہونی ہے' اسے صرف یہ دکھ ہے کہ اب وہ منگنی شدہ نہیں رہے گی۔" شاداب نے نتیجہ نکالا۔

"کسی حد تک تم ٹھیک ہو۔" بیلا نے تائید کی۔ "وہ اس معاملے کو ویسے ہی لے رہی ہے جیسے امی...... اسے بھی بات ٹوٹنے کی بدنامی' زمانے کے سوالوں کا ڈر اور مستقبل میں اچھا رشتہ نہ ملنے کا خوف لاحق ہے...... اور کوئی بات نہیں۔ محبت کیا خاک کرے گی وہ نیک پروین۔ اسے میں سمجھا لوں گی۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے' اگر ابھی محمود سے اچھا کوئی دوسرا پرپوزل اس کا آ جائے تو ابھی گل بین چوہدری جو کل سے کمرہ بند کیے تکیے میں منہ دے کر سسک رہی ہے پورے گھر میں اچھل کود کر گاتی پھرے گی۔"

سیونی میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آ گیا

مینوں ہیر بناون آ گیا

''ہا...... ہا......'' رحمہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے پھر سے نوٹس بنانے کے لیے قلم اٹھا لیا۔ ''لو میں تو سمجھی تھی کہ چوہدری ہاؤس میں رونما ہونے والی کسی محبت بھری واردات کا تذکرہ ہوگا لیکن نہیں جی...... ایک بینا سے امید تھی کہ وہ کہیں دل لگا کر عاشقوں کی فہرست میں نام لکھوائے گی' وہ بھی نہیں رہی...... اور کسی سے تو یہ توقع رکھنا ہی فضول ہے۔ چوہدری ہاؤس کی بچیاں صرف تعلیمی میدان میں جھنڈے گاڑ سکتی ہیں لیلیٰ آپی کی طرح...... یہ عشق و عاشقی کسی کے بس کی بات نہیں۔''

میں کشف اور بیلا ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں اس روز میں ان دونوں کو آپی کے بارے میں بتا تو بیٹھی بعد میں اتنا پچھتائی کہ قسمیں دے دے کر انہیں اس راز کی پاسداری کرنے کا واسطہ دیا اسی لیے شاداب' بینا اور رحمہ ابھی تک ناواقف تھیں کہ چوہدری ہاؤس کی سب سے بڑی ''بچی'' نہ صرف تعلیمی میدان میں اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑ چکی ہے بلکہ محبت کی چوٹ کھانے کے بعد اس کی ٹیسوں کو کسی تمغہ کی طرح دل پہ سجائے بھی پھرتی ہے۔

* * *

''میں تو کہتی ہوں بینا! شکر ادا کرو کہ اس مودے ٹیم پیس سے تمہاری جان خود بہ خود چھوٹ رہی ہے۔ ایمان سے کسی طرح بھی تمہارے لائق نہیں لگتا تھا۔ کینیڈا کا رہنے والا تو لگتا ہی نہ تھا' خانیوال جنکشن کا سینئر قلی نظر آتا تھا۔''

بیلا نے غمگین بیٹھی بہن کو دلاسہ دینے کی نیت سے بے چارے مودے کی مٹی پلید کی لیکن اس پہ کوئی اثر نہ ہوا۔

''رخے آپی کا حوصلہ ہے جو ایسی جلاد ساس کو برداشت کرتی رہیں پھر ان کی صحت بھی تو ماشاء اللہ ہے' دبا لیتی ہوں گی۔ تم ایک تو ویسے ہی نازک سے دل والی اوپر سے ڈیڑھ پسلی کی...... تمہیں تو اس کینیڈین ساس نے چٹکی میں مسل دینا تھا۔''

اس نے بینا کے اچھے خاصے بھرے بھرے وجود کو کمالِ ڈھٹائی سے ڈیڑھ پسلی کا کہا کیوں کہ وہ ہمیشہ خود کو دھان پان سا کہلوانے پہ مصر رہتی تھی۔

''لیکن یہ تو سوچو اب میرا بنے گا کیا؟''

''تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ تمہارا کیا بننے جا رہا تھا' چٹنی' مربہ...... ہتھیلی پر نہیں بٹھا

کے لے جائیں گے وہ تمہیں۔ نہ ہی پلکوں پہ سجائیں گے اگر کسی نہ کسی طرح ابو امی نے رخے کے سسرال والوں کی منتیں ترلے کر کے انہیں رشتہ توڑنے سے باز رکھ بھی لیا تو پھر تم ایسا کیوں چاہتی ہو۔ کیا فائدہ ماں باپ کا سر بھی ان خبیثوں کے آگے جھکے گا' تمہارا قدم بھی ہلکا پڑے گا اور اس سب کے باوجود کوئی اچھی امید بھی نہیں مستقبل کے بارے میں۔ یہ رشتہ ختم ہونے کی صورت میں کم از کم مستقبل کے حوالے سے کوئی امید تو رکھی جا سکتی ہے۔''

اس نے پھر سے سمجھانے کی کوشش کی۔ پتہ نہیں بینا سمجھی یا نہیں لیکن چپ ضرور ہو گئی اور فی الوقت اتنا بھی بہت تھا۔

* * *

وہ دن تو بینا کے معاملے میں الجھتے ہی گزر گیا۔ کوئی کام کی بات نہ پتہ چل سکی۔ صداقت علی کی متوقع ''متاثرہ'' کے بارے میں اگلے دن سب مجھے پھر سے اکسا رہی تھیں کہ میں اور کچھ سن گن لے کر آؤں۔

''اس سے تو بہتر ہے کہ بینا کے آگے ہی ہاتھ پیر جوڑ کر اگلوا لو۔'' میں سخت دور ہو گئی تھی دو ہی دن کی جاسوسی سے۔

''نہیں بالکل نہیں۔ آج کل اس کا سامنا کرنا بہت خطرناک ہے پہلے تو ڈھائی گھنٹے اس کے دکھڑے سننا پڑیں گے۔'' شاداب نے صاف انکار کر دیا۔

''ویسے بھی جان کر کرنا کیا ہے۔ میرا خیال ہے شاداب یا سحاب میں سے کوئی ہو گی۔ ان ہی کا نمبر آتا ہے' کشف بھی ہو سکتی ہے۔'' رحمہ نے اطلاع دی۔

''اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں اصل نام ہی تو جاننا ہے تاکہ کوئی فوری سدباب کیا جا سکے۔'' بیلا نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا ''اور ایک تم ہو سحاب' ایک کام کہا ہے اور تم سے وہ بھی ڈھنگ سے نہ ہو سکا۔''

''مجھ سے پنگا مت لو...... میں یوں بھی سخت بے زار ہوں۔ اتنے عرصے بعد عطا اتنے زیادہ دن رہنے آیا اور چاچو نے اسے صداقت' شجاعت کا گائیڈ بنا کر رکھ دیا۔ ذرا مزا نہیں آ رہا ہے اس کے بغیر۔''

کشف اور رحمہ نے بھی تائید کی تو بیلا کا منہ بن گیا۔

''اونہہ' تم لوگوں نے نہ جانے کیوں اس پیڑے کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے۔ ایک تو ہمارے گھر کا ماحول ویسے بھی مردوں کی شانِ بے نیازی اور اکڑفوں کو چار چاند لگانے

میں خاصا معاون و مددگار ہے اوپر سے تمہاری وارننگیاں مزید سازگار ثابت ہو رہی ہیں۔"

"کیا تم سلیس اردو میں اپنا بیان دہراؤ گی......" کشف نے بے چاری سی بن کر کہا۔

"مختصر یہ کہ اگر اسی طرح تم نے بے جا اہمیت دے دے کر عطاء اللہ کا دماغ خراب کر دیا تو تم سب کا تو کچھ نہیں بگڑے گا' اپنے اپنے گھروں میں عیش کر رہی ہو گی' سر پکڑ کر تو وہ روئے گی جسے چوہدری ہاؤس کی اکلوتی بہو ہونے کا اعزاز حاصل ہو گا۔"

"بات سنو' یہ تم نے ہم سب کو تو اپنے اپنے گھروں میں عیش کرنے کی نوید سنا دی' اپنا پروگرام واضح کیوں نہیں کیا؟ کیا تمہارا ارادہ ساری عمر بڑی امی کے سینے پہ مونگ دلنے کا ہے۔" میں نے کریدا۔

"یہی سمجھ لو۔"

"خدا کا واسطہ ہے بیلا! اس کام کے لیے آپی ہیں نا۔" کشف نے ہاتھ جوڑے۔

"ویسے آج تو عطا ان "ہیکل اینڈ جیکل" کو لے کر کہیں نہیں گیا۔ بڑے والے صاحب زادے تو پاپا کے ساتھ فیکٹری وزٹ کرنے گئے ہیں اور چھوٹے والے اسنوکر روم میں سیما اور کیٹی کے ساتھ گیم کھیل رہے ہیں۔ عطا موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پرانے فرینڈز سے ملنے گیا ہے۔"

"کیا کہا تم نے' چھوٹیاں اس زکوٹے شجاعت کے ساتھ ہیں۔" میں فوراً الرٹ ہو گئی۔ "حد ہوتی ہے لاپروائی کی بھی۔ شاداب تم تو سمجھ دار ہو' تم نے انہیں اس کے ساتھ اکیلا کیوں چھوڑا اور بیلا تم......تم ویسے تو بڑی لیڈر بنی پھرتی ہو بچیوں کی' اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی تھیں کہ ان کے ساتھ زیادہ فری ہونے اور گھلنے ملنے کی ضرورت نہیں۔"

"کیا ہو گیا ہے سحاب بچیاں ہیں اور شجاعت...... ہماری اپنی فیملی کا ہے۔ کزن ہے......ایسی بھی کیا تنگ نظری......" کشف نے برا سا منہ بنایا۔

"بچیاں؟ کیٹی فرسٹ ایئر میں ہے' حمنہ میٹرک میں......تم جب میٹرک میں تھیں اور سویٹ سکسٹین میں تو سچ سچ بتانا...... بچی تھیں؟" میں نے چبھتا ہوا سوال کیا جسے سن کر کشف سٹپٹا گئی اور پھر ہولے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مائی ڈیئر! یہی ایج تو خطرناک ہوتی ہے۔ ہر چمکتی چیز سونا محسوس ہوتی ہے۔ اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ ایسی ٹین ایجر لڑکیوں کو یہ فارن ریٹرن لڑکے بڑی جلدی الو بنا لیتے ہیں۔ رہی بات ان کے کزن ہونے یا اپنا ہونے کی تو رحمہ بی بی! آزاد اور بے

باک فضاؤں میں پلنے والے رشتوں کی اس نزاکت اور پاکیزگی کو کیا جانیں۔ چلو اٹھو' آؤ میرے ساتھ' انہیں لے کر آتے ہیں اور سختی سے منع کرتے ہیں کہ آئندہ ان کے ساتھ اکیلے میں اٹھنے بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کشف کا ہاتھ پکڑا اور بیسمنٹ میں بنے اسنوکر روم کی طرف چل پڑی۔

گولائی میں مڑتی سیڑھیوں کے درمیان رک کر میں نے انگلی لبوں پہ رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کان نیچے سے آتی آوازوں پہ لگا دیے۔ کائنات کی قل قل کرتی کمسن ہنسی کے ساتھ شجاعت کے بلند آہنگ قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔ میں نے دانت کچکچاتے ہوئے تصور میں ہی کیٹی کے کان کھینچے۔

"تم بہت بے وقوف ہو کائنات!" اس نے وہ کمنٹ دیا جو وہ بچپن سے سنتی چلی آ رہی تھی اور ہر بار سننے کے بعد منہ پھلا لیتی تھی۔

"اف تجی بھیا بھی یہی کہتے ہیں۔"

"تو اور کیا کہوں' تم باتیں ہی اتنی مزے کی کرتی ہو۔ یہ تو بتاؤ تمہاری اتنی چالاک چالاک فرینڈز کے ساتھ کیسے نبھ جاتی ہے۔ تم تو اتنی بھولی بھالی سی ہو اور جو قصے تم سنا رہی ہو اسے سن کر اندازہ ہوتا ہے تمہارے گروپ کی لڑکیاں خاصی تیز ہیں۔ کتنی آسانی سے ٹیچرز کو فول بنا لیتی ہیں۔"

"ٹیچرز کو تو کیا' وہ اپنے پیرنٹس کو بھی چیٹ کر لیتی ہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ وہ نمرہ ہے نا' اس کے دو دو بوائے فرینڈز ہیں۔ سارا دن فون پہ' نیٹ پر ان سے فلرٹ کرتی رہتی ہے اور اس کے ماما پاپا کو ذرا خبر نہیں ہوتی۔" اس کی اطلاع پہ مسلسل ہنستے شجاعت کے قہقہوں کو بریک لگ گئی۔ میں نے بھی کشف کے کان میں گھستے ہوئے جتایا۔

"دیکھا موصوف کی چالاکی' باتوں باتوں میں اس احمق کو کس موضوع پہ لے آیا۔ بتاؤ کیا عطا سے باتیں کرتے ہوئے وہ یہ راز اگل سکتی تھی۔ یہ فرق ہوتا ہے بھائی ہونے میں اور بھائی جیسا ہونے میں۔" وہ بھی سنجیدگی سے سر ہلانے لگی۔

"تمہاری فرینڈز کے اس قسم کے مشاغل بھی ہیں؟" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا۔

"سب کے تو نہیں' نمرہ اور ویرونیکا کو چسکہ ہے آئے دن فرینڈز بدلنے کا۔ نمرہ تو خیر فون اور نیٹ چیٹنگ تک محدود رہتی ہے لیکن ویرونیکا تو اکثر ان کے ساتھ گھومنے پھرنے بھی چلی جاتی ہے۔ اس کی فیملی بھی زیادہ کنزرویٹو نہیں' شاید اس لیے۔"

''اور تمہاری فیملی؟''

''میری......؟ اف توبہ۔'' اس نے جھرجھری لی۔ ''ہمارے گھر میں سب کے سامنے تو کیا' چھپ کر بھی ایسا کوئی کام کرنا مشکل ہے۔ آپی' رخے آپی' بجیا' اپیا سب کالج' یونیورسٹی جاتی رہیں لیکن مجال ہے کہ گھر کے اصولوں کے خلاف ذرا سا بھی قدم اٹھاتیں۔ میری ممی کا تو آپ کو پتہ ہے' فارنر ہیں لیکن بڑی امی جیسی ہی سخت ہیں بیٹیوں کے معاملے میں نمرہ کی مما کو پرواہی نہیں ہوتی' چاہے وہ گھنٹوں فون سے چپکی رہے۔''

''جب تمہارے اوران کے گھروں کے ماحول میں اور تمہاری اوران کی عادتوں میں اتنا فرق ہے تو پھر اس دوستی کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔''

''جی؟ کیا مطلب شجی بھیا؟''

''بیٹا! اگر تم سچ مچ مجھے بھیا سمجھتی ہو تو پھر میرا ایک مشورہ مانو۔ پہلی فرصت میں اپنی کمپنی چینج کرو۔ تمہارے جیسی پیاری سی معصوم سی اچھے اچھے خیالوں والی بچی کے ساتھ ایسی دلچسپیاں رکھنے والی فرینڈز سوٹ نہیں کرتیں۔ کیا تمہیں پہلے کسی نے نہیں سمجھایا۔''

''میں نے کبھی کسی کو بتایا ہی نہیں ان کے بارے میں۔ مجھے بھی ڈر تھا کہ سب سے ڈانٹ پڑے گی آپ بھیا کے ساتھ ساتھ میرے دوست بھی بنے تو آپ کو بتا دیا لیکن آپ نے بھی یہی بات کی۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''اس لیے کہ دوست وہی اچھا ہوتا ہے جو غلط کاموں کی نشاندہی کرے اور درست راستے پر قدم اٹھانے کی ترغیب دے اور میں تو صرف دوست ہی نہیں' بھیا بھی ہوں تمہارا پھر کیسے نہ تمہیں ٹوکتا۔''

''لیکن بھیا! نمرہ اور ویرونیکا دونوں بہت اچھی لڑکیاں ہیں۔ وہ جو کچھ کرتی ہیں مجھے اس سے کیا؟ کوئی مجھے تھوڑا ساتھ چلنے کو کہتی ہیں۔'' اس نے فرینڈز کی وکالت کی۔

''آج نہیں کہتیں لیکن جیسے تم ابھی ان کی غلط روش کو غلط سمجھنے پہ تیار نہیں' اسی طرح رفتہ رفتہ تمہیں اس کھیل میں کشش محسوس ہونے لگے گی پھر تمہیں ان کا اپنی فیملی کو چیٹ کرنا بھی برا نہیں لگے گا۔ برائی بہت جلدی اٹریکٹ کرتی ہے میری گڑیا۔'' اس کے لہجے میں اتنی شفقت اور فکر مندی تھی کہ میں اپنے کچھ دیر پہلے والے خیالات پہ نادم ہوگئی۔

''بھیا آپ.... آپ تو فارن سے آئے ہیں۔ پھر بھی..... پھر بھی۔'' وہ شاید اپنے کزن کو بہت روشن خیال سمجھ بیٹھی تھی۔

''ہاں...... وہاں یہ سب بہت عام ہے اور برا بھی نہیں سمجھا جاتا لیکن روزگار

کے سلسلے میں کسی پرائی مٹی پہ جابسنا اور بات ہے اور پرائی ریتوں کو گلے سے لگا لینا دوسری بات ہے۔ میری کوئی سگی بہن نہیں لیکن اگر ہوتی تو میں اسے ایسے ہی گائیڈ کرتا جیسے تمہیں کررہا ہوں۔ ایک مادر پدر آزاد معاشرے میں رہنے والے مسلمان شخص سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی شناخت بھی کھو دے گا۔ ہاں ایسا ہوتا ہے کہیں کہیں...... اور پاکستان میں بھی میں نے کئی ایک حد سے زیادہ آزاد خیال فیملیز دیکھی ہیں لیکن میری امی کی تربیت یہ نہیں تھی انہوں نے ہمیں ہماری روایات سے کٹنے نہیں دیا۔ یہاں اس گھر میں آ کر سب کچھ بہت اپنا اپنا سا لگا ویسا ہی جیسا امی بتاتی تھیں ایسے میں کوئی بھی ایسی بات ڈسٹرب کر دیتی ہے جو اس اجنبی دیار کی یاد دلا دے۔''

''سوری بھیا! میں نے انجانے میں آپ کو ڈسٹرب کیا۔''

''اونو...... ایسی بات نہیں میں بس ذرا فکر مند ہوگیا تھا۔ تم اتنی انوسینٹ ہو نا اس لیے۔ پرامس کرو کہ آئندہ فرینڈز بنانے میں محتاط رہوگی۔''

''پرامس بھیا......!''

اور میں کشف کے ساتھ الٹے قدموں اوپر لوٹ گئی۔

''یار!...... شجی...... میرا مطلب ہے شجاعت تو بڑا ٹھیک ٹھاک بندہ نکلا۔'' کشف مجھ سے زیادہ متاثر تھی۔

''ہوں۔'' میں خجالت کی وجہ سے کھل کر تسلیم بھی نہ کرسکی۔

''برا مت ماننا' تم بیلا اور شاداب کی صحبت میں رہ رہ کر خود بھی خاصی شکی مزاج اور انتہا پسندانہ سوچ رکھنے لگی ہو۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن کیا کروں شاداب' میری بہن ہے تو بیلا میری دوست' کچھ اثر تو آنا ہی ہے۔''

''تو اچھے اثر لو ناں میری جان! تم نے شاداب کی منفی نقطہ نظر رکھنے والی سوچ اپنا لی۔ اس کی تعلیم کے بارے میں سنجیدگی سے متاثر نہیں ہوئی۔ تم سے آگے سیماب نکل رہی ہے۔ اسی طرح بیلا کی جذباتیت تم میں دن بدن پروان چڑھ رہی ہے لیکن اس کے جیسی پھرتی اور دوسروں کے کام بڑھ بڑھ کر کرنے کی عادت تمہیں چھو کر نہیں گزری۔''

''اچھا اب تم میرے بخیے ادھیڑنا بند کرو۔ ایسا بھی کیا کرلیا میں نے ذرا وہ تمہاری شجی میاں کی شان میں گستاخی کیا ہوگئی کہ......''

''اے اے آرام سے...... تمہارا ہوگا وہ شجی میاں۔'' کشف نے میرے زور

کی دھپ لگائی' ہم دونوں لڑتی جھگڑتی اندر داخل ہوئیں تو کمرے کا سنجیدہ ماحول معنی خیز تھا۔

''کیا ہوا...... ؟ بیلا کہاں گئی اسے بڑی امی نے اپنے کمرے میں بلایا ہے رحمہ نے اطلاع دی؟''

''اور وہاں آنٹی فضیلہ اور آنٹی رابعہ پہلے سے موجود ہیں۔'' شاداب نے اضافہ کیا۔میرے کان کھڑے ہوگئے۔

''ہیں...... تو کیا...... کہیں وہ متوقع لڑکی بیلا ہی تو نہیں۔؟''

''شاید۔'' کورس میں جواب ملا۔ میں نے بینا کے بتائے راستے پہ چلتے ہوئے لان کی راہ لی جہاں نچلے پورشن کے تقریباً ہر کمرے کی کھڑکی کھلتی تھی۔

''کیا...... گل لیلیٰ آپی کے بعد انہون نے میرا نام لیا اور آپ نے چپ چاپ سن لیا......؟'' بیلا اندر چلا رہی تھی۔ ''منہ توڑ جواب کیوں نہ دیا۔؟''

''آئے ہائے کیسا منہ توڑ جواب۔ انہوں نے رشتہ ڈالا ہے کوئی اینٹ تو نہیں دے ماری جو میں جواباً پتھر اٹھا کر مارتی۔'' بڑی امی بگڑ کر بولیں۔

''اچھا اور وہ جو انھوں نے آپی اور اپنے سپوت کے بارے میں کہا تھا کہ عمر کا دو سال کا فرق بھی خاصا نمایاں ہونے لگتا ہے تو اب اس کے اور میری عمر کے درمیان موجود آٹھ نو سال کا فرق نظر نہیں آیا۔ سن لیجیے میں نہیں کرنے والی اس عینک والے جن سے شادی۔''

میں نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔ یہ دلیری صرف گل بیلا چوہدری کا ہی خاصا تھی۔

''اے لو وہ بڑے کا نہیں چھوٹے کا رشتہ ڈال رہی ہے تیرے لیے۔'' بڑی امی کی اطلاع پہ وہ نئے سرے سے بھڑک اٹھی۔

''وہ قباچہ....... جس کی باچھیں ہر وقت چری رہتی ہیں' ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار...... بلکہ ڈنٹونک کا ٹریڈ مارک۔''

''بری بات بیٹا! یوں نہیں کہتے کوئی ڈھنگ کا اعتراض ہو تو کہو' فضول میں کیڑے مت نکالو۔'' رابعہ آنٹی نے ٹوکا جبکہ فضیلہ آنٹی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

''ڈھنگ کا اعتراض...... ہاں وہ...... مجھے آگے پڑھنا ہے۔''

''اچھی بات ہے' شبنم آپا کی خود بھی خواہش ہے اور شجاعت بھی پڑھی لکھی بیوی چاہتا ہے آرام سے وہاں جتنا دل چاہے پڑھتی رہنا۔'' آنٹی نے تسلی دی۔

''لل...... لیکن میں یہاں پڑھنا چاہتی ہوں...... میں نہیں جانے والی ساؤتھ افریقہ۔'' وہ ڈھٹائی سے کندھے بدلتی۔

''تیرا تو باپ بھی جائے گا۔'' بڑی امی کا افغانی خون جوش مارنے لگا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے انہیں بھیج دیجیے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''اور تیرا چار ڈالوں' بت بنا کر راہداری میں نصب کروالوں۔''

''جو دل چاہے کیجیے مگر میں یہاں سے ہلنے والی نہیں۔ سب سن لیجیے میں ہرگز ہرگز جیتے جی چوہدری ہاؤس سے نہیں نکلوں گی۔''

''تجھے تو میں بتاتی ہوں۔'' اور اس سے پہلے کہ بڑی امی ٹھیٹھ فارسی گالیوں پہ اترتے ہوئے اس کی باقاعدہ مرمت شروع کرتیں' رابعہ آنٹی نے دخل دیا۔

''شیریں بھابی! پلیز آج اس بات کو رہنے دیں۔ پھر کسی وقت میں خود آرام سے گل بیلا کو سمجھاؤں گی۔ یہ کوئی طریقہ نہیں جوان بیٹیوں سے بات کرنے کا۔''

''اور اس کا طریقہ دیکھ رہی ہو تم رابعہ! کیسے زبان چلا رہی ہے ماں کے آگے۔ ارے ان کرتوتوں کے ساتھ تو میں ویسے بھی ایک منٹ گھر میں برداشت نہ کروں اور یہ ساری عمر یہاں رہنے کی دھمکی دے رہی ہے۔''

ان کا ارادہ اب دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر رونے کا تھا۔ بیلا کسی جذباتی لمحے کی زد میں آکر کمزور پڑنے کے خوف سے وہاں سے کھسک لی۔

''او گاڈ' آج تو بہت تھک گیا ہوں۔ یار بہت واک کرنا پڑی۔ آج ایسی ایمی قدیم پرپیچ گلیاں گھما کے لایا ہوں ان کو جہاں گاڑی تو کیا' سائیکل کا جانا بھی دشوار تھا۔'' عطا نے صوفے پہ ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ شجاعت کا بھی یہی حال تھا جب کہ صداقت دعا سلام کے بعد اپنا کیمرا سنبھالتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''کھانا لگواؤں۔'' فضیلہ آنٹی' جو ان تینوں کے انتظار میں بیٹھی تھیں' انہوں نے جلدی سے اپنا آخری کام نمٹانے کا سوچا۔

''نہیں بالکل گنجائش نہیں۔'' وہ پیٹ پہ ہاتھ پھیرنے لگا پھر کچھ خیال آنے پر شجاعت کو دیکھ کر بولا۔

''شجی سے پوچھ لیجیے۔''

"نہیں آنٹی! افطاری میں ہی اتنا کچھ لے لیا۔ اس کے بعد پھر زبردستی عطا نے دوبارہ ٹھنسا دیا۔ اب تو سحری تک کی جگہ مشکل سے نکلے گی ہاں البتہ قہوہ چلے گا۔"

"اور میرے لیے چائے۔"

"ابھی بناتی ہوں۔"

"ارے آپ کیوں؟ یہ بکریاں ہیں نا۔" اور میں جو اس کے کہنے سے پہلے ہی فضیلہ آنٹی کو اشارہ کرتے ہوئے اٹھ رہی تھی' دھپ سے بیٹھ گئی یہ جملہ سنتے ہی۔ شاداب نے بھی اس کے کان کھینچے۔ وہ ڈیڑھ سال کی بڑائی کا فائدہ اکثر یونہی اٹھایا کرتی۔

"عطی بھیا! کیا آج آپ لوگ پرانے پرانے محلوں میں گئے تھے؟" کائنات اور سیماب نے روزی کی طرح تفتیش کا آغاز کر دیا۔

"ہاں اندرون شہر بھی...... اور اس کے علاوہ چند تاریخی مقامات بھی دیکھے۔ آج پہلے تو چوبرجی گئے' پھر ان دونوں کو شالامار باغ گھما کے لایا۔ واہ واہ کیا حسن تھا...... کیا نظارے تھے۔"

اس کے عش عش کرنے پہ شجی کھی کھی کھی کھی کرنے لگا تو میں سمجھ گئی کہ یہ کس قسم کے نظاروں کی بات ہو رہی ہے۔

"پراندے والے نظارے؟" میں نے کریدا۔

"آں...... آہم...... ہاں ہاں ویسی...... رانی' بانو' پینو' چھینو' شاداں' زلیخاں...... ایک سے ایک حسینہ کدکڑے لگاتی پھر رہی تھی...... کلکی کلیر دی...... پگ میرے ویری دی۔ اور یار شجی! وہ کون سا گیت تھا جو پینگ (جھولا) جھولتے ہوئے وہ گوٹے والا سوٹ پہنے لڑکی گنگنا رہی تھی......؟"

"گنگنا نہیں رہی تھی' چلا رہی تھی۔" شجاعت نے تصحیح کی۔

"ہاں یار واقعی ایسا لگ رہا تھا جیسے گانا نہیں گا رہی' چھ کا پہاڑہ یاد کر رہی ہے زور لگا لگا کر...... خصوصاً جب جھولا آگے کی طرف اوپر کو لے جاتی تو خوب لمبا کھینچ کر "دل لے جانئی جئی ہاں کر کے۔" الاپتی اور پھر نیچے کو آتے ہوئے "گورے رنگ تے دو پٹیاں دی چھاں کر کے" مکمل کرتی۔"

"نری گپ۔" کشف نے ماننے سے انکار کر دیا۔ "ہم لوگ گئے تو تھے ایک بار' بٹنوں والے فٹنگ برقعوں میں پھر رہی تھیں ساری لڑکیاں' نقاب کے اندر ہاتھ ڈال ڈال کر قلفی چوس رہی تھیں اور گول گپے بھی نقاب کے اندر ہی کہیں غائب ہو جاتے تھے۔ تمہیں

یہ الھڑ مٹیاریں کہاں سے ٹکرا گئیں۔"

"بس خدا جب دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ گورنمنٹ گرلز کالج مانگا منڈی سے بس بھر کے پکنک منانے آئی تھی۔"

"روزوں میں؟" میں ابھی بھی مشکوک تھی۔

"ہاں تو کیا ہم روزوں میں نہیں سیر کرتے پھر رہے۔ پتہ ہے پھر اس کے بعد ہم میلے گئے۔ وہاں قریب ہی لگا تھا جہاں میلہ چراغاں لگتا ہے۔ ڈھول کی تھاپ پہ بھنگڑا ڈالتے ہوئے صداقت سے مووی بھی بنوائی۔ اڑن کھٹولے پہ بھی بیٹھے اور یہ اڑن کھٹولا جوائے لینڈ والا سیف اینڈ ساؤنڈ قسم کا نہیں تھا' چاروں طرف سے جالی کی دیواروں اور چھت والا بلکہ اوپن ایئر تھا۔ اتنے میں افطاری کا وقت ہو گیا۔ ستو کے شربت' بیسن کے قتلے اور گلگلوں کے ساتھ روزہ کھولا۔ بھاٹی' موچی اور لکشمی سارے گیٹ دکھاتا پھرا انہیں پھجے کے پائے کا ڈنر کراتا گھر لا رہا ہوں۔"

"ہاں وہاں جانا بھی تو بہت ضروری تھا آخر اتنے اچھے ڈنر کے بعد ورائٹی پروگرام بھی تو دکھانا ہو گا۔" بیلا نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اس کی ٹانگ کھینچی۔

"نہیں بھئی' ہمارا کلچر یہاں تک تھا' وہ میں نے دکھا دیا' یوں بھی چاچو نے مہمانوں کو کلچر دکھانے کا کہا تھا "کیچڑ" دکھانے کا نہیں۔" اس نے بڑے پتے کی بات کی۔ شجاعت اپنی والدہ محترمہ کی قدم بوسی کے لیے اندر کی طرف لپکا تو بیلا نے پھر سے شرم دلائی۔

"دیکھو' یہ حال ہے ان باہر سے آنے والوں کا اور ایک یہ اپنا لوکل لاڈلا ہے جسے اتنی توفیق نہیں کہ اپنی رنگ رلیوں کی داستان سنانے کے بجائے اندر جا کر اپنی مما کو اپنا تھوبڑا دکھا آئے' سلام کر آئے۔ وہ بے چاری ڈھنگ سے افطاری بھی نہ کر پائیں کہ نہ جانے ان کا لاڈلا کیا زہر مار کر رہا ہو گا حالاں کہ سب نے یقین دلایا کہ ان کے لاڈلے کی جیبیں بھاری رقموں سے لٹکی رہتی ہیں اور ہر شہر کے ہر چھوٹے بڑے ڈھابے پہ اس کا کھاتہ کھلا رہتا ہے۔"

"مجھے تمہارے اس اشتعال انگیز بیان میں صرف ایک بات پہ اعتراض ہے اور وہ یہ کہ تم نے میری بے ضرری' شریفانہ سی اور کسی حد تک پینڈوانہ سی سرگرمیوں کو رنگ رلیاں کس نقطۂ نظر سے قرار دیا ہے۔ کیا تمہیں رنگ رلیاں منانے کا مطلب پتا ہے؟" آخری جملہ اس نے ذرا جھک کر شرارت سے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ وہ تڑپ

کراٹھی۔

''مجھے تو صرف یہ پتا ہے کہ تم رنگ رلیاں' عیاشیاں' من مانیاں' سرکشیاں سب کچھ کرنا افورڈ کر سکتے ہو کیونکہ تم چوہدری ہاؤس کی بے زبان بے ضرر بکری نہیں بلکہ سانڈ ہو۔'' اس نے بڑی امی کی طرف سے ڈالے جانے والے دباؤ اور جواب میں اپنی بے بس ناراضی کا سارا ڈپریشن اس پر انڈیلا۔

''ہیں...... ہیں؟ سانڈ اور میں......؟''

وہ اس کے لال بھبوکا چہرے کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ بے چارے کی سمجھ سے باہر تھا کہ آج شالامار میں سیر کرنے' میلے میں بھنگڑا ڈال کر ستو کا شربت پینے اور شاہی محلے کے پچھواڑے سے پائے کھانے سے وہ سانڈ کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے اور یہ کہ آخر اس سے ایسا کیا قصور سرزد ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں اس کی یہ کزن یوں ہتھے سے اکھڑ گئی ہے جو پہلے بھی خاصی اکھڑی رہتی تھی' اس کی تمام تر دوستانہ اور مخلصانہ کاوشوں کے باوجود ہم سب بیلا کی سنجیدگی کے باوجود ہنس پڑیں۔

''حد ادب لڑکی! تم جانتی ہو تم کس سے مخاطب ہو؟'' اس نے جھوٹ موٹ آنکھیں نکالیں۔ وہ بیلا کی فرسٹریشن سے بے خبر اسے اس کا ہلکا پھلکا مذاق اور چھیڑ چھاڑ ہی سمجھ رہا تھا۔

''ہاں ہاں' پتا ہے۔ کیا ہو تم؟ کیا ہے تم میں؟ کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟ مجھے تو کوے کا پر بھی نظر نہیں آتا۔ صرف یہی ایک خوبی ہے تم میں کہ تم ایک مرد ہو۔ اس بات کا زعم ہے تو میں اسے خوبی ماننے سے انکاری ہوں۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ تم کوئی زمانے بھر کے اکیلے مرد ہو۔ کروڑوں' اربوں' کھربوں مرد رل رہے ہیں دنیا میں ہاں تمہیں ضرور ایک خاص اسٹیٹس حاصل ہے وہ اس لیے کہ چوہدری ہاؤس میں پیدا ہو کر ضرور تم نمبر بنا گئے ہو' لیکن سوچو تو اس میں بھی تمہارا کوئی کمال نہیں۔ تمہاری یہ اہمیت بھی ہم بکریوں کی مرہونِ منت ہے' اگر جو تم سے پہلے شاداب' رخے آپی اور لیلیٰ آپی کے بجائے امان اللہ' مہر اللہ اور شاد اللہ پیدا ہو گئے ہوتے تو تمہاری پیدائش پہ ددا تین دن داتا دربار پر دیگیں نہ چڑھواتے اور دادو شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے بعد یتیم خانے میں کپڑے نہ بھجواتیں اور جو عطا اللہ چوہدری کے بعد بینا' بیلا' کیٹی' سیما' رحمہ اور حمنہ کے بجائے بلو' پپو' ٹیپو لائن بنا کر آ جاتے تو تمہاری کیا ویلیو ہوتی' تمہیں کون پوچھتا۔''

''بس بھی کرو' یہ سانڈ کیا تمہاری مج (بھینس) بھگا لے گیا ہے جو بے چارے کے

پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔''

وہ بے چارہ تو چپ چاپ اس کے غضب ناک چہرے کو تک رہا تھا۔ میں نے ہی ترس کھا کر دخل دیا۔ دوسری طرف قہوے کی خوشبو آتے ہی شجاعت کمرے سے برآمد ہوا تو بیلا ڈبڈبائی آنکھیں چراتے ہوئے وہاں سے نکل گئی۔ عطا پرسوچ انداز میں اس کی جانب تکتا رہا۔ شجاعت ٹی وی پر اپنا مووی کیمرہ سیٹ کرتے ہوئے کائنات اور حمنہ کو آج دیکھی گئی تاریخی عمارتوں کی ویڈیو دکھانے لگا۔ عطا نے چپکے سے مجھ سے پوچھا۔

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے ایک نظر شاداب کو دیکھا' پھر اسے بتانے لگی۔

''اڑتی اڑتی سنی ہے کہ شبنم پھوپھو نے بڑے بیٹے کے دل کی صورتِ حال واضح نہ ہو سکنے کی صورت میں فی الحال چھوٹے کا بندوبست کرنے کا سوچتے ہوئے بیلا کا نام لے لیا ہے۔''

وہ یوں بدک کر اچھلا جیسے سانپ نے ڈنک مار دیا ہو۔ اڑے اڑے چہرے کے ساتھ پہلے مجھے' پھر کائنات سے خوش گپیاں لگاتے شجاعت کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اتنے عجیب سے تھے کہ میں نے شاداب کو ٹہوکا دیا لیکن وہ صوفے پر ہی دراز ہو کر اونگھنے میں مشغول ہو گئی تھی۔ دوبارہ سے اس کی طرف توجہ دی تو وہ آنکھیں موندے چہرے پہ ایک بازو موڑ کر رکھتے ہوئے صوفے کی بیک سے سر ٹکا کر بیٹھا تھا۔

''اور...... اور بیلا کیا کہتی ہے؟'' چہرہ تو چھپ ہی چکا تھا' آواز بھی خاصی سپاٹ سی تھی۔

''کہنا کیا ہے' تم تو جانتے ہو وہ پھوپھو کے آنے سے پہلے ہی ان سے خار کھائے بیٹھی تھی' اسے یوں گھر آ کر لائن میں لڑکیاں کھڑی کر کے چھانٹی کرنے کا طریقۂ کار کچھ پسند نہیں آیا بلکہ اسے تو سرے سے یہ فضولیات پسند ہی نہیں۔ یہی منگنی بیاہ وغیرہ اس کے نزدیک تو یہ فضولیات ہی ہیں۔ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ گئی ہے کہ ہرگز اس ڈنٹونک کے ٹریڈ مارک سے شادی نہیں کرے گی لیکن بڑے ابو اور بڑی امی سمیت باقی بڑے بھی تقریباً راضی ہیں اس رشتے پر بڑی امی یوں بھی لیلیٰ آپی کے مسلسل انکار اور اب بینا کی منگنی کے ڈانواں ڈول ہونے سے پریشان تھیں' ان کے لیے تو یہ رشتہ نعمت ہے۔ رابعہ آنٹی' فضیلہ آنٹی سمیت بڑے پاپا اور پاپا کسی کو بھی اعتراض نہیں۔'' میں نے آہستہ آواز میں اسے ساری رپورٹ دی۔

''میں نے پوچھا...... بیلا کیا کہتی ہے؟'' اس بار اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش

تھی۔

''اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کوئی کچھ بھی کرلے' وہ چوہدری ہاؤس سے نکلنے والی نہیں۔ مرتے مرجائے گی مگر اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔''

میں نے اس کے الفاظ دہرا دیے۔ عطا ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ غیر معمولی طور پر ہشاش بشاش تھا۔ بیلا کے کچھ دیر پہلے کے تپتے جملوں کا تھکا تھکا اثر اس کے چہرے سے غائب تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ لبوں کے گوشوں اور آنکھوں کی پتلیوں پر تھرک رہی تھی۔

* * *

پورے گھر میں صبح سے ہی ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص پرجوش سا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔

بڑی امی کے ہاتھ پیر مارے خوشی اور بوکھلاہٹ کے پھولے جا رہے تھے۔ ان کا گول گول سفید چکنا چہرہ سچ مچ قندھار کے انار کی طرح لال لال تھا۔ بڑے ابو آج گھر سے نکلنے پر تیار ہی نہ تھے۔ پاپا انہیں مشکل سے ساتھ لے جانے پہ کامیاب ہوئے کہ آج ایک ضروری میٹنگ تھی اور ان کا وہاں ہونا لازمی تھا جب کہ بڑے ابو کے خیال میں آج ان کا گھر پہ ہونا زیادہ ضروری ہے کیونکہ گھر پہ ہونے والی میٹنگ زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ تب بڑی امی نے بتایا کہ اس میٹنگ کے شروع ہونے میں ابھی کئی گھنٹے ہیں اور آپ تو عصر تک آ ہی جائیں گے۔

البتہ چھٹیاں کرنے کے شوقین حبیب اللہ چاچو خوب جوش وخروش کے ساتھ تمام خواتین کی مدد کر رہے تھے۔ مارکیٹ سے پھل اور گوشت لانے میں بھی اور ڈرائنگ روم کی از سر نو آرائش کے سلسلے میں رائے دینے میں بھی۔ رابعہ آنٹی نے کیک بیک کرنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ فضیلہ آنٹی کے ذمے بریانی اور نرگسی کوفتے تھے۔ افغانی تکے اور چپلی کباب بنانا تو ہمیشہ سے ہی بڑی امی کی ڈیوٹی تھی۔ افطاری کے لوازمات کی ذمہ داری بینا' بیلا' شاداب نے ہنسی خوشی بانٹ لی تھی اور میں نے سویٹ ڈش کا ٹھیکا لے رکھا تھا بقول عطا کے اور جس کے لیے یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں وہ ہستی گھر پہ موجود نہ تھی۔

حالانکہ میں نے اور کشف نے لیلیٰ آپی کو لاکھ روکنے کی کوشش کی کہ کم از کم آج تو گھر پہ رک جائیں کیونکہ ایک بار گھر سے نکلنے کے بعد وہ وعدہ کرنے کے باوجود بھی جلدی گھر نہیں آئیں۔ نہ انہیں ہاسپٹل سے ہاف ڈے لینے کی عادت تھی نہ ہی شام کو فری کلینک پہ

بیٹھنے کا ناغہ کرنا پسند تھا۔

ناپسند تو انہیں اور بھی بہت کچھ تھا' اپنے ارادوں سے پیچھے ہٹنا' اپنے کہے الفاظ واپس لینا اور اپنی قسم توڑنا' لیکن بھلا ہو ڈاکٹر عمر رحمٰن کا جنہوں نے دو سال تک لگا تار اس پتھر پہ قسمت آزمائی کرتے ہوئے بالآخر موم کر ہی دیا۔ دو سال پہلے ہی وہ اس ہاسپٹل میں اپائنٹ ہوئے جہاں آپی کام کرتی تھیں۔ سالوں کی دوری بھی دو دلوں کے درمیان محبت کو ختم نہ کر پائی تھی اس کا اندازہ دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل آتے ہی ہو گیا۔ لیلیٰ آپی' دل کو کچلنے' مسلنے کی پریکٹس کرتے کرتے اتنی ماہر ہو چکی تھیں کہ انہیں ذرا دیر نہ لگی پھر سے خود کو سنبھالنے میں ڈاکٹر انہوں نے ڈاکٹر عمر رحمٰن سے مناسب فاصلہ اور بے گانگی اختیار رکھنا شروع کر دی جبکہ ڈاکٹر صاحب جلد ہی ہار مان گئے اور پھر سے تجدید محبت کا راگ الاپنا شروع ہو گئے۔ لیلیٰ آپی کی راہ میں رکاوٹ صرف وہ قسم ہی نہ تھی جو انہوں نے کئی سال پہلے کھائی تھی کہ عمر بھر بے آباد رہ کر وہ اپنے بزرگوں کو ان کی اس غلطی کا احساس دلائیں گی کہ ذات پات کے بے وجہ کے مسئلے کسی کی زندگی سے تمام رنگ اڑا دینے کا باعث بھی بن سکتے ہیں...... بلکہ ان کے گریز میں ایک اور واضح عذر بھی شامل تھا اور وہ تھی ڈاکٹر عمر رحمٰن کی چار سالہ بیٹی۔

ڈاکٹر صاحب کی ماں نے چوہدری ہاؤس سے اتنا ہتک آمیز جواب سننے کے بعد بیٹے کی شادی جلد ہی خاندان میں کر دی۔ اس جلدی کی شادی میں سب کچھ جلدی جلدی ہوا۔ جلدی ہی ان کے ہاں ایک بیٹی ہوئی' بیٹی کے گیارہ ماہ بعد جلدی ہی ان کو ایک بیٹا بھی خدا نے دیا مگر جلدی ہی دونوں ماں بیٹا ہیپاٹائٹس کا شکار ہو کر چل بسے اور اس غم کو کلیجے سے لگائے ڈاکٹر عمر نہ جانے اور کتنے سال تنہا گزار دیتے کہ جلدی ہی قدرت نے ڈاکٹر گل لیلیٰ چوہدری سے ان کو دوبارہ ملوا دیا البتہ ڈاکٹر لیلیٰ کو رضا مند کرنے کا مرحلہ اتنی جلدی نہیں نمٹا اور کل رات ہاسپٹل سے واپسی پر لیلیٰ آپی نے بڑی امی سے صرف یہ کہا کہ

''عمر رحمٰن کی والدہ ایک بار پھر آپ کے گھر آنا چاہتی ہیں۔ یہ فیصلہ اب بھی آپ کے ہاتھ ہے۔ ڈاکٹر عمر کے مجبور کرنے پہ میں صرف یہاں تک کی اجازت انہیں دینے پر تیار ہوئی ہوں یہ کہہ کر کہ بعد کے حالات کی ذمہ داری میری نہیں۔ آپ سے صرف اتنی ہی التجا ہے کہ انکار ہی کرنا ہو تو خدارا سلیقے سے کیجیے گا اور ہاں...... اس بار وہ اکیلی نہیں ہوں گی' ڈاکٹر عمر کی چار سالہ بیٹی بھی ہمراہ ہو گی۔''

اتنا کہہ کر وہ تو کمرے میں بند ہو گئیں۔ بڑی امی کو پسوڑی (افراتفری) پڑ گئی۔

پہلے تو وہ خود کو یہ یقین ہی نہیں دلا پا رہی تھیں کہ ان کے کانوں نے کیا سنا ہے۔ پاس بیٹھی بینا نے کندھے جھنجھوڑ کر ماں کو ساری بات پھر سے بتائی کئی روز سے اس پہ چھائی سوگواری اڑن چھو ہو چکی تھی۔ بیلا نے بھی منت کی۔

''امی' پلیز اس بار نہیں......اب نہیں...... بہت ہو چکا۔''

اس نے ماں کے ٹھنڈے ٹھار ہاتھ تھام کے التجا کی۔ بڑی امی کے ہوائیاں اڑے چہرے پہ رفتہ رفتہ بہتری کے آثار نمودار ہوئے اور دل ہی دل میں ایک پکا عزم کرتے ہوئے وہ شوہر نامدار سے بات کرنے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس موقع پہ انہوں نے دیور اور دیورانیوں کے ساتھ ساتھ نند کو بھی اعتماد میں لینا ضروری سمجھا۔ سب چچا ہی اپنی اس بھتیجی کے انکار اور ناراضگی کے پس منظر سے آگاہ تھے لیکن شبنم پھوپھو کے لیے یہ خبر نئی تھی۔ وہ تاسف سے کتنی ہی دیر تک سر ہلاتی رہیں۔

''ابا جی اور اماں جی دونوں پرانے زمانے کے لوگ تھے۔ پرانی سوچوں پرانے رواجوں کو گلے سے لگا کر جینے والے لیکن بھائی جان آخر تھے تو وہ آپ کے والدین ہی......اولاد اور اولاد کی اولاد سے محبت ان کے اندر بھری پڑی تھی۔ آپ سب تو نئی سوچ رکھنے والے تھے' اگر سب مل کر سمجھاتے' بیٹی کے لیے اسٹینڈ لیتے تو وہ مان ہی جاتے۔ چلو اگر کچھ ناراض بھی ہوتے تو کیا تھا۔ کیوں نعمت بھائی جان! آپ نے رابعہ بھابی سے چوری چھپے شادی رچا لی تو کیا وہ خفا نہیں ہوئے تھے مگر کتنا عرصہ؟ اسی طرح مجھے یاد ہے وہ فضیلہ کے لیے بھی راضی نہیں تھیں لیکن رابعہ اور آپ سب کو حبیب کے لیے یہی لڑکی بھائی' تو آخر وہ مان گئیں۔ پھر یہ تو مت کہیے کہ آپ سب اماں جی کی ضد کے آگے مجبور تھے۔ دراصل اندر سے آپ سب کی اپنی سوچ بھی اس وقت وہی تھی۔ اب بدلتے وقت کے تقاضوں نے بدلنے پر مجبور کر دیا ہے تو کھل کر تسلیم کریں اپنی غلطی اور اسے سدھارنے کا بھی سوچیں۔''

''ہاں بھائی صاحب! اب اس بات پہ توجہ دینے کا وقت نہیں کہ اس کی پہلی بیوی مر چکی ہے اور ایک بیٹی بھی موجود ہے۔ اب آپ کو صرف گل لیلیٰ کی زندگی کے اتنے سنہرے سال برباد کرنے کی غلطی کا ازالہ کرنا ہے۔'' پاپا نے رائے دی۔

''تو...... پھر فون کر کے کل افطاری پہ مدعو کر لیں؟'' بڑے ابو خود دل سے راضی تھے۔ عرصے بعد سینے پہ پڑا پچھتاوے کا بھاری پتھر سرکنے کے آثار نظر آئے تھے۔ بس بھائی بہنوں سے مشورہ کرنا باقی تھا۔

''ہاں جی......بسم اللہ کیجیے۔'' سب نے ہم آواز ہو کر کہا۔

''اللہ اللہ کر کے یہ برکتوں والی گھڑی آئی ہے بھابی......'' بڑی امی مارے خوشی کے رو پڑیں تو آنٹیاں انہیں گلے لگانے لگیں۔

''میری لیلیٰ بڑی صبر والی ہے۔ پتا ہے اب بھی اس نے سارے اختیار ماں باپ کو سونپ دیے۔ اتنے سالوں کی تلخی نے بھی ذرا سرکشی نہیں پیدا کی اس کے اندر اللہ اس کے صبر اور آزمائش کا صلہ اسے دے۔''

''آمین......اور بھائی جان بات لمبی مت لٹکائیے گا نہ لیلیٰ کی نہ ہی بیلا کی۔ بس اللہ کا نام لے کر ہاں کیجیے اور تیاریاں شروع میں تو چاہتی ہوں دونوں فرائض سے اکٹھے ہی سبکدوش ہو جائیے۔'' شبنم پھوپھو کی رائے پہ خوشی خوشی ساری کارروائی دیکھتی گل بیلا جل کر رہ گئی۔

''انہیں ضرور بیچ میں اپنے لاڈلے گھسیڑنے ہوتے ہیں۔''

''اونہوں...... بڑی ہیں وہ بیلا...... تمیز سے بولا کرو۔'' کشف کو برا محسوس ہوا۔

''تمہیں جو اعتراض ہے سو ہے' پھوپھو کے بارے میں یوں بدتمیزی سے تو مت بولا کرو۔ وہ بے چاری تو اتنی مخلص ہیں' دیکھا نہیں اب بھی آپی کے لیے کیسے بھائیوں کو کنوینس کیا۔''

''بلکہ دو ہی کیوں؟ بھائی جان کینیڈا کی تو خیر خبر لیجیے' آخر رُخے کے سسرال والوں کے کیا ارادے ہیں۔ رخی سے کہیے' جیٹھانی بن کر اب بینا کے دن رکھنے بھی آ ہی جائے۔'' بینا کی منگنی کے پھڈے سے بے خبر پھوپھو نے نیا شوشہ چھوڑا۔

''اب میں کچھ کہوں گی تو پھوپھو کی چہیتیوں کو برا لگے گا لیکن تم خود سوچو کس قدر شوق ہے انہیں سب کے ہاتھ پیلے پھٹ کرنے کا۔''

''شوق دا کوئی مول نئیں۔'' شاداب گنگنائی۔

****

گل لیلیٰ آپی کے سلسلے میں آنے والے مہمانوں کی خوشی تو سب کو تھی لیکن ساتھ میں جس طرح پھوپھو بار بار بڑے ابو سے بیلا کے لیے اصرار کر رہی تھیں' وہ کچھ لوگوں کے لیے الجھن کا باعث تھا اور ان کچھ لوگوں میں سے چند ایک کی الجھن میری سمجھ سے باہر تھی۔

بڑے ابو اور بڑی امی کی الجھن تو کچھ بیلا کی ناخوشی کی وجہ سے تھی کہ وہ جبراً اسے شجاعت کے لیے مجبور نہیں کر سکتے تھے حالانکہ بڑی امی کو تو اس میں کوئی قباحت نظر نہ آتی

تھی وہ تو اس رشتے پہ دل وجان سے فدا تھیں یہاں تک کہ خوشی خوشی بیلا کی ٹھکائی کر کے بھی اس کے مزاج درست کرنے پہ تیار تھیں لیکن رابعہ آنٹی اور بڑے ابو نے سمجھایا۔ ان کے تذبذب کی دوسری وجہ بینا تھی جس طرح بینا کا معاملہ لٹکا ہوا تھا ان حالات میں بڑے ابو چاہتے ہوئے بھی شبنم پھوپھو کو حتمی جواب نہیں دے سکتے تھے کہ وہ تو شادی پہ تلی بیٹھی تھیں۔ ہاں سنتے ہی تاریخ مانگ بیٹھتیں اور وہ بینا کا معاملہ واضح ہونے تک ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ بیلا کا منہ سوجا ہوا تھا تو اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی تھی۔ اس نے شبنم پھوپھو کے آنے سے پہلے ہی ان کے مقصد اور ارادوں پہ اس طرح جی بھر کے تنقید کی تھی کہ اب اس کو یہ حقیقت تسلیم کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ خود ان کا شکار ہو چکی ہے۔ یوں بھی اس کے بقول وہ دلہن میٹریل نہیں ہے۔ چوڑیاں پہننے سے اس کی کلائی میں خارش شروع ہو جاتی ہے، مہندی کی خوشبو سے چھینکیں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور ابٹن تو دیکھتے ہی ابکائی آ جاتی ہے لہٰذا اس کی شادی کا خیال بھی کوئی دل میں نہ لائے، لیکن اس کے اس فتویٰ پہ ایمان لانے کا کسی کا بھی ارادہ نہ تھا اس لیے شبنم پھوپھو کی کوششیں بھی جاری تھیں اور بڑے ابو کا تذبذب بھی دم توڑ رہا تھا۔

البتہ شاداب اور عطا دونوں کے اترے ہوئے چہرے اور چڑھی تیوریاں مجھے پریشان کر رہی تھیں۔ شاداب صبح سے سب کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی جب کہ عطا تھوڑی تھوڑی دیر بعد کمرے میں بند ہو جاتا۔ جب اس کی ضرورت پڑتی، غمگین سی شکل بنائے برآمد ہوتا، چپ کر کے کام کرتا اور پھر سے اپنے کمرے میں غائب جہاں دردبھری غزلوں کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ سب سے پہلے میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"یہ تم کیوں بوتھا بنائے بیٹھے ہو لڈو پیڑے۔"

"مجھے اس وقت مت چھیڑنا۔" تکیے میں سر دیے وہ اوندھا لیٹا مسلسل پیر ہلا رہا تھا۔

"تو پھر کوئی مناسب سا وقت آپ خود ہی تجویز کر دیجیے۔" میں اس کی دھمکی سے ذرا مرعوب نہ ہوتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔

"میرا برا وقت چل رہا ہے جس میں کسی مناسب گھڑی کا ملنا ممکن نہیں۔" اس کی مایوسی و دل گرفتگی انتہا کو تھی۔

"تو یاروں دوستوں کی خدمات حاصل کرو میرے پیڑے! آخر ہم کس کام آئیں گے۔"

"تم کسی کام کی نہیں۔"

"ابھی بیلا بھی یہی کہہ رہی تھی لیکن یار اس کا مسئلہ دوسرا ہے۔ بھئی جو کیس بڑوں کی عدالت میں چل رہا ہو اس میں، میں اس کی کیا مدد کر سکتی ہوں لیکن اس نے بھی تمہاری طرح یہی بھاری بھرکم سا طعنہ دے مارا واقعی تم دونوں...... اچانک تم اور بیلا دونوں ہی۔" کہتے کہتے میں رک گئی۔ یہ جملہ اب ضرورت سے زیادہ ہی جانا پہچانا ہو گیا۔ پہلے کی طرح یہ کہنے کے بعد مجھے یہ یاد کرنے کی ضرورت نہ پڑی کہ عطا نے اس فقرے کی مناسبت سے آخر اس روز کیا عجیب سی بات کی تھی...... بلکہ کھٹ سے وہ بات میرے ذہن میں خود ہی گونج اٹھی۔

"پلیز ایک بار پھر سے کہو...... میں اور بیلا...... بیلا اور میں......"

"عط...... طا۔" یاد آتے ہی جیسے ساری گتھی سلجھ گئی۔

"تو چوہدری عطاءاللہ نعمت...... یہ ہے ساری کہانی...... میں سمجھ گئی سب کچھ سمجھ گئی۔" میں نے فاتحانہ نعرے لگائے جنہیں وہ کسی خاطر میں نہ لایا۔

"تو کیا ہوا۔ تمہارے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے، جسے سمجھنا ہے وہ تو خود سے بھی انجان ہے۔ میرے حال دل سے کیا خاک واقف ہو گی اور جن کو یہ نیا پار لگانی ہے وہ چراغ تلے اندھیرا کیے بیٹھے ساؤتھ افریقہ میں چراغاں کرنے کی سوچ رہے ہیں۔"

"چراغ تلے اندھیرا نہیں بدھو، یہاں وہ مثال بھلی لگے گی، گھر کا مرغا دال برابر یا پھر بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں...... یا پھر......"

"چلو تم میرے مسئلے کو چھوڑو، پہلے میرے محاورات درست کر لو۔ اماں اردو......"

"اچھا اور وہ جو تم دونوں ہر وقت میرے جملوں کو ٹوک ٹوک کر درست کرتے رہتے تھے، وہ یاد نہیں...... تم دونوں...... تم اور بیلا...... عطاءاللہ اور گل بیلا...... یعنی کہ گل بیلا اور عطاءاللہ......" میں شرارت سے کہتی پیچھے پلٹنے لگی کہ اس سے کچھ بعید نہ تھا وہ مجھے سائیڈ ٹیبل پہ پڑا گلدان بھی دے مارتا۔

"ہوں تو ان جناب کے چہرے پہ بارہ بجنے اور کمرے میں عطاءاللہ عیسیٰ خیلوی کے دردبھرے گیتوں کے ابھرنے کا راز تو کھلا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے بارے میں بعد میں سوچا جائے گا...... ٹھہرو پہلے یہ عقدہ تو سلجھا لیں کہ شاداب بی بی کی بجھی بجھی سی کیفیت کے پیچھے بھی تو کسی واردات قلبی کا ہاتھ نہیں؟ ہیں...... شجاعت...... نہیں نہیں...... لیکن ہاں ہاں...... ہو بھی سکتا ہے اگر عطا کے دل میں بیلا کنڈلی مار کے بیٹھ سکتی ہے جن کے ستارتی

تعلقات بچپن سے ہی کشیدگی کا شکار ہیں تو شاداب کو شجاعت کیوں نہیں پسند آ سکتا۔

اندازے لگاتی میں شاداب کے پاس جا پہنچی بڑی دل سوزی سے اس کے چپ چاپ رہنے کی وجہ دریافت کی۔ جواباً وہ پھٹ پڑی۔

''تم کبھی میری بات پہ یقین نہیں کرتیں۔ دیکھ لی اب تم نے بڑی امی کی چالاکی۔ چلو مان لیا گل لیلیٰ آپی کے لیے آنے والے رشتے میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں لیکن آخر کوئی تو وجہ ہوگی جو شبنم پھوپھو کو سوائے ان کی بیٹیوں کے اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔'' مجھے اپنا خدشہ درست ہوتا معلوم ہوا۔

''ہاں...... واقعی میرا تو خیال تھا شجاعت کے ساتھ تم زیادہ سوٹ کرتی ہو۔'' میں نے تاک کر نشانہ لگایا لیکن وہ بدک اٹھی۔

''دفع دور...... میں کوئی یہ تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔ کشف بھی ہے، تم بھی ہو، رحمہ ہے پھر آخر تائی امی پھوپھو کو کسی اور طرف جانے کیوں نہیں دے رہیں۔ صاف ظاہر ہے انہیں گھیرے بیٹھی ہیں۔ فضیلہ آنٹی کالج کے چکروں میں بزی، رابعہ آنٹی ہیں تو ہر وقت عبادات و وظائف میں مصروف اور ہماری تو خیر ماں ہی نہیں، جو کچھ سوچے، ایسے میں تائی امی کے مزے ہیں۔'' وہ غصے میں بڑی امی کو اکثر تائی امی کہہ جاتی۔

''تو ابھی کون سا ہاں کردی ہے انہوں نے آج تو اللہ اللہ کرکے آپی کا فیصلہ ہوگا پھر......''

''ہاں پھر بیلا اور دیکھنا یہ جو بینا کا بہانہ بنایا جارہا ہے تاخیر کے لیے یہ بھی صرف پھوپھو کی توجہ بینا کی طرف کرنے کے لیے ہے۔''

''فٹے منہ۔'' میں کسی اور بات کی کھوج میں آئی تھی، پتہ چلا شاداب کے اترے چہرے کی وجہ وہ حسد اور نامعلوم رنجش تھی جو وہ بچپن سے بڑی امی کے لیے دل میں پالے ہوئے تھی لیکن لیلیٰ آپی وہ ہستی تھیں جن کے خلاف کوئی دل میں ہلکا سا غبار بھی نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے جیسے ہی شام کو مہمان آئے، شاداب اور عطا سمیت سب خوشی سے سرشار کسی اچھی خبر کے انتظار میں اکٹھے ہوگئے۔

پرانی تکلیف دہ باتوں کو چھیڑنے کے بجائے عمر رحمٰن کی والدہ نے نئے سرے سے بات چھیڑی اور یہی آسان طریقہ تھا تلخی سے بچنے کا۔ ان کے اس طرز عمل نے بڑے ابو کو فیصلہ کرنے میں تاخیر کا موقع نہ دیا اور یوں افطاری کے بعد باقاعدہ منہ میٹھا کرایا گیا۔ آنٹی رابعہ کا بنایا چیری اینڈ چیز کیک اور میرے تیار کردہ گاجر کے حلوے اور گلاب جامنوں

نے خوب ساتھ دیا۔ آپی کے چہرے پہ بھی عرصے بعد ایک رنگ تھا، ایک سکون تھا۔

ابھی اس خوشی کو صحیح طرح سے سیلیبریٹ بھی نہ کیا گیا تھا کہ لیٹ نائٹ کینیڈا سے آنے والی صفدر بھائی جان کی والدہ کی کال نے سوگواری پھیلا دی۔ اگرچہ رخشے آپی کے بتانے کے بعد سب ہی اس رشتے سے بے اطمینانی ظاہر کرتے ہوئے خود کو ذہنی طور پہ تیار کرچکے تھے لیکن اب منگنی توڑنے کا باقاعدہ اعلان سب ہی کو خاموش کرگیا۔ بینا نے جتنا رونا تھا، رو چکی تھی اب سر جھکائے بیٹھی ناخن کھرچ رہی تھی۔ بیلا ''مودے ٹیم پیس'' کو بے نقط سنا رہی تھی۔ بڑی امی کے چہرے کا رنگ پھر سے پھیکا پڑ گیا تھا اور بڑے ابو کے شانے پھر سے جھک گئے تھے۔ شبنم پھوپھو کے لیے یہ خبر ایک شاک تھی کیونکہ وہ پہلے کے واقعات سے ناواقف تھیں۔

''بھابھی! آپ نے پہلے ذکر ہی نہ کیا۔''

''کیا کہتی، دل ہی دل میں سب صحیح ہونے کی دعا کرتی رہی۔''

''ارے جب پتا تھا کہ آج کل میں یہ ہونا ہے تو کیوں نہ خود پہلے فون کرکے انکار دے مارا ان خبیثوں کے منہ پہ۔''

بیلا ماحول کی ٹینشن کے باوجود میرے کان میں گھس کر کہنے سے باز نہ آئی۔ ''لگتا ہے جملہ توڑ مروڑ کر کہنے کی عادت تم نے پھوپھو ہی سے لی ہے۔''

''اور کچھ نہیں تو کم از کم مجھے ہی بتا دیا ہوتا۔ گل لیلیٰ کے بعد اصولاً تو مجھے بیلا کے بجائے بینا...... لیکن وہ منسوب تھی تو اس لیے۔'' اچانک انہیں کمرے میں موجود چار بکریوں کا دھیان آیا۔

''اے لڑکیو! ذرا تم لوگ باہر تو نکلو۔'' لیکن ہمارے کان کھڑے ہوچکے تھے خصوصاً میرے...... جو عطا کو اچھی خبر سنانے کا لارا لگا آئی تھی۔ پھوپھو کے مبہم سے الفاظ مجھے امید دلا گئے کہ شاید اب بیلا کے بجائے وہ بینا کو اور بیلا اور عطا...... عطا اور بیلا......

اسی لیے چپ چاپ سر جھکا کر باہر نکلنے کے بعد ہم تینوں...... جی ہاں ہم تینوں لائن بنا کر دروازے کے پاس کن سوئیاں لینے کھڑے ہوگئے اور چوتھی گل بینا ہاتھ چھڑا کر لاؤنج میں نکل گئی۔ اسے شاید اب کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی تھی۔ میں نے کان لگا دیے۔

''شیریں بھابی! ویسے تو یہ بات سب کو بٹھا کر کرنے والی ہے لیکن آپ سے پہلے یہ ذکر صرف آپ کو دلاسہ دینے کے لیے کررہی ہوں کہ بینا کے لیے اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں منگنی ہی ٹوٹی ہے نا...... ایسا کیا غضب ہوگیا۔ ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی

ہے‘ جان چھٹی چنڈالوں سے آپ فکر مت کیجیے۔ میرا دوسرا بیٹا حاضر ہے۔ آخر صداقت بڑا ہے پہلے اس کا کروں گی تو نجی کی باری آئے گی وہ تو بیلا کے ساتھ صداقت کا جوڑ نہیں بیٹھ رہا تھا اس لیے چھوٹے کا نام لیا۔ اب میں بھائی جان سے آپ کی دونوں بیٹیوں کے لیے سوال کروں گی۔"

"نہیں شبنم بہن! یہ تمہاری محبت ہے۔ میں اس کی قدر کرتی ہوں لیکن دیکھو یہ ذکر مت کرنا۔ جانے دو اس بات کو۔ بس بیلا کی بات کرو اب میں دو دو بیٹیاں کیسے تمہیں...... تم مجھے غلط مت سمجھنا مگر......" انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے فوراً انکار کر دیا۔ پھوپھو ہکا بکا رہ گئیں۔

"یہ کیا بات ہوئی بھابی! آخر پہلے بھی تو آپ ایک ہی گھر میں دو بیٹیاں بیاہ رہی تھیں‘ پہلے بینا رخنے کی دیورانی بننے جا رہی تھی اب چھوٹی بہن کی جیٹھانی بن جائے تو کیا برا ہے؟"

"تمہیں کیسے سمجھاؤں شبنم......! میں نے خود کو صرف ان چار لڑکیوں کی ماں ہی نہیں سمجھا بلکہ اس گھر کی ہر بچی میری بچی ہے اور خصوصاً رحمت اللہ کی تینوں بچیاں‘ ان بن ماں کی بچیوں کو تو میں نے اپنی ذمہ داری ہی سمجھا ہے۔ میں تمہارے آگے کسی ایک کا نام تجویز نہیں کروں گی کہ یہ بچیاں مجھے اتنی بھاری نہیں جو نام لے کر تمہیں رضامند کروں۔ وہ تو تمہاری اپنی مرضی ہے کہ تم کس کو لیتی ہو‘ لیتی بھی ہو یا نہیں لیکن تمہاری محبت پر یا میرے خلوص پہ کوئی شک کرے یہ مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔"

میں نے کن انکھیوں سے شاداب کو دیکھا‘ وہ نظریں چرا رہی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں بھابی! کسی کو کیا اعتراض ہوگا۔"

"کسی کو نہ بھی ہو مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ میں تو اکٹھی تین تین بیٹیوں کی شادیاں نمٹاتی پھروں اور رابعہ فضیلہ کی ایک بیٹی کی بھی بات طے نہ ہو۔ نہیں نہیں انہیں کوئی رشتوں کی کمی تھوڑا ہی ہے۔ میری شاداب‘ سحاب‘ کشف‘ رحمہ سب شکل وصورت تعلیم ہنر میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اگر تمہاری بات مان لوں تو ان پہ کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن مجھے بے اطمینانی سی رہے گی کہ میں نے اپنی دوسری بیٹیوں کا حق مار لیا۔ بینا کی قسمت میں جو ہوگا اسے مل جائے گا۔"

وہ رخساروں پہ بہنے والے آنسو صاف کر رہی تھیں اور باہر کھڑی شاداب کا چہرہ آہستہ آہستہ بھیگ رہا تھا۔ میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ بہتر تھا‘ وہ خود ہی شرمندہ

ہوتی۔

* * *

"کس کا فون تھا سیماب بیٹا؟" رابعہ آنٹی نے پوچھا۔

"وہ شاداب کی ایک دوست ہوا کرتی تھی نا......عروج۔" میں نے ریسیور رکھتے ہوئے تفصیل بتانا چاہی کہ بیلا نے بات اچک لی۔

"وہی جس کا زوال بی اے کے دوران ہی ہوگیا تھا۔"

"ہاں ہاں وہی‘ جس کی شادی ایگزامز سے ٹھیک دو ہفتے پہلے ہوگئی تھی۔ یاد ہے آپ کو آنٹی ہم سبھی گئے تھے شادی پہ۔"

"ہاں وہ بچی تو شاداب کی خاصی اچھی دوست ہوا کرتی تھی۔ سنا تھا کہ آرمی آفیسر سے بیاہی گئی ہے اور کسی دور دراز کے شہر میں پوسٹنگ ہوگئی ہے۔ خاصے عرصے کے بعد فون آیا ہے اس کا۔"

"جی‘ آج کل اپنے میکے آئی ہوئی ہے اور کہہ رہی تھی کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک آ رہی ہے۔ میں نے بتایا بھی کہ شاداب ابھی یونیورسٹی میں ہے اور وہاں سے سیدھی کوچنگ سینٹر چلی جائے گی‘ تم شام کو چلی آنا لیکن ساری بات سننے کے بعد بھی کہنے لگی کہ بس ہم آ رہے ہیں۔"

"ہم؟" آنٹی چونکیں۔ "اس کا ہسبینڈ ہوگا ساتھ میں؟"

"شاید وہ بھی ہو‘ اپنی امی اور بھابی کے ساتھ ہونے کا تو اس نے بتایا ہے۔"

میری اس اطلاع پہ رابعہ آنٹی نے معنی خیز انداز میں بڑی امی کو دیکھا‘ وہ بھی پالک چنتے چنتے رک کر بات کو جانچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں کے لبوں پہ ایک مشترکہ مسکان پھیلی اور پورے جوش وخروش کے ساتھ آنے والے مہمانوں کے استقبال کی تیاری شروع ہوگئی۔

آنٹی اور بڑی امی کی خالص بیٹی کی ماں ہونے کی حس نے بالکل درست سگنل دیا تھا۔

عروج کے بھائی کے لیے لڑکی کی تلاش جاری تھی۔ اس کے میکے آنے کے بعد جب اس سے مدد طلب کی گئی تو اس کی آنکھوں کے آگے اس کی اکلوتی دوست شاداب کا چہرہ آ گیا جس کے ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ اس کی ذہانت اور خوش مزاجی کی وہ شروع سے قائل تھی۔ اس نے شاداب کا نام لیا تو اس کی امی اور بھابی کو بھی وہ دراز قامت‘ لمبے

بالوں اور بڑی بڑی غزالی آنکھوں والی زندہ دل لڑکی یاد آ گئی جس کے نام کی طرح شادابی اس کی پوری شخصیت پہ چھائی ہوئی تھی۔

عروج پوری فیملی کے ساتھ آئی اور آتے ہی مدعا ظاہر کر دیا گیا۔ ایمرجنسی میں فون کر کے بڑے ابو اور بڑے پاپا کو بلایا گیا۔ وہ لوگ تو ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کے خواہاں تھے لیکن رابعہ آنٹی نے سلیقے سے ان سے سوچ بچار کے لیے وقت طلب کرتے ہوئے ٹالا۔ عروج کی امی نے انہیں اپنے گھر مدعو کیا تاکہ وہ لوگ بھی اچھی طرح ان کے بیٹے عامر کو دیکھ بھال لیں۔ وہ بس نکلنے ہی والے تھے کہ تھکی ہاری شاداب آ گئی۔ اتنے عرصے بعد عروج کو اپنے سامنے پا کر خوشی سے بے حال ہو گئی۔

''ارے یہ کیا' میں آئی اور تم چل دیں۔ کچھ دیر بیٹھو نا۔'' وہ ہاتھ کھینچ کر اسے اندر لے جانے لگی۔

''بہت دیر سے آئے بیٹھے ہیں۔ دوبارہ آؤں گی تو تمہارے ساتھ زیادہ وقت گزاروں گی۔''

''افطاری میں کچھ وقت رہتا ہے۔ آپ لوگ رک ہی جائیں تو بہتر ہے۔'' آنٹی نے ایک بار پھر مہمان نوازی نبھاتے ہوئے اصرار کیا۔

''اب تو آپ دوبارہ بلائیں گے تو آئیں گے۔''

عروج کی امی نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ آنٹی نے جواباً کچھ کہنے سے فی الحال احتراز کیا۔ ان کے جانے کے بعد شاداب بڑبڑانے لگی۔

''یہ عروج کس قدر عجیب سی ہو گئی ہے ایک تو دوست سے ملنے کے لیے پورا ٹبر اٹھا لائی' دوسرا جاتے جاتے پھر سے کہہ گئی کہ اب مدعو کریں گے تو آئے گی حالانکہ شادی کے فوراً بعد میں نے اسے اور اس کے گھونچو سے میاں کو کھانے پر بلایا تھا اب ہر بار خصوصی دعوت دوں گی تو کیا تب آئیں گی محترمہ' اتنا نہیں ہو سکا محترمہ سے کہ جھوٹے منہ مجھے ہی کہہ دیتی اپنے گھر آنے کے لیے۔''

''جھوٹے منہ نہیں وہ سچے منہ تمہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی ہے...... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''

پیٹ کی ہلکی بینا نے فوراً اسے ایک طرف لے جا کر ساری بات بتائی۔ میں اس کے چہرے پہ پھیلے ست رنگے جذبات دیکھنے اور بیلا کی جھنجلاہٹ دیکھنے کی منتظر ہی رہی' اس نے معمول کے انداز میں ساری خبریں یوں سنی جیسے بینا نے اسے ٹماٹر مہنگے ہونے یا آٹا سستا

ہونے کی خبر سنائی ہو۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے بے فکری سے شانے اچکائے۔

''اچھا اچھا...... میں بھی کہوں' یہ عروج کے تاثرات اتنے پراسرار سے کیوں ہیں۔''

''شادیوں کا ایک سیزن ہوا کرتا ہے' یہ تو سن رکھا تھا کہ سال میں ایک آدھ مہینے ہوا کرتا ہے جن میں ہر گلی میں قنات لگی ہوتی ہے اور ہر بینکوئٹ ہال میں دو دو تین تین شفٹیں لگا کرتی ہیں لیکن ایسا پہلی بار دیکھا ہے کہ یوں رشتوں کی وبا پھوٹ پڑی ہو اور میں تو کہتی ہوں جو باقی بچی ہیں وہ اپنے طور پہ کوئی حفاظتی ٹیکے لگوا لیں اس سے پہلے کہ کوئی مہلک وائرس ان کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ میرا خیال ہے یہ جراثیم شبنم پھوپھو اپنے ساتھ ساؤتھ افریقہ سے لائی ہیں۔'' بیلا نے حسب عادت اس کا سہرا بھی پھپھو کے سر باندھا۔

''اور میرا خیال ہے کہ بڑی امی نے رسالے میں روحانی مشوروں والے کالم سے ہانڈی تالے کا وظیفہ پڑھ لیا ہے اور شاید زیادہ ہی تعداد میں ہانڈیاں جمع کر لیں اسی لیے روز کے دو دو تین تین رشتے طے ہو رہے ہیں۔'' کشف نے قیاس آرائی کی۔

''امی پڑھنا جانتی ہی نہیں اور معاف کرنا زیادہ وظیفے تمہاری امی کرتی ہیں۔ یقیناً رابعہ آنٹی کی تہجد کی نمازیں اور لمبے لمبے سجدے کام کر گئے ہیں رمضان کا مہینہ ہے' ٹپاٹپ رحمتیں برس رہی ہیں۔'' بینا نے کہا تو بیلا نے فوراً اختلاف کیا۔

''رحمتیں......؟ اور تم پہ کیا برسی...... اسے بھی پھر رحمت سمجھو' آدھی آدھی رات تک سسکتی کیوں رہتی ہو۔''

''تم دونوں آپس میں چونچ ہی لڑاتی رہا کرو۔ دیکھنا ایک دن کیا نتیجہ نکلے گا۔ ایک کی چونچ گم ہو گی تو دوسری کی دم۔ یہ سوچو اب سب کا کیاری ایکشن ہو گا اس رشتے کے بارے میں رات کی میٹنگ کی تمام تفصیل لانے میں کون میری مدد کرے گا۔''

تقریباً سب ہی کے ہاتھ کھڑے ہو گئے میں نے افسوس اور ندامت سے سر ہلایا۔

''کیسی اچھی بچیاں ہوا کرتی تھیں ہم' اپنے آپ میں مگن' بے پروا' بے ضرر...... یہ نت نئی رونما ہونے والی رشتہ داریاں ہمیں کیسی بری لت میں مبتلا کر گئیں۔ کیا چسکا پڑ گیا ہے جاسوسی کرنے کا۔''

''لگتا ہے ہم دوشیزاؤں سے خواتین بننے کے مرحلے میں داخل ہو رہی ہیں۔'' حمنہ نے پیش گوئی کی جسے سن کر سب احتجاجاً چلا اٹھیں۔

* * *

چوتھے دن چوہدری ہاؤس سے ایک جتھے کا جتھا عامر کو دیکھنے روانہ ہوا۔ عطا پر سب ہی نے زور ڈالا چلنے کے لیے لیکن وہ بے دلی سے پیکنگ میں مصروف رہا۔ اسے رات کو ہی واپس رسالپور جانا تھا۔ اگرچہ اس کی تین چھٹیاں باقی تھیں لیکن بڑے ابو کے کہنے پہ وہ واپس جا رہا تھا تاکہ یہ تین چھٹیاں عید کے موقع پہ کام میں لائی جا سکیں۔

شبنم پھپھو کی ساس بھی مع اپنے بڑے بیٹے اور اس کی فیملی کے عمرہ سے واپس آ رہی تھیں اور آج انہیں اپنے سسرال جانا تھا لیکن شاداب کی وجہ سے انہوں نے بیٹوں کو دادی کے پاس بھیج دیا اور خود ایک دن کے لیے رک گئیں۔

''عطا! تم یونہی چلے جاؤ گے...... ایسے ہی......؟''

میں نے بیگ میں کپڑے ٹھونستے ہوئے عطا اللہ سے پوچھا۔

مجھے اس کی خاموشی اداس کر رہی تھی۔ اگرچہ بیلا کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اور کچھ بینا کے ساتھ ہونے والے تلخ حادثے کی وجہ سے ابھی تک پھوپھو کو واضح ہاں نہیں کی گئی تھی لیکن سب جانتے تھے کہ پھوپھو ہاں کروا کے ہی دم لیں گی۔ ادھر بیلا پیر پٹختی پھر رہی تھی ادھر عطا کی آنکھیں ہر وقت سوچی سوچی سی نظر آتیں۔ مجھے دونوں عزیز تھے اور میں دونوں میں سے کسی ایک کے مسئلے کا حل ضرور مخلصانہ طور پہ نکالنا چاہتی تھی۔ کچھ ایسا ہو جائے کہ عطا کی دل گرفتگی دور ہو جائے اور اس کا حل تو یہ بھی تھا کہ شبنم پھوپھو کے بجائے رابعہ آنٹی بیلا کے پیچھے پڑ جائیں اور رہی بیلا تو اس کے پیر تو اس صورت میں بھی پٹختے ہی رہیں گے۔ اسے تو شادی سے ہی چڑ تھی۔

لیکن بھلا اس میں' میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس کی شادی کہیں نہ کہیں تو ہونی ہے۔ بڑی امی جیسی ''لڑکی ٹھکانے لگاؤ ٹائپ خاتون'' اسے زندگی بھر بے مہار تو نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ پھر کیوں نہ بے چارے عطا کے ہی چند دن کے ارمان پورے ہو جائیں۔ یہی سوچ کر میں عطا کو اکسا رہی تھی کہ وہ ہمت کر کے اپنے ماما' پاپا سے بات کرے۔

''کیا کروں میں؟ مما کو بتانا مشکل نہیں اور نہ ہی یہ مسئلہ ہے کہ انہیں بیلا پہ کوئی اعتراض ہوگا لیکن یار! وہی ان کی روایتی وضع داری اور لحاظ...... یہ آڑے آئے گا۔ پاپا کبھی نہیں چاہیں گے کہ اس صورت میں جب کہ شبنم پھوپھو پہلے ہی بیلا کی امیدوار ہیں' وہ بیچ میں ٹانگ اڑا کے اپنے بیٹے کے لیے سوال کریں اور وہ میرا نہیں بلکہ بیلا کا باپ بن کر سوچیں گے کہ اس کے لیے کون سا لڑکا مناسب رہے گا۔ مجھ جیسا تازہ تازہ لیفٹیننٹ یا پھر

شجاعت کے جیسا سیٹل بزنس مین ان کا ووٹ بھی اسی کو ملے گا۔'' اس نے حقیقت پسندی سے تجزیہ کیا۔

''اونہہ' ایسا کیا دھرا ہے اس زکوٹے جن میں۔ بیلا نے اس کے بالکل صحیح نام دھرے ہیں' زکوٹا' قباچہ اور ڈنٹونک کا ٹریڈ مارک تم یونہی کامپلیکس کا شکار ہو رہے ہو ورنہ تمہارے آگے وہ کچھ بھی نہیں۔''

''ذرہ نوازی کا شکریہ...... اور تم فکر مت کرو۔ عمر بھر کنوارہ نہیں رہوں گا۔'' وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ میرا دل رکھنے کے لیے بولا۔ ''اور کوئی نہیں تو تم تو ہو......''

''ہاں یہ تو ہے......'' میں یونہی دردمندی سے سر ہلاتے ہلاتے چونک گئی۔

''کیا......؟ کیا بکواس کی تم نے؟ فضول انسان۔'' اس کی پھیکی ہنسی' مرا مرا لہجہ اور بھیگی سی پلکیں صاف اس کے دل کا حال بتا رہی تھیں لیکن میں اس کا دھیان بٹانے کے لیے جھوٹ موٹ لڑنے بیٹھ گئی۔

''تم لڑکے ہوتے ہی ایسے ہو۔ ابھی کسی کے فراق میں آہیں بھر رہے ہوتے ہیں اور ذرا کسی اچھی شکل نے کچھ توجہ دی' فوراً اس پہ لٹو ہو گئے موقع ملنا......'' بات کرتے کرتے میں رک گئی اور لب دانتوں میں دبا کر کچھ سوچنے لگی۔ ایک شیطانی منصوبہ میرے زرخیز ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔ میرے لب آپوں آپ مسکرانے لگے۔

* * *

ان دس بارہ دنوں میں خاصا کچھ طے پا چکا تھا۔ گل لیلیٰ آپی کا رشتہ تو ڈاکٹر عمر رحمٰن کے ساتھ ہو ہی چکا تھا۔ ایک دو ہی میٹنگز میں عامر کو بھی سب نے اوکے کر دیا۔ شاداب سے پوچھا گیا تو اس نے سب کچھ بڑی امی پہ چھوڑتے ہوئے نہ صرف ان کا مان بڑھا دیا بلکہ اپنے دل پہ پڑے ندامت کے بوجھ کو بھی اتار پھینکا۔

گل لیلیٰ آپی اور شاداب دونوں کے سلسلے میں منگنی وغیرہ کا جھنجھٹ نہیں پالا گیا' عید کے فوراً بعد شادی طے پا گئی تھی۔ بیلا کا معاملہ ہنوز لٹکا ہوا تھا۔ شبنم پھوپھو اب اپنے سسرال میں تھیں لیکن ہر دوسرے دن بمع ''ہیکل اینڈ جیکل'' کے چکر لگانا نہ بھولتیں۔ ہر بار ان کی آمد پہ بیلا تلملا جاتی۔ اب تو بڑے ابو نے بھی بڑی امی کو کہنا شروع کر دیا تھا کہ ہاں یا ناں میں جواب دے کر شبنم کو فارغ کرو لیکن بڑی امی اتنا اچھا رشتہ چھوڑنے پہ تیار نہ تھیں' اس لیے ناں کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ دوسری طرف بینا کے ہوتے وہ چھوٹی کی بات ٹھہراتے جھجک رہی تھیں۔ بینا یوں بھی زود رنج سی لڑکی تھی اور اب منگنی

ٹوٹنے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی حساس اور روکھی سی ہوگئی تھی۔ بیلا کے لیے ہاں کر کے وہ بینا کی خودترسی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

عطا کا فون بھی تقریباً ہر روز آ جاتا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے طے کرلیا تھا کہ اس سے بات تب کروں گی جب میرے پاس اس کے لیے کوئی خوش خبری ہوگی اس لیے ہمیشہ موقع سے غائب ہو جاتی۔ میری مہم زور وشور سے جاری تھی اور اب اس کی کامیابی کے خاصے امکانات نظر آ رہے تھے۔ یہ میری چند روزہ محنت کا نتیجہ تھا اور مجھے امید تھی کہ اور چند دنوں تک میں حسب منشا نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی حالانکہ پہلے دن کمرکس لینے کے بعد مجھے اچھی خاصی کوفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ عجیب بدھوسی احمق سی لڑکی ہے یہ کشف بھی' ہاتھ ہی نہیں آ رہی تھی۔

جی ہاں کشف چوہدری...... میں نے اس کے ذریعے ہی شجاعت علی سے چھٹکارا پانے کا سوچا تھا اور چونکہ یہ چھٹارا مستقل بنیادوں پر پایا نہیں جاسکتا تھا کہ شجاعت چوہدری ہاؤس کی لاڈلی بیٹی شبنم کے صاحب زادے تھے اس لیے یہی ہوسکتا تھا کہ یہ جن گل بیلا چوہدری کے بجائے کسی اور کو چمٹ جائے اور اس مقصد کے لیے دو ہی نام میرے سامنے تھے۔ کشف اور رحمہ...... دیکھا جائے تو دونوں ہی بے مثال تھیں۔

کشف نیلی آنکھوں' گولڈن بالوں اور سنہری رنگت کے ساتھ بالکل ایک فرانسیسی حسینہ نظر آتی' جس نے کسی فینسی ڈریس شو کے لیے مغلیہ شہزادی کا روپ دھار رکھا ہو۔ انارکلی کے لباس میں جیولیٹ انگلش کلر بالوں کی کھینچ کے بنائی چوٹی' چوڑی دار پاجامے' لمبے لمبے دوپٹوں اور کانوں میں ڈالی سونے کی گول گول بالیوں کے ساتھ وہ بڑی پیاری سی لگا کرتی۔ عرصے سے وہ فقط یہ بالیاں ہی جیولری کے نام پہ استعمال کر رہی تھی۔ اس کے نیلے نینوں پہ رکھا چشمہ یہی ظاہر کرتا تھا کہ بی بی خاصی پڑھاکو ہیں ورنہ اپنی بھول بھالی باتوں سے وہ کسی طرح بھی ہیومن سائیکالوجی میں ماسٹرز کرتی نظر نہیں آتی تھی۔

دوسری طرف رحمہ بھی کسی سے کم نہ تھی۔ اس کی آدھی سے زیادہ دلکشی تو اس کی نرم نرم مسکان میں چھپی تھی اور باقی اس کے آرٹسٹک سے ہاتھوں میں۔ وہ سر سے پیر تک ایک آرٹسٹ نظر آیا کرتی لیکن ایک تو اسے اس مقصد کے لیے آگے کرنے میں قباحت یہ تھی کہ وہ خاصی آدم بےزار واقع ہوئی تھی کم ہی باہر نکلنے اور کسی سے بات کرنے پہ آمادہ ہوتی اور میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں پہلے اس کی منتیں کرتی' ہاتھ پیر جوڑ کر اپنے ساتھ لے جاتی اور پھر شجاعت سے علیک سلیک کرواتی۔ اس کے برعکس کشف بڑی حد تک میری

فرماں بردار تھی۔ لاکھ پڑھائی میں مگن ہو' میرے ایک اشارے پر میرے ساتھ کہیں بھی چلنے کو تیار ہو جاتی اور سب سے بڑی بات' میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ شجاعت کے بارے میں اچھی رائے رکھتی ہے یعنی اسے ہموار کرنے میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔

اس دن جب شجاعت پھوپھو کو اور اپنی دادی کو لے کر ہمارے گھر آیا میں خاصی افراتفری کے عالم میں کشف کو گھسیٹتی لے گئی۔

''شجاعت...... پلیز ہمیں ذرا مارکیٹ لے چلیے۔''

''جی میں؟ لیکن میں تو۔''

''پلیز' دیکھیے بہت ضروری کام ہے۔ بڑے پاپا یا چاچو ہی ہمیں شاپنگ کے لیے لے جایا کرتے ہیں یا پھر عطا اگر موجود ہو تو لیکن...... چاچو رات کو دیر سے گھر آئیں گے تب تک ٹیلر دکان بند کر جائے اور مجھے ابھی وہ سوٹ چاہیے۔''

''ہاں جی' بہت ضروری جانا ہے۔'' کشف کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ کون سا سوٹ' کیسا سوٹ لیکن اس نے میری ایمرجنسی کو دیکھتے ہوئے ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا۔

''لیکن سحاب! میں یہاں کے راستوں پر ڈرائیونگ نہیں کرسکتا۔ میں لیفٹ ہینڈ ڈرائیو کرتا ہوں۔ تایا جی کا ڈرائیور ہی ڈراپ کر کے گیا ہے' اگر آپ کچھ دیر پہلے کہتیں تو میں اسے روک لیتا یا پھر ایسا کریں کہ ویٹ کرلیں۔ وہ ہمیں لینے آئے گا تو پہلے آپ کو مارکیٹ لے جائیں گے پھر......''

''نہیں نہیں بہت دیر ہو جائے گی۔'' میں فکرمندی سے ہاتھ ملنے لگی۔

کشف نے رائے دی۔

''یار میرے دو نئے سوٹ سل کے آئے ہیں۔ تم ان میں سے کوئی پہن لو۔ ویسے جانا کہاں ہے؟''

میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''ہمیں زیادہ دور نہیں جانا' یہ راؤنڈ اباؤٹ کے اس طرف منی مارکیٹ میں ٹیلرنگ شاپ ہے۔ اس وقت ٹریفک بھی نہیں ہے...... پلیز۔'' میں نے پلیز بڑے اسٹائل کے ساتھ کہا۔ اسے ماننے ہی بنی۔

''چلیں پھر...... سلو ڈرائیو کرلوں گا۔''

''یار سحاب! رہنے دیتے ہیں ایک سوٹ کی خاطر مروانہ دینا۔ فائنل ایگزیمز سر پہ

ہیں دینے سے پہلے ہی مرگئی تو دو سال کی محنت بے کار جائے گی۔"

کشف ڈر رہی تھی مگر میں نے زبردستی اسے آگے دھکیلا۔ جب شجاعت کار کا راک کھول کر مین گیٹ کھولنے آگے گیا تو میں نے جلدی سے پچھلی سیٹ پہ چھلانگ لگائی۔ میرا پلان تھا کہ جیسے ہی کشف بیٹھنے لگے گی میں فکر مندی شکل بنا کر اسے احساس دلاؤں گی کہ ہمیں اس طرح بے چارے معزز مہمان کو ڈرائیور کی طرح نہیں ٹریٹ کرنا چاہیے اس لیے بہتر ہوگا وہ آگے بیٹھ جائے لیکن میرے کہنے سے پہلے ہی کشف ونڈو سے جھانک کر کہنے لگی۔

"یار! یہ تو بہت آکورڈ لگ رہا ہے۔ ہم دونوں ہی پیچھے بیٹھ گئے تو...... آئی مین اچھا نہیں لگتا نا...... اس طرح شجاعت۔"

"ہاں تو پھر...... کیا کریں۔" دل ہی دل میں مسرور ہوتے ہوئے میں نے بہ ظاہر بے فکری سے پوچھا۔

"ہوں......" سیدھے ہوتے ہوئے اس نے اوپر ٹیرس کی طرف نگاہ اٹھائی "کیٹی پلیز کم ہیئر۔"

"دھت تیرے کی۔" میں نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

چلو کیٹی شجاعت کو کمپنی دے لے گی۔" وہ میرے ساتھ جم کے بیٹھ گئی۔ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے میں نے کہا۔

"وہ تو تم بھی...... میرا مطلب ہے ہم بھی دے سکتے ہیں۔"

"لیکن ہم تو شاپنگ کریں گے ناں...... بھئی اب مارکیٹ جا رہے ہیں تو خالی ٹیلر کے پاس سے ہو کر آنے کا کیا فائدہ؟"

میں دانت پیستی رہ گئی۔ واپسی پہ بہ مشکل اپنے خراب موڈ قابو پاتے ہوئے مختصر دورانیے کے راستے میں شجاعت اور کشف کو بار بار آپس میں گفتگو کرنے پر مجبور کیا۔ شاید میں کسی نہ کسی طرح اس زکوٹا کو کشف جیسی نازک پری کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی کہ اگلے ہی روز وہ پھر موجود تھا اور اس بار پھوپھو کے ساتھ نہیں بلکہ اکیلا ہی آیا تھا۔

"تھینکس سحاب! آپ کے اصرار نے میری جھجک تو دور کی۔ آج میں تایا جی کے گھر سے یہاں تک اکیلا ڈرائیو کر کے آ رہا ہوں اتنے دنوں بعد اسٹیئرنگ تھامنے کا مزہ ہی اور ہے۔"

"ابھی تو بچو! تمہاری اچھی خاصی جھجک دور کرنی ہے۔" میں نے دل ہی دل میں مسرور ہوتے ہوئے سر ہلایا۔ "اب یہ بھی اگل دو کہ کس کے دیدار کی طلب یہاں تک کھینچ لائی۔ صرف باچھیں چیر چیر کے مسکرانے سے کام نہیں چلے گا۔"

میں نے خود کلامی جاری رکھی لیکن وہ بھی اچھا خاصا کائیاں تھا اگرچہ متحرک آنکھیں، بلاوجہ پھیلتی مسکراہٹیں اور بوکھلاہٹیں کتنے ہی راز کھول رہی تھیں پھر بھی اس نے منہ سے پھوٹ کے نہ دیا کہ وہ کشف کو دیکھنے کی چاہ میں یہاں چلا آیا ہے۔

میں نے ایک اور حربہ آزمایا۔ پھوپھو کا سسرال ڈیفنس میں تھا۔ میں اپنی دوست رجا سے ملنے کے بہانے کشف کو ساتھ لے گئی۔ بہ مشکل پندرہ منٹ اس کے پاس بیٹھ کے باہر نکلتے ہی میں نے یونہی برسبیل تذکرہ کہا۔

"اسی بلاک میں کہیں پھپھو بھی رہتی ہیں۔" پھر کچھ خیال آنے پہ چونکنے کی بھرپور ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"کشف! کیا خیال ہے، پھوپھو سے ملنے نہ چلیں؟ ویسے بھی انہوں نے شام کو ادھر ہی آنا ہے اچھا ہے ہمارا ٹیکسی کا کرایہ بچے گا۔ ان کے ساتھ ہی گھر چلے چلیں گے۔"

تھوڑے سے پس وپیش کے بعد وہ مان گئی۔ گھر ڈھونڈنے میں کوئی مشکل نہ ہوئی اور اس وقت تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب لان میں ہی شجاعت کو براجمان دیکھا۔ ہمیں گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھ کے اس کے چہرے پر جو اچانک خوشگواریت چھائی، اس نے مجھے اطمینان دلا دیا۔ "اب منزل دور نہیں" میں نے خود کو امید دلائی اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ اس کے بعد پھوپھو کا جو اگلا چکر لگا۔ اس میں وہ خاصی سنجیدہ تھیں۔ بھائیوں میں بیٹھ کر بڑی سنجیدگی سے انہوں نے ذکر چھیڑا۔

"بھائی جان! بار بار ایک ہی بات دہرانا اچھا نہیں لگتا پھر بھی سوچا کہ دوٹوک بات کر ہی لوں۔ آخر میں پاکستان اسی مقصد کے لیے تو آئی ہوں۔ میرے پاس دو ڈھائی ماہ ہیں اور ابھی تک ایک بیٹے کی بات بھی نہیں ٹھہرا سکی۔ آپ تو میرے ساتھ بالکل غیروں والا سلوک کر رہے ہیں۔ میں آپ کی اپنی ہوں۔ بھلا مجھ سے ایسا برتاؤ کرنے کی کیا ضرورت جو کہنا ہے صاف صاف کہیے۔ میں بالکل ناراض نہیں ہوں گی۔ آخر کوئی وجہ تو ہے جو آپ ٹالے جا رہے ہیں۔"

جواب میں بڑے ابو نے بے حد شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں شبنم! تم کچھ غلط گمان مت کرنا۔ تمہارے بیٹوں میں کیا کمی ہے جو ہم بہانا

بنائیں۔ یہ سب تمہاری اپنی بیٹیاں ہیں جس پہ ہاتھ رکھو' وہ تمہاری...... بس بیلا کے معاملے میں دیر کی وجہ صرف بینا ہے۔ میں منتظر تھا کہ بینا کا بھی کوئی مناسب پیام آ جائے تو پھر ہاں کروں۔"

"پتہ نہیں بھابی نے آپ سے ذکر کیا یا نہیں بہرحال میں بتا دوں کہ میں نے تو بینا کے لیے بھی صداقت کو آگے کیا تھا' وہی نہ مانیں۔"

"ہاں شیریں نے سارا قصہ بتایا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا فیصلہ اپنی جگہ درست ہے۔"

"لیکن اب تو ماشاء اللہ شاداب کی بات بھی طے ہوگئی۔ انشاء اللہ باقی کا بھی اللہ سبب کرے گا اور اگر آپ صرف بینا کا سوچ کر تاخیر کر رہے ہیں تو...... دیکھ لیں آپ کی مرضی کہ بینا دیں یا بیلا...... دیکھیں بھائی جان! مجھے غلط مت سمجھیں' اگر میں کسی غیر کے گھر بیٹھی ہوتی تو شرم محسوس کرتی کیا بار بار بیان بدل رہی ہوں اور کبھی لیلیٰ' کبھی بیلا کبھی بینا کا نام لے رہی ہوں لیکن آپ تو اپنے ہیں۔ گھر کی بات ہے۔ صرف بیٹے ہی میرے نہیں بیٹیاں بھی میری ہیں۔ مل جل کر طے کر لیتے ہیں اس کو بھی۔ اب میں جو کہنے جا رہی ہوں' وہ ذرا غور سے سنیں۔"

انہوں نے پہلو بدلا اور کھڑکی سے لگی بیلا اور میں نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ وہی ہو جو میں نے سوچا ہے' پھپھو اپنے بیٹے کے مجبور کرنے پہ آئی ہوں......

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی بھائی جان! جب میں نے بیلا کی بات کی تو بینا تب تک منسوب تھی ورنہ قاعدے سے میں بڑی کا رشتہ ہی ڈالتی اور بڑے بیٹے کے لیے ڈالتی لیکن خیر...... اب جب سب کچھ واضح ہے میں مزید دیر نہیں کروں گی۔ میں اپنے بڑے بیٹے صداقت علی کے لیے گل بین کا ہاتھ مانگتی ہوں۔"

جو میں سننا چاہتی تھی' وہ تو اب تک پھوپھو نے نہ اگلا تھا لیکن یہ خبر بھی کم دھماکہ خیز نہ تھی۔ بڑی امی اور بڑے ابو کے چہرے جگمگا اٹھے۔ منگنی ٹوٹنے کے بعد ہمارے معاشرے میں لڑکی کا دوبارہ رشتہ جڑنا اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ پھوپھو کا یہ پیار بھرا مطالبہ انہیں جی جان سے قبول تھا۔

"صداقت اور گل بین کا جوڑ اچھا رہے گا' عمر مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے بھی اور پھر مجھے اپنی بڑی بہو کے طور پر ایسی ہی ذمہ دار' گھریلو سی اور سگھڑ لڑکی چاہیے۔"

کاش بینا نے اپنا یہ پرانا مشغلہ ترک نہ کیا ہوتا تو اپنے بارے میں اتنے اچھے تعریفی کلمات سن کر کھل جاتی۔

"اور رہا بھابی کا یہ عذر کہ وہ اپنی دونوں بیٹیاں مجھے دے کر اپنی بھتیجیوں کا حق نہیں مارنا چاہتیں تو میں ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بیلا سے دست برداری کا اعلان کرتی ہوں لیکن شجاعت کے لیے دلہن میں یہیں سے لے کر جاؤں گی' یہ دھیان رہے۔"

بیٹے کی ضد پہ بیلا کو طریقے سلیقے سے رد کرتے ہوئے انہوں نے بڑی امی پہ ساری بات ڈال دی۔ لو جی مسئلہ ہی حل' بیٹے کی خواہش بھی پوری اور کسی کو اعتراض کا بھی موقع نہ ملے گا۔ میں نے جی بھر کے پھوپھو کو داد دی۔ بیلا کو مبارک باد دینے کے بعد میں عطا کو فون کرنے مڑنے ہی والی تھی کہ فضیلہ آنٹی کی بات نے ہم دونوں کے قدم روک دیے۔

"ہر بچی اپنی قسمت لکھوا کر لاتی ہے شیریں بھابی! یہ آپ کی محبت ہے جو آپ نے ان کے بارے میں ایسا سوچا لیکن بیلا کے لیے ایک بار پھر سوچ لیں۔ کیا حرج ہے اگر دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں چلی جائیں۔"

"جہاں آپ پچھلے ایک گھنٹے سے خاموش بیٹھی تھیں' کیا ہی اچھا ہوتا اگر مزید کچھ دیر اور چپ رہتیں۔"

"بہن...... بیلا بھی کچھ رضامند نہیں ہے۔" رابعہ آنٹی نے پھوپھو کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر کہا' بڑی امی البتہ بیٹی کی سرکشی' عیاں ہونے کے خوف سے سٹپٹا کے کہنے لگیں۔

"وہ تو دراصل شبنم! بیلا نادان بہت ہے' بچپنا بہت ہے اس کے اندر سات سمندر پار جانے سے گھبرا رہی تھی۔"

"اس لیے میری رائے ہے اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے چوہدری ہاؤس میں ہی رہنے دیا جائے۔" رابعہ آنٹی کی رائے پہ بڑی امی اور بھی ہراساں ہو گئیں۔

"اے ہے رابعہ! دیوانی ہوئی ہو' وہ تو پاگل ہے' اعلان کر بیٹھی ہے مرتے مر جائے گی' یہ گھر نہ چھوڑے گی۔ کیا تم بھی اس کے ساتھ عقل گنوا بیٹھی ہو۔ ساری عمر کنواری بٹھائے رکھنا ہے اسے۔"

"میں نے یہ کب کہا بھابی! میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ اسے چوہدری ہاؤس سے نہیں نکلنے دینا اور رہی بات شادی کی تو آپ کیوں بھول جاتی ہیں کہ اللہ کے فضل سے اس گھر میں بھی ایک جوان بیٹا موجود ہے۔ کم از کم اپنی ایک بیٹی کو تو ہم سدا اپنے گھر میں رکھ سکتے ہیں۔"

رابعہ آنٹی نے تو سارا پروگرام ہی ترتیب دے ڈالا۔ ہر شخص ہلکا پھلکا سا ہو کر ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے بیلا کی طرف دیکھا۔ اس بے چاری کی تو وہ حالت ہوگئی تا کہ آسمان سے گرا' کھجور میں اٹکا...... سامنے کھائی پیچھے جنگل...... نہ اگلتے بنے نہ نگلتے...... وغیرہ وغیرہ...... سارے محاورے فٹ کرتے ہوئے جیسے ہی میں نے نظر گھمائی۔ خوشی اور شرم سے گلنار چہرے کے ساتھ وہ آنچل کا کونا دانتوں تلے لیے مسکرا رہی تھی۔

گھنی، مشینی، چالاکو............ میں نے اسے پیٹ ہی تو ڈالا۔

* * *

اور آج چوہدری ہاؤس میں چاندرات الگ ہی ڈھب سے اتری تھی۔ اس سے پہلے ان در و دیوار پہ اتنی رونق نے ڈیرا نہ ڈالا تھا اور نہ ہی کسی نے ایسی سرشاریاں دیکھی تھیں۔

مجھے اس گھر میں گزری کتنی ہی چاندراتیں یاد تھیں۔

بچپن کی وہ بھولی بھالی سی چاندراتیں بھی...... جن میں بڑی امی کے سلے چھوٹے چھوٹے زرق برق لہنگے اور بڑے پاپا کے فارن سے آئے پھولے پھولے فراک ہم سب بار بار ہاتھ لگا لگا کر دیکھتے۔

ٹین ایج کی وہی پرجوش چاندراتیں بھی تھیں' جیسی اب کائنات' سیماب اور حمنہ مناتیں' جس میں دوستوں کو دی جانے والی عیدی کی پیکنگ اور صبح ملنے والی نقد' عیدی کی چاہ تھی۔

اور پچھلی کئی چاندراتیں...... مل کر چوڑیاں چڑھانا' ایک دوسرے کو مہندی لگانا' ٹیلر کے چکر کاٹنا' بڑی امی کے بنائے شیر خرما کے لیے بادام اور پستے کی ہوائیاں کاٹنا۔

لیکن یہ چاندرات سب سے جدا تھی۔

سب سے منفرد۔

بالکل البیلی۔

اس میں چوہدری ہاؤس کی ایک نہ دو پوری پانچ بکریاں شگن کے لال دوپٹے اوڑھے بیٹھی تھیں۔

یہ شوشہ سب سے پہلے شاداب کے سسرال کی طرف سے چھوڑا گیا۔ وہ لوگ اپنی بہو کے لیے عیدی لانا چاہتے تھے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اجازت دے دی

گئی۔

یہ خبر ڈاکٹر عمر کی والدہ تک پہنچی تو وہ پیچھے کیوں رہتیں' انہوں نے بھی سارے ارمان نکالنے کا ارادہ کرتے ہوئے آنے کا عندیہ ظاہر کیا۔

لیجیے اب بھلا پھوپھو کو اپنی دونوں بہوویں کیا کم عزیز تھیں۔ وہ بھی میدان میں اتریں۔

ان کی دیکھا دیکھی رابعہ آنٹی نے بھی عطا کی دلہنیا کے لیے عید کے تحائف خرید ڈالے۔ اب چاندرات کو ایک چھوٹی سی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں تمام رشتوں کو باضابطہ طے کرتے ہوئے خاندان بھر کے چیدہ چیدہ افراد کو مدعو کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عمر رحمان اور عامر بٹ کے گھر والوں کو عید کے تین ہفتے بعد کی تاریخ دے دی گئی تھی۔ اس کے اگلے مہینے پھوپھو صداقت علی کی بارات لائیں گی جب کہ شجاعت اور عطا کو اس موقع پر منگنی پہ ہی فی الحال ٹرخایا جائے گا۔ بقایا دو شادیاں اگلے سال تک کے لیے رکھ دی گئیں۔

پنچ کلر کے خوب صورت شیفون کے شلوار قمیص میں ملبوس گل لیلیٰ آپی کتنی اچھی لگ رہی تھیں' رنگوں سے نا آشنا ان کا چہرہ ہلکے ہلکے میک اپ اور لباس پہ موجود سلور کڑھائی کی مناسبت سے پہنے جانے والے ڈائمنڈ سیٹ کے ساتھ کتنا حسین لگ رہا تھا۔

ان کے برابر بیٹھی گل بین کتنی مطمئن اور خوش نظر آ رہی تھی۔ شاداب نے اس کے بارے میں بالکل صحیح کہا تھا اسے کسی سے کوئی محبت وحبت نہیں تھی واقعی صداقت سے منسوب ہونے کے بعد وہ "سیونی میرا ماہی مینوں' ہیر بناون آ گیا" گنگناتی پھر رہی تھی۔

رائل بلیو سلک کے کرتا پاجامہ پر چنا ہوا گولڈن اور بلیو دوپٹہ لیے وہ دمک رہی تھی۔ سر پہ ہمارا روایتی سرخ آنچل تھا جو لڑکے کی ماں بات پکی ہو جانے کے بعد لڑکی کے سر پہ شگن کے طور پر ڈالتی ہے۔

شاداب سچ مچ شاداب ہی تو لگ رہی تھی' کھلے ہوئے پنک کلر کے سوٹ پہ ڈل گولڈن اور شاکنگ پنک دھاگے سے خوب صورت کڑھائی تھی۔ عروج بار بار اس کے ماتھے پہ آتی لمبی سی لٹ درست کرتی۔ سونے کے بھاری جھمکے ڈول ڈول کر اس کے رخساروں پہ سنہرے سائے لہرا دیتے تھے۔

اور وہ میسنی' گل بیلا' مہندی' ابٹن' چوڑی سے الرجک' رابعہ آنٹی کے پہلو میں دبکی کیسے کھلی پڑ رہی تھی۔ لائٹ گرین اور سی بلیو کے امتزاج سے تیار اس کا جارجٹ کا سوٹ خوب اٹھ رہا تھا۔ اس کی گندمی رنگت پہ سرخ آنچل کی پھولی پھولی اوٹ سے گھنے

گھنگھریالے بالوں کے گچھے کتنے دلکش لگ رہے تھے۔

اور یہ...... سحاب چوہدری...... لائٹ پرپل اور ڈارک گرین کے کنٹراسٹ سے سجا سفید موتیوں کے کام والا سوٹ پہنے' سفید موتی جڑا ہلکا سونے کا سیٹ پہنے' یہ...... میں ہوں سحاب چوہدری اور میرے سر پہ شجاعت علی کے نام کا آنچل پھیلا ہوا ہے۔ جی ہاں...... سب کچھ سمجھ لینے کا دعویٰ کرنے والی سحاب چوہدری' شجاعت علی کی آنکھوں کی بے تابیاں اور لبوں کی شوخ مسکراہٹیں بھانپ نہ سکی اور کشف کی راہ ہموار کرتے کرتے خود اس زکوٹا جن' قباچہ اور ڈنٹونک کے ٹریڈ مارک کے دل کی دنیا تہ وبالا کرگئی۔

جانتے ہیں کشف کا کیا ہوا...... وہ جو اس دن میں اسے پھوپھو کے سسرال لے گئی تھی نا...... تو ان کی جیٹھانی نے اپنے "چونگے کے بیٹے" پروفیسر بیٹے کے لیے اسے...... جی ہاں...... مہندی' چوڑی اور آنچل میں حصہ ور وہ بھی ہے' بس ذرا کچھ انتظار۔ بھئی آخر اگلی چاندرات کو بھی تو رونق لگنی چاہیے۔

★★★

ہم دشت تھے کہ دریا

اسے سن کر بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ناظمہ ایسا کیسے کہہ سکتی ہے اور وہ بھی میری بیٹی کے لیے...... میری زینب کے لیے...... میری ہی ماں جائی ہے وہ...... کیسے میری بیٹی کو......" وہ سوچ رہا تھا لیکن منصور کی آواز نے اس کے سوچنے سمجھنے کی باقی صلاحیتیں بھی منجمد کردیں۔

"بالکل درست فیصلہ کیا آپ نے باجی! وہ تو میرا بیٹا پھانسنے کے چکر میں تھے' میں نے صاف انکار کردیا تو آپ کو چکر دینے لگے۔ میں تو چھوٹا ہوں' مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ اچھا ہوا آپ نے کھری کھری سنا دیں بلکہ میں تو کہتا ہوں یہ بات جواب آپ کہہ رہی ہیں' وہ بھی کہہ دینا چاہیے تھی۔ آخر آپ بڑی ہیں' کہہ سکتی ہیں۔" اس نے اکسایا مگر ناظمہ نے جیسے بڑا احسان کرتے ہوئے کہا۔

"اب کیا کریں' آخر ہے تو بھائی...... اور پھر......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ شاید اس نے اب تک دوسری والی بات منصور اور فاطمہ کو نہیں بتائی تھی۔

"اور فاطمہ! تم اتنی بے فکر مت بیٹھو' کیا پتا اب بھائی جان تمہارے پاس آجائیں۔ آخر تمہارے دو دو بیٹے ہیں اور تم تو ہو ہی بے وقوف۔ ان کی مسکین سی شکل

دیکھ کے کہیں نرم نہ پڑ جانا۔'' یہ منصور کی بیوی تھی' اس کی چھوٹی بھاوج ...... اور کتنا تنفر تھا اس کے لہجے میں اپنے جیٹھ کے لیے۔ سرمد نے جھرجھری لی۔

''نہیں بھابی! وہ جانتے ہیں' میرے دونوں بیٹے زینب سے کئی کئی سال چھوٹے ہیں۔'' ہمیشہ کی کم گو فاطمہ نے جواب دیا۔

''اس گمان میں مت رہنا' عمروں کا فرق ان کے لیے کیا معنی رکھتا ہے بھلا۔''

اس نے وحشت زدہ سا ہو کے اس گھر کو دیکھا جو اس نے بڑے چاؤ سے بنوایا تھا۔ یہ سوچ کر کہ عمر بھر کی مشقت کے بعد وہ یہاں ستانے کے لیے آئے گا لیکن اس گھر کی پناہیں نہ اس کے لیے گرم جوش تھیں نہ اس کی اولاد کے لیے۔ یہ گھر پہلے بھی اس کے لیے مکان تھا اور اب بھی مکان ہی ہے...... ایک پرایا مکان۔

آج سے آٹھ سال پہلے بھی وہ اس گھر میں...... نہیں اس مکان میں آیا تھا' تب اسے بنے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا لیکن تب بھی اسے وہ کونے والا کمرہ ہی ملا تھا اور تب بھی اس کے حصے میں اتنا ہی گریز آیا تھا۔ نہیں اتنا نہیں ...... جتنا اب آیا ہے۔ اب تو یہ گریز' لاتعلقی' اجتناب اور حقارت سے ضرب کھا کھا کے کئی گنا زیادہ ہو گیا ہے......

٭ ٭ ٭

یہ تب کی بات ہے جب امریکا کے ویزے ملنا اتنے مشکل نہ ہوتے تھے' اس لیے بی اے کرنے کے بعد چار سال تک دھکے کھانے کے بعد جب اچانک اسے پہلی ہی بار اپلائی کرنے کے بعد ورکنگ ویزا مل گیا تو مارے حیرت اور خوشی کے وہ یہ تک سوچنا بھول گیا کہ ٹکٹ کا انتظام کیسے کرے گا اور وہاں کس کے پاس جائے گا۔ جاننے والوں میں دور دور تک کوئی امریکا تک نہیں پہنچا تھا' جب جی بھر کے خوش ہو لیا تو یہ فکر لے کر بیٹھ گیا کہ آخر جانے کا بندوبست کیسے ہو۔

آخر اماں نے بچا بچا کے رکھے اپنے دو کنگن اور ناظمہ کے جہیز کے لیے بنائے چند تولے کے زیورات بیچ دیے۔ ابا کا پرانا اسکوٹر بھی چند ہزار میں بک گیا۔ ناظمہ نے میٹرک کے بعد گھر بیٹھ کر ٹیوشنیں پڑھا پڑھا کے جو تھوڑی بہت رقم جمع کی تھی' وہ بھی اس کے حوالے کی۔ نہ مکان اپنا تھا نہ دکان' جسے بیچا جاتا اس لیے جو کمی رہتی تھی وہ قرضہ لے کر پوری کی گئی۔ سود پر قرضہ بھی کتنے جتنوں کے ساتھ ملا اور یوں اس نے کتنی ہی امیدوں' کتنی ہی آرزوؤں کے بوجھ کے ساتھ اس اجنبی سرزمین پر پہلا قدم رکھا۔

وہ یہاں بالکل اجنبی تھا' ایک دم انجان ...... گھبراہٹ سے سوا بے چینی تھی اور بے

چینی سے بڑھ کے لاچاری اور اس سے بھی زیادہ اذیت ناک وہ ہراس تھا جو اس کی ہڈیوں تک میں اترتا جا رہا تھا۔ ''کہاں جاؤں' کس کے پاس جاؤں' کیسے جاؤں' کہاں رہوں؟'' ایئرپورٹ سے وہ نکل تو آیا مگر اب سڑک پر کھڑا ان سوالوں سے لڑ رہا تھا۔ وہ کسی ایسے ہوٹل کے بارے میں نہیں جانتا تھا جہاں کم سے کم روپے خرچ ہوں۔ اسے اپنی جیب میں موجود معمولی سی رقم کا بھی اندازہ تھا اور یہ احساس بھی تھا کہ نہ جانے اور کتنے دن ان ہی کے ساتھ گزارا کرنا پڑے۔ کتنے ہی قصے سن رکھے تھے کالوں کی دہشت گردی کے' یہ خوف اسے سہائے دے رہا تھا کہ اگر کسی نے یہ چند ڈالر بھی ہتھیا لیے تو وہ کیا کرے گا۔ آس پاس سے گزرنے والے دیوہیکل' لمبے تڑنگے' لال لال آنکھوں والے کالوں کو دہشت زدہ سا دیکھ رہا تھا' جب ایک اور سیاہ فام نے اس کے بالکل سامنے ٹیکسی روکی۔

''کہاں جانا ہے؟'' اس کے پوچھنے پر وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا اور ساری انگریزی گھٹنوں کے بل جا گری۔ احمقوں کی طرح نفی میں سر ہلانے لگا۔ ڈرائیور نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ اس کا سر اور زور زور سے ہلنے لگا۔ وہ سیاہ فام غور سے اسے دیکھنے لگا جس پر سرمد مزید گھبراہٹ کا شکار ہو گیا۔

''او کم آن یار!'' اس کے منہ سے یار کا لفظ سن کر وہ جھٹکا کھا کے پیچھے مڑا۔ جامنی ہونٹوں سے بڑے بڑے سفید دانت نکالے' وہ شاید مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تمہیں اردو آتی ہے؟'' اس نے اپنی ہی زبان میں پوچھا۔

''میں کچھ کچھ سمجھ لیتا ہوں' بول نہیں سکتا۔ دراصل میں دو پاکی اور ایک انڈین کے ساتھ روم شیئر کرتا ہوں۔'' اب سرمد کی سمجھ میں اس کا ''یار'' کہنا آ گیا۔ اگرچہ صرف ایک جانا پہچانا سا لفظ سن لینے کے بعد کسی پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر لینا' سراسر بے وقوفی ہے مگر اسے کسی کا ہاتھ تو تھامنا تھا اس لیے اللہ کا نام لے کر' اس کی ییلو کیب میں بیٹھ گیا۔ دل میں صرف یہ امید تھی کہ اس کا واسطہ دو پاکستانیوں سے ہے' شاید ان کے توسط سے ...... ملازمت کا کچھ بندوبست ہو جائے۔ سیاہ فام نے اپنا تعارف مائیک کہہ کے کرایا تھا۔ مائیک سے اس نے التجا کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ اپنے پاکستانی دوستوں سے اس کی ملاقات کرا دے۔

''اس وقت تو مشکل ہے' سب اپنے اپنے کام دھندے پر ہیں۔ انوا تو اوور ٹائم لگاتا ہے' تم رات کو مل لینا۔ ایڈریس مجھ سے لے لو۔''

''اچھا پھر...... ایسا کرو مجھے کسی ایسی جگہ اتار دو جہاں کم سے کم کرایہ دینا پڑے۔''

''یوں کیوں نہیں کرتے کہ میرے ہی فلیٹ میں چلے چلو' روم اس وقت خالی ہوتا ہے۔تم چند گھنٹے آرام کرلو۔سعید سب سے پہلے آتا ہے' میں اس کے لیے چٹ چھوڑ جاؤں گا کہ وہ تم سے بات کرلے۔'' سرمد نے سر ہلا دیا مگر جیسے ہی ٹیکسی ایک گندی تنگ اسٹریٹ میں مڑی اس کا دل ڈوب گیا۔دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں تھیں جن میں کھڑکیاں ہی کھڑکیاں تھیں۔ ہر طرف سیاہ فام چہرے نظر آرہے تھے۔وہ اسے لے کر تنگ سی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

''ادھر لفٹ ہے مگر سالوں سے بند پڑی ہے۔'' تین منزلہ بلڈنگ کے ٹاپ فلور پر وہ دو کمروں کا مختصر سا فلیٹ تھا جس کے ایک ایک کمرے میں چار چار لوگ کرایہ شیئر کرتے تھے۔اندر داخل ہوتے ہی سامنے کی دیوار پر آویزاں قل اسے اندر تک پرسکون کر گئے۔اسے یقین آگیا کہ ضرور یہاں دو پاکستانی مسلمان رہتے ہوں گے۔اس نے بےفکری سے نیند پوری کی۔

مائیک میزبانی کے فرائض نبھاتے ہوئے اس خوامخواہ کے مہمان کو کافی کے ساتھ بسکٹ اور فش سینڈوچز بھی دے گیا تھا۔سعید اور پھر انوا سے ملنے کے بعد اس کا رہا سہا خوف بھی دور ہوگیا۔دونوں نے اس کی مدد کا وعدہ تو کیا لیکن کمرے میں مزید کسی فرد کی گنجائش نہ نکلنے کا بھی صاف صاف ذکر کر دیا۔

''یار! کام یہاں بہت ہے' محنتی بندے کے لیے تو بہت ہی زیادہ۔کل صبح ہی کسی نہ کسی اسٹور پر لگوا دوں گا۔ مجھے یہاں آئے آٹھ سال ہوگئے ہیں' ڈالر اتنے نہیں بنائے لیکن واقفیت بہت بنائی ہے' البتہ رہنے کا مسئلہ ہے۔ہمیں کیا تکلیف ہے' اگر چار کے بجائے پانچ لوگ کرایہ شیئر کریں' اپنی تو بچت ہے لیکن تم خود ہی دیکھو' کیا کمرے میں چار لوگوں کی بھی گنجائش ہے؟ آنند نائٹ ڈیوٹی دیتا ہے۔صبح صبح آتا ہے جب ہم لوگ کام پر نکل رہے ہوتے ہیں اور ہمارے آنے سے پہلے نکل جاتا ہے' اس لیے گزارا ہو رہا ہے۔اب یا تو تم بھی کوئی نائٹ ڈیوٹی ڈھونڈ لو یا پھر کوئی اور ٹھکانا۔اتنا بتا دوں نائٹ ڈیوٹی میں آمدنی ذرا نہیں' خاص طور پر کسی اسٹور میں۔''

مائیک نے اسے پارکنگ میں کھڑی اپنی ٹیکسی میں سونے کی اجازت دے دی اور ایک فالتو کمبل بھی۔سعید درست کہہ رہا تھا' دوسرے ہی روز اسے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور

کے گروسری کے شعبے میں سیلز مین کی جاب مل گئی۔کام آسان تھا' بس مسلسل کئی کئی گھنٹے کھڑے ہو کے ڈیوٹی دینا پڑتی تھی۔فی الحال نیو یارک میں ان تینوں کے علاوہ اس کا کوئی شناسا نہیں تھا' اس لیے ٹیکسی میں راتیں بسر کرلینا گوارا کرلیا لیکن دوسرے ٹھکانے کے بارے میں سوچا تک نہیں۔چند دنوں بعد جب وہ شہر سے کچھ کچھ واقف ہوگیا تو اس نے مائیک سے رات کو اس کی یلو کیب چلانے کی اجازت مانگی۔اسے حصہ دینے کی پیش کش بھی کی لیکن مائیک نے کمالِ مہربانی سے کسی قسم کی رقم کے عوض کے بغیر اسے ٹیکسی استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔

تین مہینے کے مختصر سے عرصے میں اس نے چار جگہ سیلز مین کی نوکری کی۔شام سے لے کر رات ڈیڑھ دو بجے تک وہ آرام کرتا پھر ایئرپورٹ تک اپنا ''بیڈ روم'' ڈرائیو کرکے لے جاتا۔صبح تک بعض اوقات دو تین سواریاں مل جاتیں۔گزارا ہو ہی رہا تھا لیکن ابا کا ہر خط اسے بےچین کر دیتا اور وہ ''گزارے'' کو ناکافی سمجھنے پر مجبور ہو جاتا۔قریب تھا کہ وہ مایوس ہو کے اپنے امریکہ آنے کے فیصلے کو بےوقوفی قرار دے دیتا کہ اچانک اس کی ملاقات شمسی صاحب سے ہوئی۔شمسی صاحب اس اسٹور کے مالک تھے جہاں آج کل وہ کیشیئر تھا۔وہ اس کی محنت اور سب سے بڑھ کے شرافت کے قائل ہوگئے۔امریکہ میں یہ ان کا واحد اسٹور نہ تھا بلکہ صرف نیو یارک میں ہی ان کے دو اور اسٹور' ایک پیٹرول پمپ اور ایک درمیانے درجے کا ہوٹل بھی تھا۔ان کا ہوٹل آج کل خسارے میں جا رہا تھا۔اس کے لیے انہوں نے ہائی کوالی فائڈ منیجر بھی بدل کر دیکھے مگر فائدہ نہ ہوا۔پتا نہیں کیوں انہیں لگا کہ سرمد ان کے ہوٹل کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔

جیسے ہی سرمد کو موقع ملا خود کو ثابت کرنے کا' اس نے اپنی صلاحیتوں کو آزمانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔یہ ہوٹل جس علاقے میں تھا وہاں انڈین اور پاکستانیوں کی خاصی تعداد بستی تھی جبکہ منیجر امریکن تھا اور دیگر عملہ بھی زیادہ تر مقامی ہی تھا۔سرمد نے ایسا ماحول پیدا کیا جس میں ایک ایشیائی شخص کے لیے خاصی کشش تھی۔سرمد نے انٹریر ڈیکوریشن میں ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جن سے اضافی خرچہ بھی نہ ہوا اور مشرق کے سارے رنگ واضح ہوگئے۔لوک موسیقی کی دھنیں بجنے لگیں۔ڈائننگ ہال میں مشرقی برتنوں کا استعمال شروع کیا۔رہائشی کمروں میں بھی یہی اہتمام کیا گیا۔چند ہی مہینوں میں خاصا فرق پڑا اور وہ ہوٹل نیو یارک آنے والے پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کا دل پسند

مقام ہو گیا۔

شمسی صاحب نے اسے منیجر بنا دیا۔ وہ اور دل لگا کے محنت کرنے لگا۔ اب اس نے ٹیکسی میں سونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسی ہوٹل کے ایک آرام دہ کمرے میں مقیم تھا۔ اب اس نے کافی میں ڈبو کر ڈبل روٹی کھانا بھی چھوڑ دی۔ اس کے لیے اسپیشل ٹرے سج کے ہوٹل کے کچن سے آتی۔ اس نے لمبے لمبے بینک ڈرافٹ لاہور بھیجنے شروع کر دیے' وہ مطمئن تھا۔ جس رفتار سے وہ ترقی کر رہا تھا شاید اگلے ہی سال قرضہ بھی اتر جاتا اور اس سے اگلے سال ناظمہ کی شادی دھوم دھام سے ہو جاتی اور اس سے اگلے سال منصور کا داخلہ میڈیکل کالج میں' اس کے بعد اماں ابا کے ساتھ حج کا فریضہ ادا ہو جائے گا پھر اماں کی پسند کی گئی اچھی لڑکی سے وہ شادی کرے گا اور بس کچھ سال...... کچھ سال اور دن رات محنت کر کے اتنی رقم جمع کر لے گا کہ پاکستان میں مستقل سیٹ ہو کے ایک اچھا سا گھر بنا سکے۔ ایک کاروبار شروع کر سکے۔

٭٭٭

وہ آنے والے برسوں کی پلاننگ کر کے شدید محنت کر رہا تھا' تب ہی شمسی صاحب کی بات نے اسے بوکھلا کے رکھ دیا۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کلثوم شمسی سے اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔

''کلثوم طلاق یافتہ ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پہلے شوہر سے اس کی کوئی اولاد نہیں۔ دونوں کا ساتھ چند مہینے ہی رہا۔ وہ کم بخت اس کی دولت کے چکر میں تھا اسی لیے اس معصوم کو پھنسا کے...... خیر کلثوم تب کم عمر تھی' میں نے جلد ہی اس فریبی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ پھر کئی سال کلثوم نے دوبارہ شادی کی حامی نہیں بھری لیکن میں اسے یوں دنیا کے جنگل میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ عرصے بعد میں نے کسی شخص پر بھروسا کیا اور وہ تم ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم کلثوم کے لیے بہترین انتخاب ثابت ہو گے۔''

''لیکن سر! میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میرا مطلب ہے کہ ابھی مجھ پر بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ میں بالکل خالی ہاتھ یہاں آیا تھا بلکہ اپنے مفلس باپ کو اور بھی خالی ہاتھ کر آیا تھا۔ ابھی تک تو میں بہ مشکل قرضہ اور سود ہی چکا پایا ہوں۔ میرے گھر کے حالات تو جوں کے توں ہیں۔ بہن کی شادی کرنا ہے' میرا ایک چھوٹا بھائی اور بہن زیرِ تعلیم ہیں۔ میری ماں کا برسوں پرانا خواب اپنی چھت کا ہونا ہے' مجھے انہیں کرائے کے مکان سے اپنے مکان تک لانا ہے' مجھے......'' وہ کہتا چلا جا رہا تھا کہ شمسی صاحب نے ہاتھ

اٹھا کے روک دیا۔

''یہ تو بہت لمبا پروگرام ہے اور اگر تم سوچ رہے ہو کہ یہ سب کرنے کے بعد تم اپنا گھر بساؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ تم بوڑھے ہو جاؤ گے سرمد! لیکن ذمہ داریوں کا یہ بوجھ کم نہ ہوگا۔ زندگی پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ تمہارے خاندان کا' تم اپنے حصے کی خوشیاں سمیٹتے ہوئے بھی یہ فرض ادا کر سکتے ہو۔''

''لیکن دوہری ذمہ داریاں۔'' اس نے ایک اور عذر پیش کرنا چاہا لیکن شمسی صاحب نے ایک بار پھر مداخلت کی۔

''کیسی ذمہ داری؟ کلثوم سے شادی کے بعد تمہارا بوجھ بڑھے گا نہیں بلکہ کم ہوگا۔ ظاہر ہے ظہور احمد شمسی کا داماد ایسا ویسا شخص تو ہوگا نہیں' تم صرف اس ہوٹل کے منیجر نہیں بلکہ مالک ہو گے۔ یہاں نہیں میرے ولا میں رہو گے۔ جو کام تم کئی سالوں میں کرو گے وہ چند مہینوں میں ہو جائے گا اور ذرا سوچو کہ اگر کسی وجہ سے یہ ملازمت بھی نہ رہی تو کیا پھر سے راتوں کو ٹیکسیاں چلاؤ گے؟''

شمسی صاحب نے اسے لالچ میں گھیرنے کے ساتھ ساتھ ڈراوا بھی دیا۔ وہ خاموش ہو گیا اور چند ہی دنوں بعد کلثوم احمد شمسی کا شوہر بن گیا۔

کلثوم جو کم کے نام سے مشہور تھی جس کا باپ پاکستانی تھا اور ماں کوئی غریب امریکن سیاہ فام عورت تھی جس نے شادی کے چھٹے مہینے بعد ہی طلاق لے لی تھی اور پھر دو دن کی کلثوم کو اس کے باپ کے پاس چھوڑ کے خود اپنے بوائے فرینڈ کے فلیٹ پر واپس چلی گئی تھی' تب کراچی سے نئے نئے آنے والے ظہور احمد شمسی کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا ورنہ شاید وہ ایسا تگڑا شوہر کبھی نہ چھوڑتی۔ پھر ظہور احمد دن بدن ترقی کرتا شمسی صاحب بن گیا اور سانولی سی' موٹے نقوش والی کلثوم بھی جوان ہو گئی۔ حالات بدلتے ہی اس کی شرابی بیوی نشے میں دھت ایک بار پھر اس کے پاس آئی تھی لیکن اس نے اپنی بیٹی کو اس کے سائے سے بھی محفوظ رکھنے کی خاطر اس کا منہ سختی سے بند کر دیا۔ وہ بھی چند سو ڈالر ماہوار کے عوض خاموش ہو کے بیٹھ گئی۔ اس کی شراب کا خرچہ نکل آیا' اس نے خوب پی اور ایک دن اسی عالم میں مر گئی۔

شمسی صاحب نے بیٹی پر شدید سختی رکھی' وہ یہاں کے ماحول سے بھی خوف زدہ تھے اور کلثوم کی رگوں میں دوڑتے اس کی بدقماش ماں کے خون سے بھی خائف تھے لیکن کاروبار کی مصروفیات انہیں بیٹی کی طرف مکمل توجہ رکھنے سے روکتی تھیں۔ ابھی وہ سولہ

سال کی ہی ہوئی تھی کہ ایک بنگلہ دیشی مسلمان عنایت اللہ کے عشق یں گرفتار ہوگئی۔

شمسی صاحب اچھی طرح جانتے تھے ان کی بیٹی معمولی شکل وصورت کی ہے' یہ گنجا ہو نہ ہو بیٹی کے ذریعے باپ کی دولت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے لیکن وہ بیٹی کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ اس خوف سے اس کی شادی تو کردی لیکن ساتھ ساتھ داماد کی انکوائری بھی جاری رکھی اور جیسے ہی ڈھاکہ میں موجود اس کی دو بیویوں اور سات بچوں کی خبر ملی بیٹی کو مطلع کیا اور پہلی فرصت میں طلاق دلوادی۔

رِکم یعنی کلثوم اس واقعے کے بعد حد درجہ دل برداشتہ ہوگئی۔ اس نے کالج میں ایڈمیشن لے لیا اور شادی کا تجربہ دہرانے سے صاف انکار کردیا۔ کئی سال تک شمسی صاحب نے بظاہر اسے اس کے حال پر چھوڑے رکھا لیکن اصل میں وہ اندر ہی اندر اس کا گھر بس جانے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا سب کچھ ان کی بیٹی کو ہی ملے گا اور ظاہر ہے کہ جو بھی شخص ان کا داماد بنے گا' یہ کاروبار اسے ہی سنبھالنا ہے' پھر کیوں نہ وہ خود دیکھ بھال کے ایسا شریف' محنتی' قابل بھروسا اور مجبور شخص تلاش کریں جو ان کی بیٹی کے ساتھ ساتھ ان کا بھی سہارا بنے۔ داماد کا مجبور اور شریف ہونا ان کی اولین ترجیح تھا۔ سرمد میں انہیں یہ ساری خصوصیات نظر آئیں۔ تھوڑے سے پس وپیش کے بعد رِکم بھی مان گئی۔

شمی صاحب نے سرمد کو اپنی فرزندی میں لینے کا ایک شرائط نامہ اس کے سامنے پیش کیا۔

سب سے پہلے تو یہ کہ سرمد ان کے جیتے جی ان ہی کے مکان میں ان کی آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ وہ تمام مراعات کا حق دار بھی ہوگا اور اسے ان کا داماد ہونے کا پروٹوکول بھی ملے گا مگر وہ بدستور ایک تن خواہ دار کی حیثیت سے کام کرے گا۔

اس کا پاسپورٹ ان کے پاس رہے گا' وہ نیویارک سے باہر جانے کے لیے اپنے سسر کی اجازت کا پابند ہوگا۔

وہ ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کرے گا۔

ہر ماہ اس کے نام سے پاکستان ایک معقول رقم بھیج دی جائے گی۔

اس نے سر جھکا کے یہ ساری شرائط مان لیں۔ تن خواہ ایک طرح کا جیب خرچ ہی تھا کیونکہ اس کی رہائش' کھانا پینا' پہننا اوڑھنا سب ''فری'' تھا۔ پاکستان بھی اچھی خاصی رقم جانے لگی تھی' ہاں البتہ پاسپورٹ ان کے حوالے کرتے ہوئے وہ ذرا ہچکچایا تھا لیکن

پھر یہ سوچ کے دل کو تسلی دے لی کہ ''شمسی صاحب بیٹی کے حوالے سے حساس ہیں۔ پہلے تلخ تجربے نے انہیں محتاط کردیا ہے لیکن جلد ہی وہ مجھ پر بھروسہ کرنے لگ جائیں گے۔ ویسے بھی اگر میں یہ شادی نہ بھی کرتا تو کون سا ابھی پاکستان جاسکتا تھا۔''

پہلے اس نے یہی سوچا تھا کہ اپنی شادی کو گھر والوں سے خفیہ رکھے' کیا پتا یہ بیل منڈھے ہی نہ چڑھے اور کلثوم جلد ہی اسے فارغ کردے لیکن پھر وہ زیادہ دیر تک اس ارادے پر قائم نہ رہ سکا اور اس نے پاکستان اپنی شادی کی اطلاع تصاویر کے ذریعے بھجوا دی۔ وہی ہوا جس کا اسے خدشہ تھا۔ اماں ابا نے جی بھر کے صلواتیں سنائیں۔

''تجھے کمانے بھیجا تھا یا بیاہ رچانے۔ نالائق کیسے کیسے جتن کرکے ٹکٹ کا انتظام کیا اور تو وہاں گھر داماد بن کے بیٹھ گیا۔ ارے پالا پوسا ہم نے اور کمائی کھائیں دوسرے۔''

ابا کی دہائی کے جواب میں اس نے بہ مشکل وضاحت پیش کی۔

''ابا! میں گھر داماد ضرور ہوں مگر وہ میری کمائی کے محتاج نہیں۔ الٹا میری یہ ملازمت ان کی عطا کردہ ہے۔ یہ سارے عیش' یہ ڈالرز......''

''تو یوں کہہ کہ تو نے خود کو بیچ دیا۔'' ابا کچھ سننے پر تیار نہ تھے۔ وہ بے بسی سے ریسیور ہاتھ میں لیے ان کی جھڑکیاں سنتا رہا۔

''اس سے تو ہم فاقوں مرتے اچھے تھے۔ بڑھاپے کا سہارا گروی ہوگیا۔ گلی محلے میں لوگ طعنے دیں گے۔ بھٹی صاحب کا بیٹا گھر داماد ہوگیا ہے۔ سسر کا کتا بن گیا ہے۔''

''تو نے تو میرا کلیجہ ہی نوچ لیا سرمد! تجھے یہی ڈائن ملی تھی میری بہو بنانے کے لیے۔'' اماں کو الگ ہی شکایت تھی۔ ''کتنے ارمان تھے میرے کہ اپنے لاڈلے کے لیے چاند سی دلہن لاؤں گی۔ کتنی لڑکیاں میری نظر میں ہیں۔ پر تجھے تو لگتا ہے ماں پر اعتبار ہی نہیں تھا۔ تیرا خیال ہوگا ماں کھانے نوچنے کو ہی بیٹھی رہے گی۔ تجھے بڈھا کردے گی اس لیے خود ہی ''چن چاڑ'' (چاند چڑھا) لوں بے ہدایتا! اتنا ابال اٹھ رہا تھا تو ذرا دیکھ بھال کے لڑکی چنتا۔ اس سے اچھی بلکہ ہزار درجے اچھی تو برادری میں ہیں۔ کتنے لوگوں کی نظر تجھ پر تھی۔ پر تو نے تو پتا نہیں کیا دیکھا۔ نہ منہ' نہ متھا جن پہاڑوں لتھا۔''

''اماں! وہ دل کی اچھی ہے۔'' وہ تسلی دینے کو بولا حالانکہ اس کی جانے بلا کہ کلثوم شمسی کا دل برا ہے کہ بھلا۔

''دل کا اچار ڈالوں گی' دل تو وہاں امریکا لیے بیٹھی ہے۔ یہاں تو یہ اندھیری اندھیری تصویریں آئی ہیں۔ لوگوں کو تو یہی دکھانی ہیں۔ کوئی دل تو چیر کے نہیں دکھانا۔ سو

سو باتیں کریں گے برادری والے۔"

ناظمہ اور فاطمہ کو بھی یہی گلے تھے۔

"یہ کیسی بھابی ہے؟ ہم تو خوش ہوئے تھے میم بھابی آئے گی۔ بھائی کے گورے گورے' گلابی گلابی سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والے بچے ہوں گے۔ یہ تو چک جھمرہ کی رہنے والی لگتی ہے۔ کسی اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کرنے والی۔ آپ کہہ رہے ہیں مسلمان ہے' پاکستانی ہے لیکن یہ تو ویسٹ انڈیز کی لگ رہی ہے۔"

منصور نے مشورہ دیا۔

"چلیں بھائی جان! جو ہونا تھا ہو گیا' بس مال بٹوریں اور دفع کریں۔ جتنی جلدی سمیٹ سکیں' سمیٹ لیں۔ اماں ابا تو بھولے ہیں۔ میں سب سمجھتا ہوں کبھی کبھی شارٹ کٹ استعمال کرنا پڑ جاتا ہے' کوئی بات نہیں...... بس کوشش کریں کم سے کم وقت میں اس کا سب کچھ اپنے نام کروالیں۔"

اسے ہنسی آ گئی۔ منصور...... اس کا چھوٹا بھائی...... دو ڈھائی سال میں ہی کتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اسے مشورے دے رہا تھا۔ عقل مند بننے کی کوشش کر رہا ہے...... یہ نہیں جانتا ہاتھ بندھے ہوں تو عقل بھی کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ یہ امریکا ہے' یہاں کوئی اتنا احمق یا الو کا پٹھا نہیں بیٹھا جسے وہ لوٹ لے۔ وہ لٹنے آیا ہے لوٹنے نہیں اور پھر جب پیسہ بھی ہو تو ظاہر ہے کون ہے جو کسی اختیار والے اور پیسے والے کو بدھو بنا سکے۔ وہ یہ سب اسے بتا نہیں سکا۔ یوں بھی اب اسے زیادہ بولنے کی عادت نہیں رہی تھی۔

کم' زیادہ بولنے والوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ تو شاید اسے بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ سرمد بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن...... وہ اس کی طرح اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرنے کا اختیار نہیں رکھتا تھا۔ حد سے زیادہ سنجیدہ مزاجی کے ساتھ ساتھ چڑچڑا پن بھی کم کی عادت میں شامل تھا۔ بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ مشتعل ہو جاتی تھی۔ سرمد کو اس کے سامنے خاصا محتاط ہو کے رہنا پڑتا۔ شروع دنوں میں اس نے اپنی محبت اور توجہ کے بل بوتے پر اسے رام کرنے کی بڑی کوشش کی حالانکہ یہ اس کے لیے خاصا مشکل تھا' وہ کوئی گلفام نہیں تھا لیکن ایسا گیا گزرا بھی نہ تھا۔ اٹھائیس سال کا بھرپور جوان تھا۔ اونچا لمبا' گندمی رنگت' سیاہ آنکھوں اور سیاہ سلکی بالوں والا...... اس کی پرکشش پرسنالٹی اور مشرقی مقناطیسیت کا شکار ہو کے کئی لڑکیاں اس پر مرتی تھیں لیکن شمسی صاحب کے جاسوسوں کے خوف سے وہ ان کی حوصلہ افزائی کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ عمر کے تقاضے اسے رنگینی

کی طرف مائل کرتے مگر وہ دل مسوس کر خود کو کلثوم کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا جس میں کسی بھی مرد کے لیے ذرہ برابر کشش نہیں تھی لیکن اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کا رویہ سرد اور انداز لیا دیا ہی رہا۔ سرمد کو سوچ سوچ کر حیرت ہوتی۔ وہ بنگالی عنایت اللہ کیسے اس پتھر کے دل میں شگاف ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

سرمد سوچتا...... احساسِ محرومی کی شکار اس عورت کو اگر محبت اور توجہ ملے تو شاید زندگی کچھ سہل ہو جائے' اس کی بھی اور میری بھی۔ اس نے کئی بار فون پر ماں اور بہن سے دبے دبے لفظوں میں درخواست کی کہ وہ اس کی بیوی کے لیے کبھی کبھار پاکستانی کپڑے اور زیور وغیرہ تحفتاً بھجوا دیا کریں لیکن جواباً اماں نے مذاق اڑایا۔

"لو...... اب وہ محمد علی کلے غرارہ پہنے گی؟ آئے ہائے اس پر زیور لادنے سے تو بہتر ہے کسی بن مانس کو نتھ ٹیکا لگا دو۔" وہ چپ کر جاتا۔

وقت کچھ اور گزر گیا تھا۔ اپنی شادی کے آٹھ ماہ بعد ہی اس نے ناظمہ کی شادی کروا دی تھی۔ اسے بہن کی شادی پر جانے کی اجازت نہ ملی مگر اسے افسوس نہ ہوا۔ اسے اعتراف تھا کہ محض اپنے بل بوتے پر اتنی شان و شوکت سے بہن کبھی نہیں بیاہ سکتا تھا۔ شمسی صاحب کی عنایات کی بدولت ہی اس نے پچھلے چند مہینوں میں پاکستان میں پیسوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔

اب اسے کم سے محبت جتانے میں زیادہ محنت نہ کرنا پڑتی۔ جیسے ہی اس کے دل نے بغیر منافقت کے اسے چاہنا شروع کیا' وہ بھی نرم پڑنے لگی۔ کیا تھی وہ...... محض ایک عورت...... اور عورت کو نرم پڑنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے البتہ اس کے اندر کی خودسری بہ دستور قائم تھی۔ فرق صرف یہ پڑا تھا کہ اس نے اب اسے اپنا شوہر تسلیم کر لیا تھا اور احسان مندی کے جذبے سے مغلوب سرمد کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ شادی کے تیسرے سال اسے اسامہ کے ذریعے بیٹے کی خوشی ملی۔ اسامہ ہوبہو سرمد کی تصویر تھا۔ ہاں البتہ اس کا رنگ باپ کی بہ نسبت زیادہ صاف تھا۔ اس نے اس کی ڈھیروں تصاویر پاکستان بھجوائیں۔

"خدا کا شکر ہے' میرا پوتا ماں پر نہیں پڑا۔" اماں نے فوراً فون کر کے مبارک باد کچھ اس انداز میں دی۔

"اور بس...... اب مزید اولاد کی ضرورت نہیں...... یہ ڈائن ایسے ہی زنجیروں میں کس کے تجھے باندھنا چاہتی ہے اور ذرا سوچ...... خدانخواستہ اگر اب کی بار بیٹی ہو گئی اور

وہ بھی ماں کی شکل کی تو تو کیا کرے گا۔ کیا اپنے سسر کی طرح کوئی گھر داماد ڈھونڈے گا۔ بس اب خاندان میں یہ ریت ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ ایک تو ہی کافی ہے۔''

وہ ہمیشہ کی طرح اسے گھر داماد ہونے کا طعنہ دینا نہیں بھولی تھیں اور وہ بھی ہمیشہ کی طرح جز بز ہو کے رہ گیا۔

* * *

منصور نے ایف ایس سی میں واجبی سے نمبر لیے۔ سرمد کو خاصی مایوسی ہوئی۔ اس نے بھائی کو دوبارہ سے امتحان دینے پر رضامند کرنا چاہا لیکن وہ نہ مانا۔

''چھوڑیں بھائی جان! کیا رکھا ہے ڈاکٹری میں' اتنے سال کی مغز ماری کے بعد بھی نری خواری' گلیوں میں رُلتے پھر رہے ہیں ڈاکٹر۔''

''تو پھر تم کیا کرنا چاہ رہے ہو' انجینئرنگ لائن کی طرف آ جاؤ یا پھر کمپیوٹر کی فیلڈ میں خاصا اسکوپ ہے۔''

''صاف بات یہ ہے بھائی جان کہ یہ سب میرے بس سے باہر ہے۔ مجھے پاکستان اور یہاں ملنے والی ٹکے ٹکے کی ملازمتوں سے سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ بس آپ مجھے اپنے پاس بلوا لیں۔ اتنے سال ہو گئے ہیں آپ کو اور آپ کے تو سسر کی بھی بڑی پہنچ ہے' ان سے کہیں مجھے اسپانسر کر لیں۔'' اس کی فرمائش پر سرمد ہکا بکا رہ گیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو منصور! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے جو تم مشقت کی اس بھٹی میں خود کو جھونکنا چاہتے ہو۔ میرے بھائی یہ فریب نظر کے سوا اور کچھ نہیں' سراسر سراب ہے۔ امریکا کی چکاچوند پر مت جاؤ۔ تم اتنے لاڈ پیار میں پلے ہو' یہ سخت زندگی تمہارے بس سے باہر ہے۔ یاد نہیں میرا کیا حال ہوا تھا۔ کیا سب بھول گئے جو میں نے بتایا تھا کہ کس طرح ایک وقت کے کھانے پر چوبیس گھنٹے گزارتا تھا۔ کیسے دو گھنٹے کی نیند پوری کرنے کے لیے کسی کی ٹیکسی میں دوہرا ہو کے لیٹتا تھا۔'' وہ کرب سے بولا۔

''بھائی جان! آپ کی بات اور تھی' جب آپ وہاں گئے کوئی آپ کا جاننے والا نہیں تھا لیکن میرا تو اپنا سگا بھائی وہاں سیٹل ہے یا آپ مجھے اپنے ساتھ رکھنے سے صاف انکار کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے یہی بات ہو گی۔ ہاں ظاہر ہے جو گھر آپ کا اپنا نہیں وہاں آپ بھائی کو کیسے رکھ سکتے ہیں۔ آپ تو خود گھر داماد ہیں۔''

ایک بار پھر اس طعنے نے اسے کھولا کے رکھ دیا لیکن وہ غصے کا اظہار کرنا بھول چکا تھا۔ اس نے گزرے سالوں میں صرف ایک فن پر عبور حاصل کیا تھا اور وہ تھا صبر کے

گھونٹ پینا اور دل میں اٹھتے جوش کے ابال کو ٹھنڈا کرنا۔

''یہاں رہ کے کیا کروں؟ ڈگریاں لے کر جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں لوگ۔ آپ کیا جانیں' ادھر حالات کتنے خراب ہیں۔ سرکاری ملازمتیں رشوت دے کے ملتی ہیں اور تنخواہ...... اس کا تو پوچھیں ہی مت۔ پرائیویٹ ادارے والے ویسے بھی تجربہ اور بیرون ملک کی کسی یونی ورسٹی کی ڈگری مانگتے ہیں۔ یہاں تو وہی رہ سکتا ہے جس کے پاس کم از کم اتنا سرمایہ ہو کہ وہ بڑے پیمانے پر کوئی کاروبار شروع کر سکے۔''

''تو......'' اس نے گہرا سانس لیا۔ ''تو پھر کیا ارادہ ہے؟ کیا کاروبار کرنا چاہتے ہو تم؟''

''پینوراما میں میرے دوست کاشف کے ڈیڈی کی چلتی ہوئی لیدر گارمنٹس کی دکان بک رہی ہے' اگر اٹھارہ بیس لاکھ ہوں تو میں مال سمیت دکان خرید لوں۔''

''اٹھارہ بیس لاکھ......؟ اتنی رقم۔'' وہ بھائی کی طرف سے لاکھ دو لاکھ کی فرمائش کی توقع کیے بیٹھا تھا اور اس نے اکٹھا ہی بیس لاکھ مانگ لیے۔

''ہاں تو پینوراما میں دکان خریدنا کیا آسان بات ہے اور پھر اس دکان کی ساکھ بہت اچھی ہے۔ بڑا نام ہے مارکیٹ میں۔ آپ جتنا بھیج سکتے ہیں بھیج دیں' باقی میں قرضہ لے لوں گا۔'' اس کے لہجے میں قطعیت جھلک رہی تھی۔

سرمد نے چپ چاپ آٹھ لاکھ روپیہ جو اس نے اپنی تنخواہ میں سے بچایا تھا بھیج دیا۔ باقی منصور نے سود پر قرضہ لے لیا اور ظاہر ہے یہ قرضہ بھی اسے ہی اتارنا تھا۔ ابا نے صاف صاف کہہ دیا۔

''تم جو رقم ماہانہ خرچے کے لیے دیتے ہو اس سے تو ہم مشکل سے گزارا کرتے ہیں' اس کے قرضے کا سود کہاں سے دیں۔ تم نے ہی مشورہ دیا تھا' تم نے ہی راہ دکھائی تھی' تم ہی بھگتو۔''

''میں نے؟ میں نے کب کہا' وہ تو خود تلا بیٹھا تھا۔ سب سوچ سمجھ کے ہی اس نے مجھ سے بات کی تھی اور...... اور پچیس ہزار میں آپ کا گزارا کیسے نہیں ہوتا۔ اب تو منصور بھی کمانے لگا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ لوگ بہت کچھ بچا لیتے ہوں گے۔'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''بہت اچھے؟ کیا منصور اور کیا اس کی کمائی؟ دو تین مہینے تو ہوئے ہیں اسے دکان سنبھالے اور تم ابھی سے ہاتھ کھینچنے کی بات کر رہے ہو۔ حساب کتاب مانگ رہے ہو تو پھر

سنو...... اب میں اس پندرہ سو کرائے والے مکان میں تو نہیں رہتا' تمہارا ہی مشورہ تھا کہ ناظمہ کا اچھی جگہ رشتہ کرانے کے لیے اچھے علاقے میں رہائش اختیار کریں۔ سمن آباد کی اس کوٹھی کا کرایہ ہی سات ہزار ہے۔ گھر میں دو دو ٹی وی چلتے ہیں' فریج ہیں اور اب اس سال ایئر کنڈیشنر بھی لگ گیا ہے۔ اسی حساب سے بجلی کا بل آتا ہے۔ گیزر لگوا لینے کے بعد گیس کا بل بھی بڑھ گیا ہے۔ فاطمہ اب کالج جانے لگی ہے' اس کی فیس' ویگن کا کرایہ...... کچن کے اخراجات...... مجھ بیمار کی دوا دارو...... مہمان داری...... پچیس ہزار ایسے اڑتے ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا۔''

وہ ہمیشہ کی طرح چپ کر گیا۔ شمسی صاحب سے دبے الفاظ میں خرچہ بڑھانے کی بات کی۔ پاکستان میں دن بدن بڑھتی مہنگائی کا رونا رویا۔ انہوں نے بغیر کسی اعتراض کے نہ صرف پاکستان بھیجے جانے والے ڈرافٹ میں دس ہزار کا اضافہ کر دیا بلکہ اس کی تنخواہ بھی دگنی کر دی۔ وہ ممنون ہو گیا حالاں کہ وہ اس سے کہیں زیادہ کا مستحق تھا۔

شمسی صاحب اس سے جتنی محنت لے رہے تھے' وہ کسی ایک بندے کا کام نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کی کم رو اور بدمزاج بیٹی کو بھی خوش دلی سے بھگت رہا تھا۔ یہ احسان کیا کم تھا لیکن وہ الٹا ان کا احسان مند ہو جاتا۔

بے وفائی اس کے خمیر میں نہ تھی اور احسان فراموشی اس کے ضمیر کو گوارا نہ تھی۔ وہ یوں ہی کولہو کا بیل بنا رہا۔ کلثوم کو خوش اور شمسی صاحب کو مطمئن کرنے کے لیے بے دام کا غلام بننے کو بھی تیار تھا۔ دوسری طرف خود پر لگے گھر داماد کے لیبل سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے پاکستان بھیجے والی رقم میں اپنی جانب سے بھی اضافہ شروع کر دیا۔

اس کی جیب عموماً خالی ہوتی۔ اگرچہ وہ ایک بڑے ولا میں رہتا تھا۔ عمدہ کھانے کھاتا تھا' عالی شان آفس میں بیٹھتا تھا' لمبی سی گاڑی میں سفر کرتا تھا لیکن اس کی جیب خالی ہوتی تھی اور وہ یہ بات کسی پر ظاہر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے ظاہر نہ کرنے کے باوجود نہ جانے کس طرح کم کو اندازہ ہو گیا شادی کے اتنے سالوں بعد اچانک اس نے سرمد کے لیے ذاتی شاپنگ کرنا شروع کر دی۔ عرصے سے اس نے کپڑے نہیں خریدے تھے۔ اس کے پاس رقم بھی نہ ہوتی تھی۔ کم نے اس کے لیے شوز' ٹائی' شرٹس' ٹراؤزرز کا ڈھیر لگا دیا۔ وہ ممنون ہو گیا...... بلکہ وہ تو تھا ہی ممنون' ممنونیت کا یہ احساس ہر وقت اس کی آنکھوں سے' اس کے لہجے سے چھلکتا رہتا اور

کلثوم یعنی کم جھنجلا جاتی۔ اسے شروع شروع کے دنوں کی وہ محبت یاد آئی جو کبھی ان آنکھوں اور لہجے سے چھلکتی تھی۔ اسی محبت کی نرماہٹ محسوس کر کے اس نے اپنے پتھر دل کو موم کیا تھا کہ وہ شخص پھر سے ایک کٹھ پتلی بن گیا۔ سر ہلانے' احکام بجا لانے والی ایک کٹھ پتلی۔

کبھی کبھی اس بے جان کٹھ پتلی میں زندگی کی کوئی رمق پیدا کرنے کے لیے وہ حد سے گزر جاتی' اتنی ترش اور سفاک ہو جاتی کہ وہ سفید پڑ جاتا پھر سرخ لیکن نہ اس کی آنکھیں اٹھتیں نہ لب کھلتے۔ کم کو سرمد پر غصے کے ساتھ ساتھ ترس آ جاتا۔ اصل شکایت تو اسے اپنے باپ سے تھی جس نے اسے شوہر کے بجائے ایک ملازم تحفتاً دیا تھا۔ پہلے پہل وہ اس غلام کو پا کے مطمئن تھی۔ اپنے حاکمانہ مزاج کی تسکین کرتی رہی لیکن پھر اسامہ نے اس کے اندر کی عورت کو جگا دیا اور عورت جب جاگ جائے تو سب سے پہلے پیار مانگتی ہے۔ اسے بھی پیار چاہیے تھا لیکن اسے مانگنا نہیں آتا تھا جبکہ سرمد...... اسے پیار کرنا تو آتا تھا اور شادی کے اولین دنوں میں اس نے کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر کم کے سرد رویے سے سہم کے خود کو محدود کر لیا۔ اب اسے محبت جتانے کی جسارت کرنا خاصا دشوار لگتا۔

✯✯✯

زندگی اسی ڈھب پر گزر رہی تھی کہ ابا نے اسے منصور کی شادی کی اطلاع دی۔ وہ سخت دل برداشتہ ہو گیا۔

''منصور کی شادی ہو گئی اور آپ اب مجھے بتا رہے ہیں' کیا میں اتنا غیر ہو گیا ہوں؟''

''بیٹا! ہمیں تو خود اب پتا چلا ہے۔ یہ شادی تھوڑی ہی ہے' عشق کا بخار چڑھ گیا تھا۔''

''کیا مطلب؟ آپ اس بارے میں کیا بالکل کچھ نہیں جانتے تھے؟''

''میں تو واقعی لاعلم تھا۔ تمہاری اماں نے اب بتایا ہے کہ اس نے سرسری سا ذکر کیا تھا کہ وہ کسی نرس کو پسند کرتا ہے لیکن ماں کے صاف انکار پر چپ سادھ لی اور یوں چپ چپاتے ہی شادی بھی کر لی۔''

سرمد خاموشی سے سنتا رہا' اسے اماں کے دکھ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ دوسرے بیٹے نے بھی من مانی کر کے ان کی آخری امید بھی توڑ دی تھی۔ کتنے ارمان تھے ان کے دل

میں من پسند بھولا نے کے۔

''آپ کو اس کی بات مان لینا چاہیے تھی۔ تب وہ اس انتہائی قدم کے بارے میں نہ سوچتا۔''

''بتا تو رہا ہوں اس نے مجھ سے ذکر کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ ماں نے جواب دے دیا اور اس نے اپنی کر لی۔ وہ بھی پاگل عورت ہے' ایک بار مجھے بتا دیتی' میں خود ہی نمٹ لیتا منصور سے۔''

''لیکن اماں کو آخر اعتراض کس بات پر تھا۔ اب جو بھی ہے آخر وہ آپ کی بہو ہے۔ اسے قبول کر لیں تاکہ منصور بالکل ہی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔''

''سب سے بڑا اعتراض تو یہ کہ وہ غیر مسلم ہے۔ تمہاری ماں بھلا کسی عیسائی بہو پر کیسے مانتی۔ ٹھیک ہے کہ شادی سے پہلے اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اب اس کا نام تمہارے بھائی نے عمرانہ رکھا ہے لیکن ہمارے خاندان کو تو داغ لگ گیا ناں۔''

''منصور نے آخر ایسی حرکت کی کیسے؟''

''کیوں نہ کرتا' تم نے راہ جو کھول دی برخوردار! اس کی ہمت تو بڑھنا ہی تھی۔''

وہ اس الزام کی مار سہہ نہ سکا۔

''ابا جی! آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ یہ سب میں نے اپنے لیے نہیں کیا' صرف اور صرف اپنے خاندان کی خوش حالی کے لیے کیا۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ شمسی صاحب نے مجھے جو ملازمت دی میں کسی بھی طرح اس کا اہل نہ تھا۔ مجھ جیسے تو ایسے ہوٹلوں میں بیرا گیری کرتے یا فرش پر پوچھا لگاتے نظر آتے ہیں' اگر میں ان کی بیٹی سے شادی کر لینے سے معذرت کر لیتا تو وہ مجھے کھڑے کھڑے فارغ کر دیتے اور محض سیلز مینی کر کے اور پرائی ٹیکسی مانگ تانگ کے چلانے کے بعد میں یہ گھر اس طرح نہیں بھر سکتا تھا' جیسے اب آپ کو نظر آ رہا ہے بلکہ اب تک تو شاید میں وہ قرضہ تک نہ اتار پاتا۔''

''ہاں بیٹا! جتا لو تم بھی...... جتنے احسان کیے ہیں وہ سب جتا لو۔ میں زندہ کس لیے ہوں تمہارے احسانوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے ہی تو زندہ ہوں۔'' ان کی آواز میں غصہ بھی تھا اور افسردگی بھی۔ سرمد شرمندہ ہو گیا۔

''خدا کی قسم ابا جی! میرا مقصد آپ کو دکھی کرنا نہیں تھا' میں تو صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ آپ منصور کے اس اقدام کا ذمہ دار مجھے نہیں ٹھہرا سکتے۔ اس نے یہ حرکت صرف

اپنے دل اور جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کے کی ہے۔ صرف اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جب کہ میں...... میں تو بھول ہی چکا ہوں کہ میرا کوئی دل بھی ہے۔'' وہ رندھے گلے کے ساتھ کہتا رہا لیکن دوسری طرف شاید فون رکھ دیا گیا تھا۔ وہ بے بسی سے ریسیور کو دیکھتا رہا۔

چند دنوں بعد اس نے پھر سے فون کیا۔ مقصد اماں کی دل جوئی کرنا تھا جو یقیناً منصور کی حرکت کے بعد بے حد ملول اور دل گرفتہ ہوں گی لیکن اس کی توقع کے برعکس وہ چہک رہی تھیں۔

''اچھا ہوا تمہارا فون آ گیا' میں تمہارے ابا سے کہہ ہی رہی تھی کہ کال بک کروائیں۔''

''خیر تو ہے؟''

''ہاں ہاں' خیر ہی ہے۔ ماشاء اللہ سے تمہارے بھائی کا ولیمہ کر رہے ہیں ہم لوگ' تم آ تو نہیں سکتے لیکن اطلاع کرنا تو ضروری ہے۔''

''ولیمہ؟'' وہ متعجب تھا...... اتنی جلد اماں نے اسے معاف کیسے کر دیا لیکن پھر خود پر قابو پا کے پوچھنے لگا۔ ''اماں! کیا آپ منصور کو گھر لے آئیں......؟ چلیں اچھا کیا' بڑوں کو ہی کشادہ دلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے لیکن اماں......! یہ سب...... یہ سب ہوا کیسے؟''

''ہاں تو بیٹا اور کیا کرتے' جوان خون ہے' ایک بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے' وہ تو گھر داماد بن کے اپنا آپ گروی رکھ بیٹھا۔ دوسرا گنوانے کا حوصلہ نہ تھا اور وہ کوئی اپنی مرضی سے مجھ سے دور تو نہیں ہوا تھا' میری ناراضی کے خوف سے چلا گیا تھا۔ شادی اپنی مرضی سے بے شک کی ہے لیکن گرہستی الگ نہیں کرنا چاہتا۔ میرے ایک بلاوے پر بیوی کو لیے بھاگا آیا۔'' وہ اسے نہ جانے کیا جتا رہی تھیں' وہ جان کر بھی انجان بنا رہا۔

''اور پھر دلہن...... کیا بتاؤں کتنی خوب صورت ہے' چاند کا ٹکڑا ہے۔ ہیرا ڈھونڈ نکالا ہے میرے منصور نے۔ میرے گھر میں تو روشنی ہو گئی ہے۔ ناظمہ' فاطمہ بھی صدقے جا رہی ہیں بھابی کے اور پھر اسے گھر لانے میں میرا ہی تو فائدہ ہے۔ بیٹیاں اپنے گھر چلی جائیں تو بہو ہی سنبھالتی ہے۔ تمہاری والی سے تو امید نہیں' اب کیا دوسری کو بھی دور رہنے دیتی۔''

''نہیں نہیں اماں! میں نے یہ کب کہا۔ مجھے تو خوشی ہے کہ آپ نے منصور کو

معاف کر دیا اور دل سے اس کی بیوی کو قبول کر لیا۔'' اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

''ہاں تو بس بڑے بھائی بن کے اپنی خوشی کا اظہار بھی کرو۔ اس کے ولیمے پر دلہن کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ بھیج دو۔ میرا خیال ہے سونے کا کوئی سیٹ ٹھیک رہے گا۔ ساتھ میں کوئی میک اپ کا سامان' پرفیوم وغیرہ تو بھیجو گے ہی۔''

''جی اماں ...... ٹھیک ہے' دیکھتا ہوں کوئی پاکستان آ رہا ہو تو بھیج دیتا ہوں۔ زیور آپ یہاں سے ہی خرید لیں' رقم بھیج دوں گا۔''

بے دلی سے کہہ کے فون رکھ دیا۔ اس کی سمجھ میں اماں کا دوہرا رویہ نہیں آ رہا تھا۔ کہاں تو وہ اب تک اس کی شادی کو ہضم نہ کر پا رہی تھیں اور اس کی بیوی کا ذکر سنتے ہی سیخ پا ہو جاتی تھیں اور کہاں اتنی آسانی سے منصور کی عیسائی بیوی کو کھلے دل کے ساتھ گھر میں جگہ دی جس نے ان کے بیٹے سے کورٹ میرج کی تھی۔

''شاید انہیں منصور سے بڑا سہارا محسوس ہوتا ہو' کم از کم وہ ان کے قریب تو ہے جب کہ میں تو ان کی نظر میں پرایا ہو چکا ہوں' پردیسی ہوں۔'' وہ اس نتیجے پر پہنچا۔

کچھ عرصے بعد ناظمہ نے فون پر اسے اماں اور منصور کی بیوی عمرانہ کے درمیان ہونے والی چپقلش کے بارے میں بتایا۔

''توبہ توبہ اتنی لمبی زبان اور اتنی پٹاخا لڑکی ...... آخر کیوں نہ ہو۔ کم عمر کی تھوڑی ہی ہے' پکی عورت تھی۔ کتنے سالوں سے تو نرس تھی اسپتال میں' خرانٹ۔''

ناظمہ کی رائے پر اس نے تصور میں بھائی کے ولیمے کی تصاویر میں نظر آنے والی بھاوج کو لانے کی کوشش کی جو اچھی خاصی خوب صورت ہونے کے باوجود عجیب پکا پن سا چہرے پر سجائے ہوئے تھی۔ کم عمری کے باوجود معصومیت کی ہلکی سی رمق بھی اس کے نقوش سے واضح نہیں ہوتی تھی۔ دل ہی دل میں ناظمہ سے متفق ہونے کے باوجود اس نے اپنا تبصرہ محفوظ رکھا اور چپ چاپ ناظمہ کی بات سننے لگا جو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں مصروف تھی۔

''آخر میرے ہی بھائیوں کے نصیبوں میں بڑی عمر کی عورتیں کیوں رہ گئی ہیں۔''

اس کی دہائی پر وہ پہلو بدل کے رہ گیا۔

''مسئلہ کیا ہے ناظمہ؟''

''کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں' فاطمہ کا تو آپ کو پتا ہے کتنی سیدھی بلکہ بدھو ہے۔ اس بے چاری کو نوکرانی بنا کے رکھ دیا ہے اس عورت نے۔ خود ہر وقت پلنگ توڑتی رہتی

ہے' مجال ہے جو کسی کام کو ہاتھ لگا لے۔ فاطمہ غریب تو چپ کر کے سارا دن کام کرتی رہتی ہے' کبھی کبھی اماں بولیں تو یہ نواب زادی طوفان کھڑا کر دیتی ہے۔ وہ وہ تماشا لگاتی ہے کہ سارا محلہ دیکھتا ہے اور تو اور ابا کو بھی نہیں بخشتی۔ میرے اماں ابا......'' وہ سسکنے لگی۔

''ہائے دونوں گھل گھل کے ختم ہو رہے ہیں اس چنڈال کے ہاتھوں۔''

''اور منصور...... وہ کچھ نہیں کرتا؟''

''وہ کیا کرے گا' اس کی مت تو تب ہی ماری گئی تھی جب یہ نوٹنکی بیاہ لایا تھا۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگلی ہے اس نے۔ آدھا شہر اس کے قصوں سے واقف ہے۔ ہائے ہائے میرے باپ کی تو نسل ہی خراب ہو گئی۔ دونوں بہوئیں گنوں کی پوری......'' وہ مزید نہ سن سکا۔

''میں نہیں جانتا ناظمہ! تم نے عمرانہ میں کیا عیب دیکھا ہے' دیکھا بھی ہے یا نہیں' لیکن کلثوم کو تم جانتی تک نہیں اس لیے اس کے بارے میں ایک لفظ تک نہ کہنا۔''

''توبہ...... دونوں بھائی ایک جیسے ہو۔ اپنی زنانیوں کے بارے میں کچھ سن ہی نہیں سکتے۔ صحیح ہے کہ خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔ خدا جانے اگر تمہیں کوئی حور پری مل گئی ہوتی تو تب کیا حال ہوتا تمہارا۔ اس ڈائن کے پیچھے پاگل ہو رہے ہو۔''

''وہ جیسی بھی ہے میری بیوی ہے اور مجھے اس کے مضبوط کردار کا پورا یقین ہے۔ اس کی چند عادتیں میرے لیے ناگوار ضرور ہیں مگر صرف عادتیں...... ناظمہ وہ فطرت کی بہت ستھری عورت ہے۔ اس کے کردار میں کہیں کوئی دراڑ نہیں۔ اس آزاد فضا میں بھی اس نے خود کو بڑا سنبھال کے رکھا ہوا ہے۔''

''خاک سنبھالا ہوا ہے۔ یوں کہو کہ کسی نے منہ ہی نہ لگایا ہوگا۔ ذرا شکل وصورت اچھی ہوتی تو پتا چلتا نیک بی بی کتنے پانی میں ہے۔'' وہ ناظمہ تھی...... سرمد اس کی زبان کا کیا مقابلہ کرتا۔ خاموش ہو رہا۔

''خیر بات عمرانہ کی ہو رہی تھی...... تو اماں بھی بس نہیں کرتیں...... منصور شام کو آئے تو ہر بات کو دس سے ضرب دے کر اسے گرم کرتی ہیں پھر خوب تو تکار ہوتی ہے۔''

وہ مزے لے لے کے بتانے لگی اور وہ بے چارہ سر تھام کے رہ گیا۔ سرمد کو اندیشہ تھا گھر کا خراب ہوتا ماحول فاطمہ پر اثر انداز نہ ہو۔ وہ بی اے کر رہی تھی۔ اس نے دن بہ دن اماں پر اس کی شادی جلد از جلد کرنے کا زور ڈالنا شروع کر دیا۔ آخر ایک دن اماں کو ایک انجینئر کا رشتہ بھا ہی گیا۔

''لڑکا بڑا سوہنا' پڑھا لکھا جوان ہے۔ گھرانہ بھی اچھا ہے بس یہ ہے کہ لڑکے کی نوکری کراچی میں ہے۔ اس کے گھر والے کہتے ہیں جہیز بھلے نہ دو' کراچی میں ایک مکان یا کم از کم فلیٹ خرید دو تا کہ کرائے کے جھنجھٹ سے آزادی ملے۔''

''فلیٹ؟ اور وہ بھی کراچی جیسے شہر میں؟ یہ کیسے لالچی لوگ ہیں؟''

''لالچی کیوں؟ سب میری طرح تو نہیں ہوتے جو خالی ہاتھ بہوئیں گھر میں گھسا ڈالیں اور پھر اپنے لیے تو کچھ نہیں مانگ رہے۔ دیکھا جائے تو ہماری ہی بیٹی کا فائدہ ہے ورنہ بے چارے کی ساری تنخواہ کرائے میں نکل جایا کرے گی۔''

اور پھر اس کی کسی ''لیکن'' کو وہ خاطر میں نہ لائیں۔ اس کے پاس بچنا ہی کیا تھا جو وہ فلیٹ خریدنے کے لیے ماں کو بھیجتا۔ آخر یہ حل نکلا کہ قسطوں پر فلیٹ خرید لیا جائے۔ یوں لاہور کے ساتھ ساتھ اب کراچی میں بھی ڈرافٹ جانے لگے۔

٭٭٭

اسامہ کے پانچ سال بعد خدا نے اسے بیٹی دی زینب...... نہ جانے کس گھڑی اماں کے منہ سے یہ بات نکلی تھی...... ''کہ کہیں اگر تمہاری بیٹی ماں کی شکل کی ہوگئی تو......''

اور واقعی وہ ماں کے تقریباً سارے نقش چرا لائی تھی۔ وہی سانولی رنگت' لمبا قد' موٹے موٹے ہونٹ...... البتہ اس کے بال ماں اور نانی جیسے گھنے گھنگھریالے نہیں تھے بلکہ سرمد کی طرح سیدھے اور سلکی تھے۔

سرمد کو بیٹی کے کم رو ہونے یا سانولا ہونے کا کوئی افسوس نہ تھا بلکہ وہ تو اسامہ سے بڑھ کے زینب کو چاہنے لگا۔ کرم جو بیٹی کو دیکھ کے خوف زدہ ہوگئی تھی۔ باپ کی اس کے لیے محبت محسوس کر کے رفتہ رفتہ مطمئن ہونے لگی۔ جب وہ سرمد کو زینب کی پیشانی چومتے یا ہاتھ سہلاتے دیکھتی تو اسے بڑا عجیب سا محسوس ہوتا۔ ہمیشہ وہ خود کو شوہر کے مقابلے میں کم تر محسوس کرتی رہی اور اندر ہی اندر احساسِ کم تری کو پال پال کے تلخی کا شکار ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ اس کا یہ احساسِ کم تری ختم ہونے لگا۔

فاطمہ کی شادی پر جانے کی بھی اسے اجازت نہ ملی۔ ویسے بھی اب شمسی صاحب تقریباً گھر تک محدود ہوگئے تھے۔ ان پر دل کے دو سخت حملے ہو چکے تھے' کاروبار کی تمام تر ذمہ داری سرمد کے سر پر تھی۔ ایسے میں وہ خود ہی پاکستان جانے کا خیال بھلا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی اس قید سے سمجھوتہ کرلیا تھا کہ اچانک ایک دن ظہور احمد شمسی نے اسے حیران کر ڈالا۔ وہ اسے کچھ کاغذات تھما رہے تھے۔

''یہ سب تمہارا ہے سرمد! تمہاری محنت کی کمائی۔''

''میری محنت کی کمائی لیکن ڈیڈی! میرا معاوضہ تو آپ مجھے ہر ماہ ادا کر دیتے ہیں۔'' وہ حیرت سے ان کاغذات کو دیکھنے لگا جن کے مطابق وہ ایک بھاری بینک بیلنس کا مالک تھا۔ اس کی بات سن کر شمسی صاحب ہولے سے مسکرائے۔

''تمہارا معاوضہ...... تمہاری خدمات کا تو کوئی معاوضہ ہو ہی نہیں سکتا بیٹا! تم نے واقعی داماد بن کے نہیں بلکہ بیٹا بن کے اپنے فرائض ادا کیے۔ تمہارا انتخاب کرتے ہوئے میں نے صرف یہ سوچا تھا کہ تم ایک شریف اور ضرورت مند انسان ہو' اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے وہی کرو گے جو میں چاہوں گا اور تمہاری شرافت تمہیں کوئی دھوکا دینے سے باز رکھے گی لیکن بیٹا! یہ تو میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ تم اتنے نیک صفت انسان ثابت ہوگے۔ تمہارے کسی رویے سے کبھی یہ نہ لگا کہ تم نہ چاہتے ہوئے ہمارے ساتھ رہنے پر مجبور ہو۔ میری بیٹی کے ہر خراب رویے کے باوجود تم نے کبھی اس کے ساتھ ناروا سلوک نہ کیا۔ میری ہر زیادتی خوش دلی سے برداشت کی۔ میری عزت کرنے میں کبھی تنگ دلی کا ثبوت نہ دیا۔ یہ تمہارا ہی ظرف ہو سکتا ہے بیٹا! ورنہ آج کل تو ہر کوئی اپنی غرض کا بندہ ہے۔ مجھے ہی دیکھ لو میں نے اپنی غرض اور مطلب کے لیے تمہیں استعمال کیا' تمہاری مجبوریوں کا سودا کرنے سے نہ ہچکچایا۔ تمہاری آزادی سلب کی' تمہیں تمہارے اپنوں سے برسوں دور رکھا' تمہیں وہ حق نہ دیا جس کے تم مستحق تھے۔'' وہ کہتے کہتے ہانپنے لگے۔

''ایسا مت کہیے ڈیڈی! آپ کی بدولت میں یہاں تک پہنچا ورنہ میں کیا تھا۔ آپ نے تو مجھ پر بڑا احسان کیا' میری دنیا بدل دی۔''

''میں نے کوئی احسان نہیں کیا' حقیقت تو یہ ہے کہ میں تمہیں ایک ملازم ہی سمجھتا رہا' ایک مفت کا ملازم...... تم ایک معمولی سی تنخواہ میں میرے کاروبار اور گھر کی ذمہ داریاں اٹھاتے رہے' اتنے بھروسے کا آدمی مجھے کہاں سے ملتا۔ میں نے تم سے ایک نہیں بلکہ چار چار آدمیوں کا کام لیا مگر تمہیں ایک ہی آدمی کے برابر تنخواہ دیتا رہا۔ اس میں میری خودغرضی شامل تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ تم اپنی مجبوری کی وجہ سے میرے ساتھ رہنے پر مجبور ہو' اگر تمہارا ہاتھ کھل گیا تو تم خودمختار ہو جاؤ گے۔ یہ سب میں اپنے کاروبار کو نہیں بلکہ بیٹی کو بچانے کی خاطر کرتا رہا' اسے صرف تم ہی برداشت کر سکتے تھے اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بھی تمہارے ساتھ مطمئن رہنے لگی ہے' وہ تمہاری عادی ہوتی جا رہی

تھی۔ اگرچہ وہ ظاہر نہیں کرتی لیکن میں اس کا باپ ہوں اس کی رگ رگ سے واقف تمہیں اس کے ساتھ باندھے رکھنے کے لیے میں نے جو ضروری جانا وہ کیا' مجھے معاف کردو بیٹا!'' وہ ان کے بندھے ہاتھ تھام کے رہ گیا۔

''لیکن مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے تمہارے حق کی ساری رقم الگ سے تمہارے نام کے اکاؤنٹ میں جمع کرانی شروع کردی۔ اگرچہ میرے بعد جو کچھ کلثوم کا ہے' اس میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ میں نے تمہیں اپنا بیٹا مان لیا ہے لیکن یہ جو رقم ہے یہ صرف اور صرف تمہاری ہے جو کسی وسیلے سے تمہیں نہیں ملی بلکہ تم نے خود کمائی ہے۔ اپنی محنت اور ہمت کے بل بوتے پر' اس پر تمہیں فخر ہونا چاہیے...... اور یہ...... تمہارا پاسپورٹ۔''

وہ رقم سے زیادہ پاسپورٹ پاکے خوشی سے دنگ رہ گیا۔ کچھ روز بعد ڈیڈی کی طبیعت سنبھلتے ہی وہ کلثوم سے مشورہ کرنے کے بعد پاکستان روانہ ہوگیا۔ اس کے پاس ایک کثیر سرمایہ تھا اور اس بار اپنی سرزمین پر لوٹتے ہوئے وہ اس سرمائے کے ساتھ کچھ خواب بھی لایا تھا۔

اپنا ایک گھر بنانے کا خواب......

مستقل طور پر پاکستان سیٹل ہونے کا خواب......

اپنا کاروبار شروع کرنے کا خواب......

* * *

اسامہ چودہ سال کا تھا اور زینب نو سال کی' دونوں کی اسکولنگ جاری تھی۔ ایسے میں وہ نہ تو انہیں ساتھ لے جاسکتا تھا نہ ہی کلثوم کو۔ وہ تقریباً بیس سال بعد اپنے وطن جارہا تھا' اس لیے سخت ہیجان کا شکار تھا۔ اس سے جتنے بھی تحائف خریدے جاسکے اس نے خریدے۔

مزنگ کے پرانے محلے میں وہ اپنے خاندان کو چھوڑ کر آیا تھا اور وہاں سے سمن آباد' سمن آباد سے سبزہ زار اور سبزہ زار سے ہوتے اب وہ گلبرگ کی ایک کوٹھی میں رہائش پذیر تھے۔ ٹیکسی سے اترتے سرمد نے ایک نظر اس سنگل اسٹوری پرانی سی کوٹھی کو دیکھا اور افسوس سے سر ہلا دیا۔

''یہ ہے وہ کوٹھی جس کا کرایہ ابا دس ہزار ماہانہ دے رہے ہیں۔ کاش انہوں نے بڑے بڑے مہنگے علاقوں میں رہائش اختیار کرنے اور کرائے کے مکانوں پر رقم جھونکنے

کے بجائے کچھ بچت کرکے ایک چھوٹا سا ہی سہی مگر اپنا مکان تعمیر کرلیا ہوتا۔ خیر...... جو ہونا تھا ہوگیا' اب ان شاء اللہ میں اپنے ابا اور اماں کا برسوں پرانا خواب پورا کروں گا۔''

وہ عزم کرتا اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع کسی کو نہیں دی تھی' اسی لیے پورا گھر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوگیا۔ خود وہ حیرانی سے ایک ایک کو تک رہا تھا۔ ناظمہ بالکل اماں کی اس وقت کی تصویر لگ رہی تھی' جب وہ اماں کو پاکستان چھوڑ کے امریکہ گیا تھا۔ اس کے پانچ بچے تھے' چار لڑکیاں اور ایک لڑکا۔

فاطمہ بہت کمزور اور زرد رو نظر آرہی تھی' اس کے صرف دو بیٹے تھے' اس کا شوہر بھی موجود تھا۔

منصور بہت بڑا بلکہ بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سر کے بال تقریباً اڑ چکے تھے جو رہ گئے تھے ان میں سفیدی اتر آئی تھی۔ نظر کا چشمہ بھی لگا تھا اور توند بھی باہر کو نکلی ہوئی تھی البتہ اس کی بیوی خوب لشکارے مار رہی تھی۔ گہرے کالے رنگے ہوئے بالوں میں بڑا سا رنگین کلپ لگا رکھا تھا۔ رات کے اس پہر مٹے مٹے میک اپ کے نقوش واضح تھے اور سرمد کے آتے ہی لپ جھپک وہ تیز رنگوں والا ریشمی سوٹ بھی پہن چکی تھی۔ منصور کے تین بچے تھے' دو بیٹے اور سب سے چھوٹی بیٹی۔ اسی کے بڑے بیٹے کے دسویں میں پاس ہونے کی چھوٹی سی تقریب تھی جس کے لیے دونوں بہنیں اکٹھی آئی ہوئی تھیں۔ اماں اور ابا دونوں ہی بے حد ضعیف اور کمزور ہوچکے تھے۔ ابا کی نظر تو تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ شوگر اور بلڈ پریشر دونوں کی زیادتی نے انہیں کمزور کرکے رکھ دیا تھا۔ وہ ان کی حالت دیکھ کے افسردہ ہوگیا۔

برسوں کی اداسیاں چند دنوں میں تو ختم نہیں ہوسکتی تھیں۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ رات کے باقی ماندہ گھنٹے بھی یوں ہی ماں کی گود میں سر رکھے گزار دے لیکن اس کے بھتیجوں' بھانجوں کو اپنے گفٹس دیکھنے کی بے قراری تھی۔ ناظمہ نے بھی کہا۔

''ہاں بھائی! جو دینا ہے بچوں کو دے ہی دو تو اچھا ہے' کل تو میں واپس اپنے گھر جارہی ہوں۔''

''ناظمہ! میں اتنے عرصے بعد لوٹا ہوں اور تم دو دن بھی بھائی کے ساتھ نہیں گزارو گی؟''

''کیوں نہیں لیکن میں کل سے یہاں پڑی ہوں' صبح گھر جاکے ذرا اور کپڑے وغیرہ لے آؤں بچوں کے' پھر پورا ایک ہفتہ تمہارے پاس رہوں گی لیکن تم میرے اور

میرے بچوں کے لیے جو کچھ لائے ہو وہ ابھی دے دو...... بعد میں کیا پتا......" وہ منہ میں ہی کچھ بڑبڑانے لگی۔ باہر نکلتی عمرانہ نے پلٹ کر تیز لہجے میں کہا۔

"ہم کوئی چور ہیں جو تمہاری چیزیں لے اڑیں گے۔"

"میں نے کب کسی کا نام لیا اونہہ...... چور کی داڑھی میں تنکا۔"

"خدا کا واسطہ ہے باجی! بھائی جان کیا سوچیں گے' ابھی ابھی تو وہ گھر آئے ہیں۔"

فاطمہ نے بڑی بے چارگی سے بہن اور بھاوج دونوں کے آگے ہاتھ جوڑے۔ خود اس کا اپنا جی مکدر ہو گیا اور یہ تکدر بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس نے اتنے چاؤ سے سب کے لیے تحائف خریدے تھے لیکن بدقسمتی سے سب ہی کو اپنے اپنے گفٹس کے بجائے دوسرے کی چیز زیادہ پسند آ رہی تھی۔

منصور کے لیے تو خیر دو تین رنگ کے ٹو پیس سوٹ تھے پھر بھی اس کی نیت نہ بھری اور وہ سرمد کے ہر سوٹ اور ہر شرٹ پر ہاتھ رکھتا رہا۔

"بھائی جان جاتے ہوئے یہ مجھے دے جایئے گا اور یہ شوز بھی...... بلکہ اپنے سارے شوز دے جائیں' آپ کا اور میرا ایک ہی سائز ہے' یہاں جوتے کسی کام کے نہیں ملتے۔"

"تو میں کیا ننگے پیر واپس جاؤں گا۔" وہ ہنسنے لگا۔

"ولیں بھلا آپ کو جوتوں کی کیا کمی۔" وہ کمینگی سے ہنستے ہوئے کہنے لگا تو سرمد ٹھٹکا۔ ناظمہ کے شوہر ادریس نے گرہ لگائی۔

"اور کیا؟ آپ کے سسر سلامت' جوتے بہت۔" عجیب چبھتا ہوا لہجہ اور ذو معنی الفاظ تھے۔ امریکا میں اتنے سال رہنے کے بعد اب اسے ٹیڑھے میڑھے جملوں کی عادت نہیں رہی تھی۔ ناگواری کی لہر نے تھکان اس پر غالب کر دی' جسے وہ اپنوں سے ملنے کے جوش میں بھلائے بیٹھا تھا۔

اس کا موڈ تبدیل ہوتے دیکھ کر فاطمہ کے مشورے پر اماں نے سب پھیلاوا سمیٹنے کا حکم دیتے ہوئے اسے سونے کے لیے کمرے میں جانے کا کہا۔ ویسے بھی صبح ہونے والی تھی۔ اس نے چائے کے گرما گرم کپ کے ساتھ کیک اور بسکٹ کھائے اور سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ ابھی شاید اس کی آنکھ لگے بہ مشکل آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ عجیب سے شور اور چیخنے چلانے کی آوازوں سے وہ ہڑبڑا کے جاگ گیا۔ غنودگی میں ڈوبے

ذہن کو حواسوں میں لاتے ہوئے اس نے غور کیا تو ناظمہ اور عمرانہ کے درمیان تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ بیچ بیچ میں منصور بھی دھاڑ رہا تھا۔ وہ لپک کے کمرے سے نکلا۔ عجیب میدانِ جنگ گرم تھا۔

صحن کے بیچوں بیچ ناظمہ سارا سامان سمیٹے' جانے کے لیے تیار کھڑی عمرانہ کی سات نسلیں کھنگال رہی تھی۔ دوسری طرف عمرانہ آستین چڑھائے اپنی دو دھاری زبان کے جوہر دکھا رہی تھی۔ یہ منظر اس کے لیے بہت اجنبی سا تھا۔ وہ ادھر ادھر بقایا افراد کو دیکھنے لگا۔ سب کے بچے اپنی اپنی پارٹی کی طرف کھڑے ایک دوسرے کو کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ منصور صوفے پر دونوں ٹانگیں اوپر کیے بیٹھا تھا جہاں ناظمہ کا پلڑا بھاری ہوتا وہ اپنی جنگجو بیوی کو زبانی کلامی کمک پہنچاتا۔

فاطمہ ہاتھوں میں سر دیے بے بسی سے بیٹھی تھی جب کہ اس کا شوہر ناظمہ کے شوہر ادریس سے الجھنے میں مصروف تھا۔ اماں ایک طرف بیٹھی بے زاری سے سارا تماشا دیکھ رہی تھی جب کہ ابا چائے کے گھونٹ بھرتے سراسر لاتعلقی سے پنجرے میں اٹکھیلیاں کرتے طوطے کی طرف مگن تھے۔ اس نے خود ہی اس آگ میں کودنے کا فیصلہ کیا اور پہلے بہن کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ سننے پر تیار نہ تھی۔

"ہاں تو تو بڑے زمیں دار کی بیٹی ہے۔ سب پتا ہے مجھے کیسے فاقے کرتے تھے تم لوگ' یہ تمہارا بھائی گھر داماد بنا اور بیوی کا مال لُوٹ کے تمہیں بھر رہا ہے۔ آخ تھو' لعنت ایسی کمائی پر۔"

"تیری بڑی حلال کی کمائی ہے' پتہ ہے مجھے کس اسپتال میں تھی اور کس قسم کی نرس تھی۔ کمپاؤڈر سے لے کر وارڈ بوائے تک پھنسا رکھے تھے۔" وہ ان دونوں کی الزام تراشیوں سے خائف ہو کے بہنوئیوں کی طرف پلٹا۔

"بھائی جان! آپ ہی اسے سمجھائیں یا کم از کم اس وقت اسے یہاں سے لے ہی جائیں۔"

"جاتا ہوں' جاتا ہوں۔ کتا نہیں جو تمہاری طرح سسرال کے دروازے پر پڑا رہوں۔" وہ نہ جانے کس پر چڑے بیٹھے تھے جو اسے لتاڑ کے رکھ دیا۔ وہ دنگ رہ گیا اتنے بے رحم الفاظ پر۔

"کسے سنا رہے ہو' کسی غلط گمان میں مت رہنا۔ میں نے کبھی کسی کی اونچی آواز نہیں سنی۔" فاطمہ کا شوہر نبیل بھڑک اٹھا۔

"چھوڑیں نبیل! جانے دیں۔" فاطمہ نے اس کا بازو تھاما' جسے اس نے ایک جھٹکے سے چھڑایا۔

"چلو سامان سمیٹو اپنا' پتا نہیں کس لیے میں یہاں اس "چنگڑ خانہ" میں آجاتا ہوں۔ پھنس گیا ہوں تم سے شادی کر کے۔ ایک سے ایک نمونہ بھرا پڑا ہے تمہارے میکے میں۔"

سرمد لاچاری سے ہر طرف گردن گھما گھما کے دیکھنے لگا۔ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ نبیل اب بیوی پر برس رہا تھا اور وہ آنسو بہا رہی تھی۔ ادریس بھائی غصے میں بچوں کو پیٹ رہے تھے۔ ناظمہ بہ دستور عمرانہ کے بخیے ادھیڑ رہی تھی اور وہ بے چارہ نہ جانے کس لیے بار بار لپیٹ میں آ رہا تھا۔

"میرے بھائی کی کمائی پر سب سے زیادہ حق میرا ہے۔" ناظمہ نے سینہ ٹھونک کر اعلان کیا۔ "جب اس کا ویزا لگا تو کیا تھا اس کے پاس' اس کے ٹکٹ کے لیے میرے جہیز کے زیور بکے۔ کون اتنا حوصلہ کرتا ہے جتنا میں نے کیا۔"

"ارے جا' سب جانتی ہوں تو اور تیرا زیور۔" عمرانہ نے للکارا۔ منصور بھی بیچ میں بول پڑا۔

"وہ زیور تھا؟ چھلکے جیسی جھمکیاں اور تار جیسا لاکٹ' اگر احسان کیا بھی تو بھائی جان نے دس گنا زیادہ کر کے یہ احسان اتار ہی دیا تھا۔"

"وہ میرا بھائی ہے' احسان کیسا؟ بہنوں کو سب دیتے ہی ہیں۔ ہاں احسان تو تم پر کیا تھا' بیس لاکھ روپیہ اور سود کے بارہ لاکھ...... جو سب کے سب تم نے ڈبو دیے۔"

عجیب سا کھاتہ کھل گیا۔ سرمد نے آخری حل یہی نکالا کہ کمرہ بند کر کے بیٹھ جائے۔

کچھ دیر بعد جب ناظمہ اور فاطمہ اپنے اپنے گھر چلی گئیں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ منصور نے بلند آواز میں ڈیک لگا لیا۔ عمرانہ پراٹھے تلنے لگی۔ اماں نے ایک موٹی سی گالی سے اسے نوازا۔

"میری بیٹیاں آ جائیں تو کمینی مکر کرتی ہے۔ وہ گھر سے نکلتی ہیں تو بھلی چنگی ہو جاتی ہے۔"

ناشتے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو سے منٹوں میں ماحول کی تلخی زائل ہو گئی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ کچھ دیر قبل یہاں دنگل مچا ہوا تھا۔ سرمد نے اندازہ لگایا کہ یہ ان کے لیے معمول کی بات ہو گی اسی لیے سب اتنا نارمل تھے۔

ابا کو خوش خبری دینے کے لیے وہ اتنا بے چین تھا کہ اس سے مزید رہا نہ گیا اور اس نے اپنا گھر بنانے کا عندیہ ظاہر کر دیا۔ خوشی کے مارے ابا بے حال ہو گئے۔ اماں بھی اس کا ماتھا چومنے لگیں۔ منصور بھی پرجوش ہو کے نت نئے آئیڈیے دینے لگا۔

"ڈیفنس چلتے ہیں بھائی جان یا پھر کینال ویو۔ ایک کنال کا پلاٹ بہت ہو گا۔ اچھا خوب صورت ڈبل اسٹوری بنگلہ بن جائے گا۔"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں منصور! کوئی بنا بنایا بنگلہ اگر مل جائے تو بہتر ہے۔"

"کیوں رقم برباد کرنی ہے۔ خراب میٹریل لگا کے بیچتے ہیں یہ ٹھیکے دار۔ آپ فکر نہ کریں میں کس لیے ہوں' خود کھڑے ہو کے بنواؤں گا۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے ایسی پائیدار چیز ہو گی' بس آپ یہ بتائیں آپ کتنا خرچ کر سکتے ہیں؟"

"زمین دیکھ لیں پھر یہ طے کریں گے۔" اس نے کہا اور منصور اگلے ہی روز اسے مختلف پلاٹ دکھانے لے گیا۔ کینال ویو پر ایک ڈھائی کنال کا پلاٹ اسے پسند آیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ڈیڑھ کنال کے رقبے پر تعمیر کر کے اردگرد لان اور سوئمنگ پول کی جگہ چھوڑی جائے۔ نقشہ فائنل ہوا' زمین خریدی گئی' ٹھیکے دار سے بھی معاہدہ ہوا۔ تعمیر کا کل تخمینہ لگا کے اس نے سارے اختیارات منصور کو سونپ دیے۔ کل ساٹھ لاکھ فی الحال اسے تھما دیے۔

"میرا خیال ہے اتنے میں کام ہو جائے گا۔"

"آپ کو مکان کب تک چاہیے؟" منصور کے پوچھنے پر سرمد نے کچھ سوچ کے کہا۔

"ابھی کچھ عرصہ مجھے وہیں رہنا ہو گا' اسامہ کا او لیول ہو جائے تو پھر دیکھوں گا۔ زینب کی خیر ہے وہ ابھی چھوٹی ہے لیکن اسامہ کی تعلیم متاثر ہو گی' اس مرحلے پر تبدیلی سے۔"

"چلیں پھر تو خاصا وقت ہے آرام سے ڈیکوریٹ بھی ہوتا رہے گا بس...... بس آپ خرچے میں ہاتھ کھلا رکھنا۔ جتنا گڑ ڈلے گا اتنا ہی میٹھا۔"

❋ ❋ ❋

اور وہ واپس امریکا چلا گیا تھا' منصور پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے۔ وقتاً فوقتاً اس کے مطالبے پر وہ رقم بھی بھیجتا رہا۔ ایک مرحلے پر تو اسے محسوس ہوا کہ رقم ٹھیکے دار کے لگائے گئے تخمینے سے بہت زیادہ ہو رہی ہے' اس کے استفسار پر منصور نے وضاحت کی۔

''بھائی جان! میں نے نقشے میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ ابا جی نے کہا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق میں نے اوپر کے پورشن میں چند اور کمرے ڈلوائے ہیں تاکہ ناظمہ باجی اور فاطمہ رہنے آیا کریں تو ان کے لیے خاصی جگہ ہو اور پھر میرے بچے بھی تو بڑے ہو رہے ہیں' سب کے لیے الگ الگ کمرے چاہئیں۔''

جواب میں وہ چپ رہا لیکن اس سے خاموش نہ رہا گیا۔ جب بنگلہ تعمیر ہو جانے کے بعد منصور نے اس کی فرمائش پر بنگلے کی تصاویر اور مووی بنوا کے بھیجی۔ باہر سے دیکھنے میں وہ ویسا ہی تھا جیسا اس نے پسند کیا تھا مگر لان بے حد مختصر تھا اور سوئمنگ پول' ٹینس کورٹ ندارد جب کہ ایک طرف دو تین کمرے ڈال کر الگ سے انیکسی نما عمارت تھی۔

اس نے فوراً باز پرس کی۔ منصور کے پاس جواب حاضر تھا۔

''انیکسی نہیں ہے بھائی جان! پچھلی طرف تو سرونٹ کوارٹر ہیں اور یہ جگہ عمرانہ نے اپنے بیوٹی پارلر کے لیے بنوائی ہے' اس نے کورس کیے ہیں جسے وہ کام میں لانا چاہتی ہے۔ اس علاقے میں ایسا جدید اور ماڈرن پارلر خوب چلے گا۔''

''اور وہ سوئمنگ پول' گرین ہاؤس' ٹینس کورٹ۔''

''ان کی جگہ نہیں نکلی' آخر لان بھی تو بنانا تھا' وہی اتنی مشکل سے بنا۔''

''ڈیڑھ کنال کا رقبہ تھا' آخر کہاں گیا؟''

''اوہو بھائی جان! دراصل میں پہلے آپ کو بتانا نہیں چاہ رہا تھا کہ کہیں آپ پریشان نہ ہو جائیں۔ دراصل آپ کے جانے کے بعد اس زمین کے کوئی اور دعوے دار آ گئے' یہ تنازعے والی اراضی تھی بڑا مسئلہ ہوا۔ مت پوچھیں کس مشکل سے اس مصیبت کو ٹالا۔ کتنی رشوتیں دے کر یہ مسئلہ حل کرایا' آخر ایک کنال لے کر ٹلے۔''

''کیا......؟ اور تم نے دے دیا۔ بغیر مجھ سے پوچھے؟'' وہ حیرت زدہ تھا۔ بغیر کسی کاغذی کارروائی کے یہ سب کیسے ہو سکتا تھا' اس کا دل منصور کی کسی بات پر ایمان لانے کو تیار نہ تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں تلملاتا ہوا' خاموش رہا۔

''ابھی اسے کچھ دن پہلے ہی سب لوگوں کے کینال ویو والے بنگلے میں شفٹ ہونے کی خبر ملی تھی اور اس کے بعد دوسری خبر ابا کے انتقال کی آئی۔ اسے امریکا آئے ڈیڑھ سال ہی ہوا تھا' اتنی جلدی وہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔ ویسے بھی اس کا ارادہ جلد از جلد مستقلاً پاکستان سیٹل ہونے کا تھا اور اس سے پہلے پاکستان کا ایک اور چکر لگا کے وہ

شمسی صاحب کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ فی الحال وہ ان کو اور ان کے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ وقت دے کر' ان کی خوشنودی حاصل کر رہا تھا۔ کم نے سرسری سا پوچھا بھی لیکن اس نے ٹال دیا۔

''کوئی فائدہ نہیں' اباجی کا آخری دیدار تو نصیب نہیں ہو سکتا' ان کی حالت ایسی نہیں کہ انہیں چند گھنٹے بھی مزید رکھا جا سکے۔ اب سے کچھ دیر بعد ان کی تدفین ہونے والی ہے' میرا وہاں جانے کا کیا فائدہ؟'' وہ مزید کچھ نہ بولی۔

وہ اور زیادہ مصروف ہو گیا۔ اس نے کم اور شمسی صاحب دونوں پر واضح کر دیا کہ اب وہ پاکستان منتقل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ شمسی صاحب نے کوئی تبصرہ نہ کیا البتہ ان کی شکستگی واضح تھی۔ ان کی عمر اب مزید بوجھ کی متحمل نہیں تھی جب کہ ان کا کاروبار اب بہت زیادہ پھیل چکا تھا۔ انہوں نے سرمد کو مشورہ دیا کہ پیٹرول پمپ اور تینوں اسٹورز بیچ دیے جائیں جب کہ ہوٹل وہ کرائے پر دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ ولا انہوں نے اسامہ کے نام کر دیا تھا۔ بزنس کو وائنڈ اپ کرنے کے لیے سرمد پہلے سے بڑھ کر سرگرم ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جلد بازی میں شمسی صاحب کو کوئی مالی نقصان اٹھانا پڑے' اس لیے اس نے یہ کوشش کی کہ ایک آدھ سال میں اسٹورز کی حالت اتنی عمدہ کر دے کہ وہ اچھی سے اچھی قیمت پر بک سکیں۔

* * *

اسی دوران منصور کے فون نے اسے چونکا کے رکھ دیا۔ وہ اسے اباجی کی وصیت کے بارے میں بتا رہا تھا کہ انہوں نے بنگلہ اپنی چاروں اولادوں کے درمیان شرعی لحاظ سے تقسیم کر دیا ہے۔ سرمد ہکا بکا رہ گیا۔

''لل......لیکن یہ بنگلہ...... یہ بنگلہ تو میرا......''

''بھائی جان! آپ نے خود ہی اسے اباجی کے نام کیا تھا۔''

''ہاں...... وہ بڑے تھے' ان کے ہوتے ہوئے میں باہر اپنے نام کی تختی کیسے لگا سکتا تھا۔ ان کا سالوں پرانا خواب پورا کرنے کے لیے میں نے کاغذات پر بھی ان کا نام لکھوایا' لیکن تم تو جانتے ہو...... سب جانتے ہیں کہ اس کی اینٹ اینٹ میں میرا خون پسینہ شامل ہے۔''

''اب کیا ہو سکتا ہے' اگر آپ جھوٹ موٹ یہ سب کر رہے تھے تو پھر آپ کو چاہیے تھا کہ کاغذات بھی جھوٹے بنواتے۔ اب تو قانون کی رو سے آپ کے ساتھ ساتھ میں

فاطمہ اور باجی بھی حصے دار ہیں بلکہ اماں بھی۔''

''لیکن منصور......! میں نے سالوں سے پردیس میں قید تنہائی کاٹی ہے' مشقت کی ہے' یہ پیسے میں نے بڑی مشکل سے کمائے ہیں۔ قانون کو چھوڑ دو' تم اپنی بات کرو۔ کیا تم یہ ناانصافی گوارا کر سکتے ہو؟''

''ناانصافی کیسی؟ میں نے کوئی دھوکا دہی کی ہے؟ میں اپنا حق کیوں چھوڑوں؟ باپ نے دیا ہے' جائز حق ہے' چھوڑنے کی تک بھی کوئی نہیں۔''

''میں ناظمہ سے بات کروں گا' فاطمہ سے کہوں گا' کوئی تو انصاف سے کام لے گا۔''

''کرلیں بات' ویسے وہ پہلے ہی ایک بات مجھ سے کر چکی ہیں۔ دونوں ہی آئی تھیں بمع اپنے شوہروں کے' یہ کہنے کے لیے کہ وہ تو اپنا گھربار چھوڑ کے یہاں رہنے نہیں آسکتیں' اس لیے باپ کی جائداد میں سے انہیں جتنا حصہ ملا ہے' وہ انہیں دے دیا جائے۔ یعنی کہ بنگلہ کی مالیت میں سے جتنے فی صد ان کا حصہ ہے وہ اب ان دونوں کو دینا پڑے گا۔''

''تو اب تم یہ بنگلہ فروخت کرنے کا پروگرام بنا رہے ہو؟''

''میرا کیا دماغ خراب ہے بھائی جان! لیکن ان دونوں کو ٹالنا بھی ضروری ہے۔ ایسا کیوں نہ کریں کہ جتنا ان کا حصہ بنتا ہے دے دلا کے فارغ کریں' اس طرح یہ بنگلہ صرف آپ کی اور میری ملکیت ہو جائے گا۔'' سرمد پہلے ہی انکشافات کی زد میں تھا۔ منصور کے بے سروپا دعوے اسے اور سیخ پا کیے دے رہے تھے۔ کتنے مزے سے وہ پکے پکائے حلوے پر ملکیت جتا رہا تھا اور اب ان سے مزید رقم نکلوانے کے چکر میں تھا۔ ایک ایسی چیز جس پر اس کا پورا پورا حق تھا' اس کی ملکیت میں نصف کا حق دار بننے کے لیے اسے اب اور رقم دینا ہوگی۔ اس نے دل میں مزید احمق بنے رہنے سے انکار کر دیا۔

''منصور! میرے پاس اب بالکل بھی پیسہ نہیں ہے' میں نے اپنی عمر بھر کی کمائی اندھوں کی طرح اس بنگلے پر لٹا دی اور مجھے کیا ملا...... ایک چوتھائی حصہ...... میں کس کے آگے اپنا مقدمہ رکھوں' کس سے بات کروں...... خدا ابا جی کی مغفرت کرے نہ جانے کیا سوچ کر وہ یہ فیصلہ کر گئے لیکن اب اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اور بھی کنگال ہو جاؤں تو میری طرف سے صاف جواب ہے' اگر انہیں اتنا ہی پیسے کی ہوس ہے تو ٹھیک ہے' بنگلہ بیچ دو اور ان کے حصے انہیں دے دو۔ مجھے اب اس سے کوئی دل چسپی نہیں۔''

''خیر بیچوں گا تو میں ہرگز نہیں۔ آپ کو پروا نہیں لیکن میں نے تو پورا ایک سال مزدوروں کے سر پہ کھڑے ہو کے اس کی ایک ایک اینٹ رکھوائی ہے' اپنی محنت میں یوں ضائع نہیں ہونے دوں گا۔''

اور سرمد تلخی سے سوچتا رہ گیا کہ اس کی ایک سال کی محنت زیادہ بھاری تھی یا پردیس میں کاٹے بیس سال کی اذیت۔

''کسی نہ کسی طرح انتظام کر کے میں فاطمہ اور باجی دونوں کو ان کا حصہ دے دوں گا لیکن یہ یاد رہے کہ ان کو مکمل ادائیگی کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ بنگلے کا ستر فی صد مالک اب میں ہوں۔''

اس نے جتا دیا اور سرمد دیر تک خود کو یقین دلاتا رہا کہ یہ الفاظ اس کے اپنے سگے بھائی کے تھے۔ یہ دھوکا اس کے اپنے خون نے اسے دیا ہے۔ بے اعتباری کا یہ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ وہ کسی کو اپنے غم میں شریک تک نہ کر سکا۔ اس کی اپنی سگی ماں تک نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

اس آخری حملے کے بعد وہ اتنا دل گرفتہ ہوا کہ مہینوں پلٹ کے پاکستان کی خبر نہ لی' نہ ہی وہاں سے کسی نے یاد کیا۔

وہ ایک بار پھر سے شمسی صاحب کے کاروبار میں جت گیا۔ اس نے دوبارہ اپنے پاکستان جانے کا ذکر تک نہ کیا۔ کم نے بھی زیادہ کریدنے کی ضرورت محسوس نہ کی حالانکہ وہ شدت سے منتظر تھا کہ کوئی پوچھے۔ کوئی تو پوچھے...... کہ جس دیس میں جانے کی تمہیں اتنی چاہ تھی' جس چھت کے نیچے بسنے کے تم اتنے خواہش مند تھے...... اب کیوں خوف زدہ ہو جاتے ہو' اسی دیس کے نام سے۔ اس مٹی کی مہک اب تمہیں بے چین کیوں نہیں کرتی۔

* * *

تقریباً ڈیڑھ سال تک اس کے اور بہنوں بھائی کے درمیان کوئی رابطہ نہ رہا۔ دل ہی دل میں ان سے ناراض ہونے کے باوجود وہ اب بھی منتظر تھا کہ شاید اس کا بھائی اسے پکارے' اسے منا لے' کوئی بہن ہی پیار بھری صدا دے لے لیکن اس کے برعکس اسے صرف چند سطری خط موصول ہوا جس میں کسی نے بڑی عجلت کے ساتھ اسے اماں کے گزرنے کی اطلاع دی۔ اس نے تڑپ کے گھر فون کیا۔

''یہ خط...... کیا مطلب ہے اس خط کا...... اتنے سالوں میں پہلی بار یہ خط لکھا اور

وہ بھی اس مقصد کے لیے؟ کیا یہ اطلاع مجھے فون پر نہیں دی جا سکتی تھی۔ کیا تم لوگ یہ چاہتے تھے کہ ابا کی طرح اماں کے آخری دیدار سے بھی میں محروم رہ جاؤں۔"

"اگر ایسی ہی فکر آپ کو ہوتی بھائی جان! تو آپ خود فون کر لیتے۔ آپ نے تو پلٹ کے دوبارہ ماں کو نہیں پوچھا۔ ہمارے فون کیا مفت کے ہیں جو امریکہ کالیں کرتے۔"

منصور کے طعنے پر وہ یہ جتا نہ سکا کہ لمبی لمبی فرمائشوں سے بھری لمبی لمبی کالیں اسے کتنی تعداد میں موصول ہوتی رہی ہیں۔ دل میں تو یہ ان کا احساسِ جرم تھا جو وہ اس کا سامنا نہ کرنا چاہتے تھے یا پھر انہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں وہ واپس آ کر بنگلے کی ملکیت پر دعوا نہ دائر کر دے' حالاں کہ وہ تو کب کا اس نقصان کو بھلا چکا تھا۔ ابا کی روح کی تسکین کے لیے اس نے منصور کو دل سے معاف کر دیا تھا۔ یہ لاتعلقی تو صرف اعتبار ٹوٹ جانے کا ردعمل تھی۔

ابا کے بعد اب اماں بھی نہ رہیں۔ پاکستان واپس جاتا بھی تو کس لیے۔ اب اس کے دل سے وطن لوٹنے کی رہی سہی امید بھی ٹوٹ گئی۔ اس نے خود کو بچوں اور گھر میں مگن کر لیا۔ کم ایسے موقع پر اس کے لیے بڑا جذباتی سہارا ثابت ہوئی' ہر گزرتا دن اسے سرمد سے قریب کر رہا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ اس کے بغیر بتائے اس کے ہر دکھ سے آشنا ہو جاتی تھی۔ اب تو کبھی کبھی سرمد بھی اس کے سامنے اپنا دل کھولنے لگا۔ یہ ہمت کلثوم کے اپنے مزاج کی تبدیلی کی وجہ سے اسے ملی تھی۔ اس نے سرمد پر اب اپنی گرفت ڈھیلی کر دی تھی۔ ایک باس کے بجائے اب وہ رفتہ رفتہ بیوی کے سانچے میں ڈھلنے لگی تھی۔

کل تک سرمد اسے اپنے سامنے احسانوں کے بوجھ تلے دبا نظر آتا تھا مگر اب وہ اس کے سامنے مشکور سی نظر آتی کہ کس طرح وہ بستر پر پڑے مفلوج ظہور احمد شمسی صاحب کی خدمت ایک بیٹے سے بڑھ کر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے اختیارات کا کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔

***

پانچ سال بیت چکے تھے اماں کی وفات کو۔ اب پاکستان سے اس کا رابطہ برائے نام ہی رہ چکا تھا۔ کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی۔

منصور نے جو نیا بزنس شروع کیا تھا وہ بری طرح تباہ ہو چکا تھا۔ اس نے بنگلے کا اوپری حصہ کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ باہر بنا بیوٹی پارلر اور سرونٹ کوارٹر اب ایک ڈیپارٹمنٹل

اسٹور میں تبدیل ہو چکے تھے جس کی آمدنی پر اس کا گزارا تھا۔ یہ سب اطلاعات اسے ملتی رہتی تھیں۔ والدین کی وفات کے بعد وہ اتنا کبیدہ خاطر ہو چکا تھا کہ اس نے بہن بھائیوں سے عمر بھر رابطہ نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی لیکن چونکہ فطرتاً وہ صاف دل کا تھا' اس لیے گزرتے سال اس کے دل و دماغ سے یہ گرد صاف کرتے رہے۔ اب پھر سے اس کے دل میں اپنی مٹی تک جڑیں پھیلانے کی تمنا چپکے چپکے سر اٹھانے لگی۔ وہ اکثر بچوں کو وہاں کے قصے سناتا۔ چچا اور پھوپھیوں سے غائبانہ تعارف کراتا اور پھر شمسی صاحب کی وفات بھی ہو گئی۔ اب اسے امریکا میں بسے رہنے کی بہ ظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔

"کلثوم! بغیر جڑوں کے کوئی پودا پھلتا پھولتا نہیں' یہاں اور کوئی نہیں تو ان کے نانا تو تھے۔ اب یہ دیس ان کے لیے سچ مچ پردیس ہے۔ ان کا بھی حق ہے کہ یہ زندگی کو اپنی تمام تر گرم جوشی کے ساتھ محسوس کریں' اپنے سارے رشتوں سے محبت وصولیں۔"

کم اسے گہری نظروں سے دیکھتی رہی۔

"میرا خیال ہے کسی بھی حتمی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے تم ایک بار بچوں سے پوچھ لو بلکہ صرف پوچھنے سے کوئی فائدہ نہیں' سنی سنائی کہانیوں سے نہ جانے وہ کیا تصور باندھ بیٹھے ہوں' اپنے دیس اور اپنے "اپنوں" کا۔ ان چھٹیوں میں تم انہیں ساتھ لے جاؤ پھر جو یہ فیصلہ کریں۔"

"اور تم...... کلثوم! تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گی؟"

"نہیں...... تم اپنوں کے پاس جا رہے ہو اور میرا وہاں کوئی اپنا نہیں۔" اس کی صاف گوئی جوں کی توں تھی۔

"کیوں کیا ہم تمہارے اپنے نہیں۔ میں' اسامہ' زینب؟" اس نے کلثوم کا تذبذب بھانپ کے کریدا۔ اس نے سر اٹھایا اور مسکرا کے بولی۔

"ہاں...... تم میرے اپنے ہو' تم بھی' اسامہ بھی اور زینب بھی۔ جب تم وہاں ہو گے تو میں ضرور آؤں گی' لیکن پہلے یہ فیصلہ تو ہو جائے کہ تم وہاں رہو گے یا نہیں۔"

اس نے بڑی خوب صورتی سے اپنا فیصلہ مشروط کر دیا اور سرمد بچوں کے ساتھ وطن لوٹنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ وہ آٹھ سال بعد پاکستان لوٹ رہا تھا اور اس بار اس نے گھر والوں کو سرپرائز دینے سے پرہیز کیا۔ اپنے آنے کی پیشگی اطلاع اس نے وہاں بھجوا دی تھی۔

سب کچھ بدل چکا تھا' پاکستان بھی اور پاکستان والے بھی۔

گھر بھی اور گھر میں رہنے والے بھی۔

بچے بڑے ہو چکے تھے اور بڑے مزید بڑے۔

ناظمہ پہلے سے کہیں زیادہ پھیل چکی تھی اور فاطمہ اور بھی زیادہ کمزور۔ ادریس اور نبیل دونوں کے ماتھے کی تیوریاں بھی ویسی کی ویسی تھیں۔ منصور اور بوڑھا لگنے لگا تھا جب کہ اس کی بیوی عمرانہ کے نخرے اور بھی جوان ہو گئے تھے۔ اتنے چاؤ اور لاگت سے بنائے گئے بنگلے کی حالت مخدوش تھی۔ در و دیوار روغن سے محروم تھے۔ فرنیچر' پردے سب کچھ حال سے بے حال۔ اسے رہنے کے لیے مختصر سا کمرہ دیا گیا۔ زینب کو منصور کی بیٹی کے کمرے میں ٹھہرایا گیا جہاں ناظمہ کی بیٹیاں بھی آج کل رہ رہی تھیں۔

اس بار اس نے تحائف لانے کا تکلف نہ کیا۔ پچھلی بار کا تلخ تجربہ اس کی یادداشت میں محفوظ تھا البتہ عذر اس نے یہ پیش کیا کہ اسے کسی کے سائز اور پسند کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ سب کو ان کی پسند سے یہیں شاپنگ کروا دے گا۔ سب کے خراب ہوتے موڈ اسے اپنے بچوں کے سامنے شرمندہ کر گئے۔ اس پر مستزاد ان کے بے لاگ تبصرے۔

''اے سرمد! تیری بیوی کیا اب بھی ویسی کی ویسی ہے' مرد مار۔''

''ہائے ہائے' لڑکی بھی اس پر ہی چلی گئی...... کیا تھا جو تجھ پر چلی جاتی۔ لڑکا بے شک ماں کی شکل کا ہوتا' لڑکوں کا کیا ہے مگر ہائے...... لڑکی ذات۔''

''خیر بھائی جان کو کیا فکر' ان کے پاس کیا کم پیسہ ہے۔ فی زمانہ پیسے کی طاقت بہت ہے۔ یہ زینب تو پھر بہت ٹھیک ہے' اس کی ماں...... توبہ توبہ اس کے باپ نے بھی تو پیسے کے بل بوتے پر ہمارے بھائی کو قابو کر لیا۔''

''ہاں سرمد! سنا ہے بڈھا مر گیا۔ کچھ تجھے بھی دے کر گیا ہے یا سب اپنی حسن پری بیٹی کے نام کر گیا؟'' وہ پانی پانی ہوتا رہا۔ اسامہ اور زینب حقیقت سے بے خبر تھے یا پھر انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی۔ یقیناً دونوں کو اپنی ماں اور نانا کے بارے میں تبصرے ناگوار محسوس ہو رہے ہوں گے لیکن انہوں نے اپنی ناگواری کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ سرمد بہ مشکل اس موضوع کو تبدیل کر پایا۔

اس بار اپنے قیام کے دوران اس کا ارادہ قریبی عزیزوں سے ملنے کا بھی تھا۔ حسنِ اتفاق چچا کے پوتے کی شادی کی تقریب اس کے آنے کے چھ روز بعد ہی آ گئی۔ وہ بچوں کو پاکستانی شادی دکھانے کے لیے بہت پرجوش تھا۔ بہت سے شناسا چہروں کو عرصے بعد دیکھ کر اسے دلی مسرت ہوئی لیکن یہ محسوس کر کے وہ بجھ سا گیا کہ ان میں سے

اکثریت اسے دیکھ کے خوش ہونے کے بجائے چہ مہ گوئیوں میں مصروف تھی۔ اس نے ان چہ مہ گوئیوں پر غور کرنے کی بجائے تقریب میں دھیان لگانے کی کوشش کی مگر کہیں کہیں سے اڑتی اڑتی کوئی جلی کٹی بات اس تک پہنچ ہی جاتی۔

اسامہ لاابالی سی فطرت کا لڑکا تھا۔ اس کا تقریباً سارا دن ہی منصور اور ناظمہ کے بیٹوں کے ساتھ لاہور گھومنے میں گزر جاتا تھا۔ اس کے تاثرات جانچنے سے وہ قاصر تھا لیکن زینب حساس لڑکی تھی۔ وہ رویوں کی خوب صورتی اور بدصورتی دونوں کو بڑی شدت سے محسوس کرتی تھی۔ اس کی گم صم کیفیت سے وہ سمجھ گیا کہ وہ خود کو یہاں ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی۔ اس نے بیٹی سے بات کرنے کی ٹھانی اور اس کی اداسی کی وجہ دریافت کی۔

''پاپا......! پتا نہیں کیوں مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا' پلیز آپ مائنڈ مت کیجیے گا...... مجھے چاچو' پھوپھو کسی سے شکایت نہیں...... لیکن وہ مجھے پسند نہیں کرتے۔ نہ مجھے' نہ ماما کو بلکہ پاپا......! آپ کو بھی نہیں...... ایسے میں میں ان کے ساتھ رہنے میں ایزی کیسے فیل کر سکتی ہوں۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو بیٹی! وہ نہ تو تمہیں ناپسند کرتے ہیں' نہ تمہاری ماما اور نہ پاپا کو۔ وہ میری بہنیں ہیں' میں ان کی نیچر سے واقف ہوں۔ انہیں محبت کا اظہار کرنا نہیں آتا اور ناراضی کو چھپانا نہیں آتا۔ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہیں لیکن چوں کہ مجھ سے بے حد شکایتیں بھی ہیں اس لیے فطری طور پر ان شکایتوں اور ناراضی کی زد میں تم بھی آ جاتی ہو اور رہی تمہاری ماں...... تو ان کے خیال میں مجھے اپنے خاندان سے دور کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ اس کا ہے۔ کبھی خود کو ان کی جگہ پر رکھ کے دیکھو۔''

''نو پاپا...... نیور......! میں کبھی خود کو ان کی جگہ پر نہیں رکھ سکتی۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''بہت سے لوگ کیریئر کی خاطر فیملی سے اور ملک سے دور ہو جاتے ہیں' بہت سے لوگ اپنے پیرنٹس کی مرضی کے خلاف شادی کر لیتے ہیں لیکن کوئی اس طرح اوور ری ایکٹ نہیں کرتا۔''

''تم نہیں سمجھو گی' یہ پاکستان ہے' یہ لوگ محبتوں اور رشتوں کے بارے میں اتنے وسیع النظر نہیں ہوتے بلکہ یہ مغرب میں جو خاندان اور اولاد کے حوالے سے تصور ہے اسے کھلے ذہن کا کہنا میرے نزدیک غلط ہے۔ یہ صرف خودغرضی اور......'' اس نے اچانک بات کاٹ دی۔

''سوری پاپا! میں آپ سے ایگری نہیں کرتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یورپ اور امریکہ

میں فیملی سسٹم تباہ ہو چکا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں محبت اور خلوص کا بالکل ہی جنازہ نکل چکا ہو۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ مشرقی ممالک نے اخلاق اور محبت پر اجارہ داری حاصل کر رکھی ہو۔ کیا یہاں خود غرضی، ریاکاری، بد دیانتی اور دھوکا دہی نہیں ہوتی۔"

وہ لاجواب ہو گیا، وہ بولتی رہی۔

"آپ دور گئے تھے ان سے الگ نہیں ہوئے تھے۔ آپ نے وہاں رہ کے بھی اپنی ساری فیملی کی کیئر کی، انہیں ہر طرح سے سپورٹ کیا۔ ماما نے ہمیں سب بتایا ہے۔ وہ اکثر اسامہ اور مجھے یہ بتاتی ہیں کہ کس طرح آپ نے اپنی میرڈ لائف، بزنس اور فیملی کو بیلنس رکھا اور کیسے بغیر کسی صلے کے سارے فرائض ادا کیے۔ وہ ہمیشہ ہمیں آپ کو آئیڈیلائز کرنے کا کہتی رہیں لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ کسی انسان کو اتنا اچھا بھی نہیں ہونا چاہیے۔" اس کی زبان سے اتنی بڑی بڑی اور سنجیدہ باتیں سن کر وہ حیران رہ گیا۔ باپ کی خاموشی محسوس کر کے زینب نادم ہو گئی۔

"سوری پاپا......! میں نے آپ کو ہرٹ کیا لیکن کئی دنوں سے میں مسلسل ہرٹ ہو رہی ہوں اور میں اپنا یہ دکھ شیئر کرنا چاہتی تھی...... کس سے کرتی؟"

"تو تم مجھے الزام دے رہی ہو۔" وہ تھکا تھکا سا بولا۔

"نو پاپا! میں جانتی ہوں آپ میری باتوں سے ناراض بھی ہو رہے ہوں گے، شاید آپ کو غصہ بھی آ رہا ہو۔ ہو سکتا ہے ابھی آپ مجھے ڈانٹنے بھی لگ جائیں لیکن پاپا! مجھے یہ ڈر نہیں کہ آپ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خفا ہو جائیں گے پھر آپ اپنے بہن بھائیوں کی کئی ایک باتیں بری لگنے کے باوجود اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟" اس کی مدلل گفتگو سن کر سرمد مسکرانے لگا۔

"تم تو واقعی سمجھ دار ہو گئی ہو زینب......! اور وقت سے بہت پہلے ہی۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اور تم انسانی رویے اور رشتوں کی اتنی عمدہ پرکھ کیسے کر لیتی ہو۔"

زینب کچھ نہ بولی، اٹھ کے سرمد کے گلے لگ گئی۔

"اوہ پاپا! میں آپ کا کیا کروں...... ماما ٹھیک کہتی تھیں، مجھے صرف اپنا ہی نہیں آپ کا خیال بھی رکھنا ہے کیوں کہ آپ ساری دنیا کے بارے میں سوچ سکتے ہیں، صرف ایک اپنے بارے میں نہیں۔" اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔

"یہ کلثوم میرے اندر تک کیسے اتر آئی۔" وہ زینب کا سر سہلاتے ہوئے سوچنے لگا۔

"ہاں، میں اپنے بارے میں نہیں سوچتا لیکن اس لیے کہ میرے بارے میں سوچنے کے لیے اور بہت سے لوگ ہیں۔ اسامہ، زینب اور...... کلثوم۔" اس نے پورے وثوق سے سوچا۔

* * *

ناظمہ ہر دوسرے دن یہیں آئی ہوتی جب کہ فاطمہ کے کہنے پر نبیل اسے لاہور ہی چھوڑ گیا تھا تاکہ وہ یہ دو ہفتے بھائی کے ساتھ گزار لے۔ وہ واحد ہستی تھی جس کے ساتھ زینب کا کچھ وقت اچھا گزر جاتا تھا۔

ناظمہ کی اب عمرانہ کے ساتھ گاڑھی چھننے لگی تھی بلکہ سرمد دیکھ رہا تھا کہ وہ بعض اوقات بھاوج کی تند و تیز باتیں بھی خوش دلی سے برداشت کر جاتی ہے، حالاں کہ یہ وہی ناظمہ تھی جو کبھی عمرانہ کے ماتھے پر بل دیکھ کے بھی طوفان کھڑے کر جاتی تھی۔ اسے اپنی بہن کے مزاج کی یہ خوش آئند تبدیلی دیکھ کے خوشی ہوئی لیکن جلد ہی اس کی اس خوش مزاجی اور تحمل کا راز بھی کھل گیا۔ وہ اپنی بڑی بیٹی کے لیے منصور سے آس لگائے بیٹھی تھی جب کہ وہ دونوں میاں بیوی پروں پر پانی نہ پڑنے دے رہے تھے۔ ناظمہ نے سرمد سے سفارش کروائی۔

"بھائی جان! ناظمہ کو چاہیے تھا کھل کے مجھ سے بات کرتی۔ آمنے سامنے بات ہو تو زیادہ اچھا ہے۔" منصور کے کہنے پر عمرانہ چمک کے بولی۔

"آمنے کیا اور سامنے کیا، صاف بات ہے کہ میرا طلحہ ناظمہ کی دونوں بڑی لڑکیوں سے چھوٹا ہے، دوسرے نمبر والی صبوحی سے تو چلو چند مہینوں کا فرق ہے مگر وہ عندلیب تو پورے ڈیڑھ سال بڑی ہے۔"

"اتنا معمولی سا فرق کیا معنی رکھتا ہے۔" اس نے کہنا چاہا مگر وہ تمسخر سے کہنے لگی۔

"ہاں بھائی جان! آپ تو یہی کہیں گے۔" وہ اس کے دبے دبے طنز کو پی گیا۔

"اس کی اوپر تلے کی چار بیٹیاں ہیں، کچھ تو بوجھ کم کرنا چاہیے۔"

"دیکھیں بھائی جان! میرا بیٹا ابھی پڑھ رہا ہے، اسے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے ابھی چار پانچ سال لگیں گے۔ باجی اتنے سال عندلیب اور صبوحی کو بٹھائے تو نہیں رکھیں گی۔ ان سے کہہ دیجیے کہ وقت آنے دیجیے، میں انشاء اللہ ہما یا سدرہ میں سے کسی ایک کو طلحہ کے لیے مانگ لوں گا، وہ تسلی رکھیں۔" عمرانہ نے بلبلا کے کچھ کہنا چاہا مگر منصور

اسے کڑی نظروں سے دیکھ کے رہ گیا۔

''بس کرو عمرانہ! یہ وقت نہیں رہا اب ایسی باتوں کا۔ ہمارے بچے جوان ہو چکے ہیں' اگر اس کی چار بیٹیاں ہیں تو ایک بیٹی میری بھی ہے۔ اپنے ہی اپنوں کو ڈھکتے ہیں۔ باجی کا بوجھ ہم بانٹیں گے' کل کو کوئی ہمارا بوجھ بانٹے گا۔ بہن بھائی ایسے ہی موقع پر کام آتے ہیں۔''

وہ بیوی کو سمجھاتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے سرمد کو دیکھتا رہا جب کہ وہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھایا اور منصور کو جھجکتے ہوئے مخاطب کیا۔

''بیٹی تو...... منصور بیٹی تو میری بھی ہے اور ابھی ابھی...... بالکل ابھی اسی وقت اچانک میرے ذہن میں خیال آیا ہے کہ تم سے اور ناظمہ سے کہیں زیادہ پریشان تو میں ہوں۔ تم لوگ بھرے پرے کنبوں میں رہ رہے ہو' اپنے دیس میں' آپ لوگ تو جانتے ہیں وہاں کا ماحول...... وہ تو شکر ہے اللہ کا کہ کلثوم کی تربیت نے ایسی نوبت نہیں آنے دی۔ میری بیٹی اور بیٹا دونوں ہی اللہ کے فضل سے بہت اچھی سوچ اور کردار کے مالک ہیں۔ منصور! کیا تم اپنے دوسرے بیٹے طیب کے لیے میری زینب......''

منصور تو ابھی چہرے پر تذبذب کے آثار لیے بھائی کا مدعا سن ہی رہا تھا لیکن عمرانہ نے بات پوری ہونے کا انتظار تک نہ کیا اور بیچ میں بول پڑی۔

''میرے اور منصور کے درمیان شروع سے ہی یہ طے ہو چکا ہے بھائی جان! کہ ایک بیٹے کا رشتہ ددھیال میں اور دوسرے کا ننھیال میں ہوگا۔ اب بیٹھے بٹھائے انہوں نے...... بغیر مجھ سے مشورہ کیے آپ سے باجی کی بیٹی کے لیے ہامی بھر لی تو ظاہر ہے کہ اب طیب پر میرا حق ہے' میری بھی تین بہنیں ہیں اور تینوں بہنوں کی بیٹیاں ہیں۔ کیا مجھے ان کا بوجھ نہیں بانٹنا چاہیے۔ کیا میں اپنی بہنوں کے کام نہیں آ سکتی۔''

وہ ہاتھ نچا نچا کے بولتی' کبھی منصور اور کبھی سرمد کو دیکھتی رہی۔ سرمد نے فوراً اعتراض کرنا چاہا۔

''لیکن آپ کی بہنیں......'' اچانک وہ رک گیا۔ بہت سال بیت چکے تھے پھر بھی ایسا ذکر بھی نہیں ہوا تھا لیکن ایسی بات نہیں تھی کہ وہ یہ بھول چکا تھا کہ عمرانہ ایک کرسچن فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔

''کیوں کیا خرابی ہے میری بہنوں میں؟'' وہ تنک کے بولی۔

''بھائی جان! عمرانہ کی دونوں چھوٹی بہنیں مسلم گھرانوں میں بیاہی گئی ہیں۔''

منصور بھائی کی ادھوری بات کی تہہ تک میں اتر کے آہستہ آواز میں بولا۔ وہ سر ہلا کے رہ گیا۔ واقعی اسے اس سلسلے میں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ دونوں اپنے بیٹوں کے بارے میں خودمختار تھے جہاں چاہتے فیصلہ کرتے لیکن پھر بھی اسے عمرانہ کا یوں تنک کے منہ پر جواب دینا پسند نہ آیا۔

''جہالت کبھی سدھر نہیں سکتی۔ انکار کا بھی کوئی طریقہ سلیقہ ہوتا ہے مگر یہ عورت...... نہ جانے منصور اس کے ساتھ کیسے گزارا کر رہا ہے۔ ہر بات میں اللہ کی مصلحت شامل ہوتی ہے۔ میری زینب کہاں تک اس جاہل اور بدزبان عورت کو جھیلتی۔ نہ جانے کیوں میں یہ بات فراموش کر گیا۔'' اس نے اپنا غصہ پیتے ہوئے حسب عادت اس میں بھی ایک مثبت پہلو ڈھونڈ لیا۔



''یہ تو تم نے بہت اچھا کام کیا سرمد! خود میں بھی یہ بات منصور سے کر سکتی تھی لیکن وہ اس کا دم چھلا...... وہ عمرانہ...... ایک پل شوہر کو اکیلا نہیں چھوڑتی۔ اللہ تمہارا بھلا کرے جو سلیقے سے یہ بات نباہ دی۔ چلو چار میں سے ایک کا تو سبب بنا۔ نہ سہی بڑی' تیسری والی ہی سہی لیکن بھائی میرے' سچ تو یہ ہے کہ جتنی پریشان میں صبوحی اور عندلیب کے لیے ہوں اتنا ہما اور سدرہ کے لیے نہیں ہوں۔ ان کم بختوں کی تو شکلیں بھی اچھی ہیں اور ان کے جوڑ کے رشتے ددھیال میں بھی ہیں۔ اگر ہما منصور نے لے لی تو ادریس سے کہلوا کے سدرہ کے لیے اس کے چاچے تائے پر زور ڈلواؤں گی' مگر یہ صبوحی...... یہ تو سل کی طرح میرے سینے پر جمی پڑی ہے۔'' ناظمہ نے سرمد سے ساری بات سننے کے بعد کہا۔

''ناظمہ! بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں۔ ہاں ذمہ داری ضرور ہوتی ہیں...... تو کیا بہن بھائی ایک دوسرے کی ذمہ داریاں بانٹ نہیں لیا کرتے۔'' سرمد کے خیالات جان کے ناظمہ کے چہرے پر چمک آ گئی۔

''تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔''

''تو پھر...... زینب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ناظمہ......! رفیع کے ساتھ اس کا جوڑ کیسا رہے گا؟ دونوں کی عمر کے درمیان بھی مناسب فرق ہے اور مزاجاً بھی دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔ رفیع بھی بہت کم گو اور سنجیدہ مزاج ہے' بالکل میری زینب کی

طرح۔''

''نن...... نہیں نہیں' تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ناظمہ کے چہرے کی چمک ماند پڑ گئی اور رنگ پھیکا ہوگیا۔ گڑبڑا کے وہ فوراً اس کے اندازوں کی نفی کرنے لگی۔ ''میرا رفیع تو بڑا ہنسوڑ اور کھلنڈرا ہے۔ ایک منٹ نچلا نہیں بیٹھتا۔ وہ تو بس ویسے ہی آج کل...... ہاں...... وہ شاید تمہارے لحاظ میں یا پھر تمہارے سامنے خوامخواہ سنجیدہ بنا رہتا ہے۔'' پھر ایک دم اس نے اپنا لہجہ بدل لیا۔

''اور یوں بھی میں تو تم سے آس لگائے ہوئے تھی کہ شاید تم ہی صبوحی یا عندلیب کی طرف توجہ دے لو۔ تمہارا اسامہ تو طلحہ سے ڈیڑھ دو برس بڑا ہی ہے۔''

''ہاں اس بارے میں بھی سوچا جاسکتا ہے لیکن پہلے تم میری بات کا جواب تو دو...... سوال پہلے میں نے کیا ہے' پہلے اس معاملے کو نمٹا لیں پھر دوسرا دیکھیں گے۔''

''دوسرا معاملہ؟ تمہارا خیال ہے میں اس وٹے سٹے پر تیار ہوجاؤں گی؟ نا بابا نا...... اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا مجھے۔''

''وٹہ سٹہ کیسا؟ ابھی تم ہی تو کہہ رہی تھیں کہ بھائی بہنوں کے درمیان بھی اگر یہ تکلف اور گریز ہونے لگا تو رشتوں میں خالص پن کیسے برقرار رہے گا۔''

''لیکن جو بات تم کر رہے ہو' اس کے نتیجے میں تو رشتے بھی برقرار نہیں رہیں گے۔ میں نے وٹے سٹے کے ہاتھوں بڑے بڑے خاندان اجڑتے دیکھے ہیں مجھے تم باز ہی رکھو۔'' اس نے ہاتھ جوڑے۔

''ویسے بھی بیٹیوں کے ہوتے میں رفیع کے بارے میں فی الحال سوچنا نہیں چاہتی۔''

''آخر کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی تمہیں اس کی شادی تو کرنا ہی ہے۔ مجھے بھی زینب کی شادی کی جلدی نہیں' ابھی اسے بہت پڑھنا ہے۔ میری مانو تم یہ بات بھی ادریس بھائی صاحب کے سامنے رکھ دینا۔ ظاہر ہے کہ میں بھی کلثوم سے مشورہ کیے بغیر کوئی حتمی جواب تمہیں نہیں دے سکتا اور پھر بچوں کی رائے جاننا بھی ضروری ہے۔ یہ تو بس ایسے ہی میں تم سے اپنا خیال ہی ظاہر کر رہا تھا۔ تمہارے اندیشے بالکل بے بنیاد ہیں۔ وٹہ سٹہ نقصان دہ ضرور ہے مگر اپنوں میں کیا نقصان......'' اس نے زور دینے کی کوشش کی مگر وہ بدستور نفی میں سر ہلاتی رہی۔

''نہ بھائی! تم کسی آس پر مت رہنا اور نہ ہی دوبارہ یہ ذکر کرنا۔ تمہاری بیٹی باہر

پلی بڑھی' وہ تو یہاں رہنے سے رہی...... ظاہر ہے کروڑ پتی نانا کی نواسی' اتنے بڑے بزنس مین کی بیٹی ایک بینکر کی بہو بن کے اندرونِ لاہور کے مکان میں تو رہ نہیں سکتی اور میرا اکلوتا بیٹا...... چار بہنوں کا ایک بھائی' اپنے باپ کا واحد سہارا' اسے کیسے میں سات سمندر پار بھیج دوں۔ نہ تو مجھ میں اتنا حوصلہ ہے' نہ ہی میں اتنی خودغرض ہوں کہ بھائی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے اپنے شوہر کی نسل کے واحد وارث کو اس سے دور کر دوں۔''

''لیکن میں تو اب یہیں......'' وہ اسے اپنے مستقلاً پاکستان شفٹ ہونے کی اطلاع دینے ہی والا تھا کہ اچانک زور زور سے بولتی عمرانہ کمرے میں داخل ہوئی اور سرمد مصلحتاً خاموش رہا لیکن بھاوج سے بات چھپا لینے کے باوجود وہ بھائی کو آگاہ کرنا نہ بھولا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ ناظمہ کی سفارش منصور سے کرسکتا ہے تو منصور بڑے بھائی کی بیٹی کے لیے بہن پر دباؤ کیوں نہیں ڈال سکتا۔ ابھی وہ منصور سے صرف زینب کی بات چھیڑ دینے کے ذکر تک ہی پہنچا تھا کہ وہ کہہ اٹھا۔

''کیوں اپنی پھول سی بچی رولنی ہے بھائی جان! ناظمہ ہے تو میری بہن لیکن وہ کتنی تکلیف دہ چیز ہے' اس کا اندازہ بھی مجھے ہی سب سے بڑھ کے ہے۔ اس کی زبان شروع ہی سے کڑوی ہے اور بدمزاج بھی شروع سے ہے' چار نندیں' دو جٹھانیاں اور تین دیورانیاں...... محاذ آرائی کے لیے ہمیشہ ماحول سازگار رہتا تھا۔ ان سے لڑ مر کے ایسی عادت پڑ گئی ہے باجی کو کہ اب وہ کسی کو بخشنے پر تیار نہیں ہوتیں۔ خدا کا واسطہ ہے دوبارہ یہ ذکر بھول کے مت کیجیے گا' بہت پچھتائیں گے۔ آپ کے سامنے کل ساری بات واضح ہوگئی تھی کہ میں کس قدر مجبور ہوں' کیا کروں بیوی کی بھی ماننا پڑتی ہے۔ اس بدنصیب نے اس گھر میں آ کے کون سا سکھ دیکھا ہے۔ کبھی میرے کاروبار کی ناکامیاں' کبھی تنگ دستی' کبھی مایوسی' آپ کو کیا خبر...... کوئی اور عورت ہوتی بلکہ کوئی اور کیوں آپ ہی کی بیوی ہوتی تو دیکھتا کتنے دن یہ خدمت کرتی۔ ایسے میں اس عورت کا بھی حق بنتا ہے کہ وہ مجھ سے کچھ منوا سکے اور کچھ نہیں تو اپنے بیٹے کا فیصلہ ہی خود کرسکے ورنہ زینب کی مجھے کتنی خواہش ہے' میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ اسے دیکھ کے آنکھوں میں ٹھنڈک اتر آتی ہے ورنہ آج کل کی لڑکیاں...... اور کوئی نہیں تو اپنی باجی کی ہی چاروں دیکھ لیں۔ باجی نے بچپن سے ہی خاندانی جھگڑوں میں الجھا الجھا کے انہیں پکا کردیا ہے۔ ہر سازش' غیبت اور مکر میں ماں کی برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ بس آپ کا کہا لوٹا نہیں سکا اس لیے طلحہ کے لیے سدرہ کی ہامی بھر بیٹھا...... خیر اس کے لیے اس کی ساس یعنی میری بیگم کافی ہوگی۔'' وہ

ہنسنے لگا پھر ایک دم جھک کر راز داری سے کہنے لگا۔

''کہیں ناظمہ باجی نے آپ کو بھی تو پھنسانے کی کوشش نہیں کی۔''

کب سے اس کی عجیب وغریب گفتگو منہ کھول کے سنتا' سرمد ہونق پن سے اسے تکنے لگا۔

''اوہو بھائی جان! ایک تو آپ بھولے بہت ہیں' دنیاداری آپ کو چھو کے نہیں گزری۔ کوئی آپ سا سادہ نہ ہو۔ کہیں باجی کے جذباتی ڈرامے کا شکار ہو کے ان کی عندلیب یا صبوحی میں سے کسی ایک کو چن نہ بیٹھیے گا۔ سچ سچ بتائیے کہیں باجی نے آپ کے آگے بھی تو رونے نہیں روئے۔''

وہ کریدنے لگا۔ سرمد اس کے درست انداز پر حیران رہ گیا لیکن اس کی تصدیق نہ کر سکا۔ جو بھی تھا' وہ اتنا ''بلند حوصلہ'' ابھی نہ ہوا تھا کہ اپنی ہی بڑی بہن کے مزید بخیے ادھیڑنے کا موقع خود فراہم کرتا۔ اس نے خاموشی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ اب کے حیران ہونے کی باری منصور کی تھی۔

''کمال ہے وہ تو آپ کے آنے کے دوسرے دن سے یہ پروگرام بنائے بیٹھی تھیں۔ اسامہ پر ان کی گہری نظر ہے۔ اتنے لائق فائق گھبرو جوان کے سر اپنی بدمزاج اور جنگجو بیٹی منڈھنا چاہتی ہیں۔ آپ کا ایک ہی بیٹا ہے۔ دیکھ بھال کے بہو منتخب کیجیے گا۔ اب میری بینش کو ہی دیکھ لیں۔ ماں نے اتنی اچھی تربیت کی ہے' ان شاء اللہ جہاں جائے گی' اجالا کر دے گی۔ اس کے سسرال والے عمر بھر ہمیں دعائیں دیں گے کہ کیسا نایاب گوہر ان کے حوالے کیا۔''

وہ ٹٹولنے والی نظروں سے بھائی کو دیکھتے ہوئے بولا مگر سرمد کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

اس کی سمجھ سے یہ سارا کھیل بالاتر تھا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا روز ایک نئی الجھن اسے تذبذب میں ڈال دیتی۔

***

ابھی تک وہ بھائی بہنوں پر اپنا مستقل لاہور شفٹ ہونے کا پروگرام اس لیے ظاہر نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ کلثوم کی رائے کے عین مطابق یہ فیصلہ اسامہ اور زینب کی مرضی سے کرنا چاہتا تھا۔ زینب کا تنفر تو اس کی خاموشی اور تحمل کے باوجود اس پر ظاہر ہو چکا تھا البتہ اسامہ کی مرضی جاننا باقی تھا۔

وہ رفیع کے ساتھ اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ سرمد نے ہی اسے وہاں بھیجا تھا۔ اپنے برے وقتوں کے ساتھی سعید کے پاس۔ وہ سعید جو اس کے امریکہ آنے کے بعد اس کا سہارا بنا تھا جس نے اسے اس کو پہلی پہلی ملازمت دلوائی تھی۔ سرمد نے کبھی اپنے محسنوں کو فراموش نہیں کیا تھا۔ مائیک جو کثرتِ شراب نوشی کے باعث ڈرائیونگ کرنے سے قاصر ہو چکا تھا' سرمد نے نہ صرف اس کا علاج کروایا تھا بلکہ اس کو اپنے پیٹرول پمپ پر ملازمت بھی دلوائی تھی۔ سعید جو کئی سال سے امریکہ میں چھوٹی موٹی ملازمتوں کے ذریعے روٹی کمانے کے لیے دھکے کھا رہا تھا اسے بغیر کسی قسم کی شرائط کے کاروبار شروع کرنے کے لیے قرضہ دلوایا۔ جلد ہی وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ معمولی پیمانے پر شروع کیا گیا اس کا کاروبار خوب پھلا پھولا چوں کہ اس کے بیوی بچے پاکستان میں ہی تھے اس لیے پانچ سال پہلے وہ اپنا سارا بزنس وائنڈاپ کر کے واپس چلا گیا تھا اور آج کل اسلام آباد سیٹل تھا۔

سرمد نے آنے سے پہلے اس کو بھی اطلاع کر دی تھی اور جب سے وہ آیا تھا مسلسل سعید کے بلاوے آ رہے تھے۔ سرمد نے فی الحال اسامہ کو وہاں بھیج دیا تھا تاکہ پہلے وہ اچھی طرح سعید کے بزنس کا جائزہ لے لے کیوں کہ سعید نے اسے اپنے بزنس میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی بلکہ اس نے تو اس کے سامنے اور بھی کئی پروپوزل رکھے تھے جن کے بارے میں اس نے فی الحال غور کرنے کی زحمت نہ کی تھی لیکن اب وہ سنجیدگی سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔

گھر میں ہونے والی عجیب سازشی اور دوغلی سرگرمیاں اسے اپنے فیصلے جلد از جلد عمل کرنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

اور اس رات جب اچانک زینب آنسو بہاتی اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور وہ اس کی شکایتوں پر تڑپ کے بہن سے گلہ کرنے گیا تو وہاں ہونے والی گفتگو سن کے اس نے یک لخت اس فیصلے پر عمل کر لیا' حالاں کہ جس وقت زینب نے اسے عندلیب اور صبوحی کے تبصرے بتائے تو وہ سن کر بھی یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔

''پاپا! بس بہت ہو گیا۔ آخر ہر چیز کی کوئی حد ہوتی ہے' خصوصاً جس دن یہ عندلیب وغیرہ آتی ہیں تب تو مجھے اتنا کچھ سننا اور سہنا پڑتا ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔''

''بیٹا! میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ بہن بھائیوں کے درمیان مذاق اور

چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی ہے' اسے یوں دل پر نہیں لینا چاہیے۔'' اس نے روتی ہوئی زینب کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے اسے گلے سے لگایا' حالاں کہ وہ خود حیران ہو رہا تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہوگئی جو زینب جیسی متحمل مزاج لڑکی یوں تڑپ کے رو رہی ہے۔

''پاپا! یہ مذاق ہے؟ جس دن سے میں یہاں آئی ہوں میری ہر بات ان کے لیے تماشا ہے' ڈرامہ ہے' ڈھکوسلہ ہے' میرا شلوار قمیص پہننا ان کے نزدیک ڈراما بازی ہے' میرا سر پر دوپٹہ اوڑھنا انہیں ناٹک لگتا ہے۔ کبھی مجھ سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا میں اپنے ماما اور پاپا کے سامنے ڈرنک کر لیتی ہوں یا چھپ کے اپنا شوق پورا کرتی ہوں۔''

''واٹ......؟'' وہ اچھلا۔

''بس پاپا......! اور یہ تو وہ باتیں ہیں جنہیں میں کب سے نظرانداز کرتی آرہی ہوں لیکن کل سے...... پرسوں پہلے تو بینش مجھ سے بڑا دوستانہ قائم کرتے ہوئے مجھ سے یہ اگلوانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میرے کتنے بوائے فرینڈ ہیں......؟'' اس کے سر جھکا کے کہنے پر سرمد بھی نظریں جھکا کے رہ گیا۔

''مجھے اس کا بار بار کریدنا برا لگا پھر بھی میں نے تحمل اور شائستگی سے اسے ٹال دیا لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ اتنی جھوٹی ہے۔ اس نے اپنی طرف سے پتا نہیں کیا چٹپٹے قصے پھوپھو کی بیٹیوں کو سنائے کہ کل سے' جب سے وہ آئی ہوئی ہیں انہوں نے میرا جینا حرام کر دیا۔ عندلیب بینش کو مشورہ دے رہی تھی کہ جب تک میں یہاں ہوں وہ اپنی ممی کے کمرے میں رہا کرے ورنہ میری کمپنی اسے بھی خراب کر دے گی اور صبوحی اپنے بھائی کے بارے میں خدشات ظاہر کر رہی تھی کہ میں اسے پھانسنے کے چکر میں ہوں اور پاپا! یو نو...... یہ سب باتیں وہ میرے سامنے کرتی ہیں۔ میرے ساتھ بیٹھ کے اور ان کی اتنی ہمت کیسے بڑھی...... آپ جانتے ہیں؟ صرف آپ کی وجہ سے...... لیکن پاپا! میں آپ کی بیٹی ضرور ہوں لیکن آپ کی کم زوریوں کی حصہ دار نہیں بنوں گی۔ میں ان سے خود نمٹ سکتی تھی لیکن میں آپ کے پاس آئی ہوں' صرف یہ جاننے کے لیے کہ آپ خود پر ہونے والی ہر زیادتی سہہ جاتے ہیں' بڑی سے بڑی بات پی جاتے ہیں' کیا آپ میرے ساتھ بھی یہی سب ہونے دیں گے؟''

آنکھوں میں آنسو بھرے اس نے ایسا سوال کیا کہ سرمد تڑپ کے کھڑا ہوگیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ منصور کے کمرے کی طرف بڑھا' وہ جانتا تھا جب ناظمہ وہاں رہنے آئے تو رات دیر تک سب کی محفل اسی کے کمرے میں لگا کرتی۔ ڈرائنگ' ڈائننگ سے

گزرتا ہوا جب وہ بڑے سے لاؤنج میں پہنچا جو اس وقت اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا تو منصور کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے آتی گفتگو میں اپنے نام کی تکرار سن کر وہیں تھم گیا اور ناظمہ کے الفاظ سن کر تو دنگ رہ گیا۔

''آئے ہائے کیا میرے رفیع کے لیے وہی جمعدارنی رہ گئی ہے۔ سرمد کو تو ذرا حیا نہ آئی' کیسے منہ پھاڑ کے اپنی کم صورت بیٹی میرے سامنے رکھ دی۔ میں تو سچ پوچھو گھبرا ہی اٹھی۔ کیسے انکار کرتی' دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک طمانچہ رسید کروں اس ذلیل کے منہ پر۔''

اور سرمد کو لگا جیسے اس کے چہرے پر طمانچوں کی بوچھاڑ ہوگئی ہو۔ سنسناتے رخساروں کے ساتھ وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔

''خود تو بے غیرت ساری عمر سسر کے گھر کا کتا بنا رہا' اب اپنی بیٹی کو ٹھکانے لگانے کے لیے بھی وہی حربہ آزما رہا ہے جو اس کی بیوی کے لیے اُس کے باپ نے سوچا تھا۔ اس کا خیال ہوگا میرے بیٹے کو سات سمندر پار لے جائے گا اور اپنی دولت کی رکھوالی کے لیے اسے بھی کتا بنا کے رکھ دے گا۔ جیسے میری ماں مرتے دم تک بیٹے کی صورت کو ترستی رہی' میں بھی بغیر اسے دیکھے مر جاؤں۔ میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی دولت پر۔''

''لیکن باجی! آپ بھائی جان سے بات تو کرتیں۔'' فاطمہ نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے ان کا ارادہ ایسا نہ ہو۔ میرا مطلب ہے وہ رفیع کو گھر داماد بنانے کے بجائے یہیں سیٹل کر دیتے۔''

''تم الٹی پٹیاں مت پڑھاؤ۔'' منصور نے اسے جھڑک کے رکھ دیا۔ ''بھائی صاحب کی عادت میں اچھی طرح جان چکا ہوں' وہ کسی کو دمڑی دینے کے روادار نہیں۔ ہر وقت یہی رونے روتے رہیں کہ جو کماتا ہوں سب بھیج دیتا ہوں۔ ارے اتنے تگڑے سسر کے کاروبار پر جمے بیٹھے تھے کوئی تو وجہ تھی پتا نہیں سسر اور بیوی سے چھپ چھپا کے اندر ہی اندر کتنا مال اپنا کر لیا ہو۔ یہی دیکھ لو' اتنے سالوں میں پلٹ کے اس بنگلے میں اپنا حصہ نہیں مانگا بلکہ واپس آکر پوچھ گچھ کرنے کی زحمت تک نہ کی' حالاں کہ میں تو کتنا عرصہ ڈرا رہا کہ کہیں ان کے آنے سے سارا کھیل نہ بگڑ جائے۔ اباجی کے بار بار کہنے پر بھی میں نے ان کی بیماری کی اطلاع وہاں نہ دی اور تدفین سے صرف ایک گھنٹہ پہلے خبر بھجوائی کہ کہیں وہ آکر ان کی وصیت کے کاغذات نہ مانگ لیں اور ان کے جعلی ہونے کا

راز نہ کھل جائے لیکن کیا وہ آئے؟ نہیں نا؟ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں کروڑ ڈیڑھ کروڑ کے ہاتھ سے نکلنے کا کوئی افسوس نہیں...... وہ تو وہاں لمبے ہاتھ مار رہے تھے۔''

اس کے انکشاف پر سرمد ڈھے گیا۔ کتنے سال اس نے اس حقیقت سے نظریں چرائے رکھیں۔ ذہن میں بار بار پیدا ہوتے اس خیال کو وہ وسوسہ کہہ کر جھٹلا دیتا اور سختی سے خود کو ٹوکتا ''اپنے ہی بھائی پر شک' تف ہے تم پر'' اور اس کا اس صبر اس کا درگزر کرنا کس کام آیا یہ اس کے دور کی کمائی تھی جب اسے پیسہ اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتا تھا جتنا اب ہوتا ہے۔ بڑی جان ماری تھی اس نے اس رقم کے لیے۔ آج سب کچھ حاصل ہو جانے کے بعد بھی اسے اس پونجی کے ضائع ہونے کا افسوس نہ جاتا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ یہ سرمایہ اس نے بھروسہ اور اعتماد کے ہاتھوں گنوایا تھا لیکن منصور کے نزدیک اس کی چشم پوشی کی وجہ کیا تھی...... یہ؟ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر پھر سے کان کمرے سے آتی آوازوں کی طرف لگائے۔

''کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ امریکا میں کروڑوں کی جائداد ہونے کے باوجود وہ ہم پر ظاہر نہیں کرتے کہ کہیں کسی بھائی بہن کو کچھ دینا نہ پڑ جائے۔ تو اتنی توفیق انہیں کہاں ہوگی کہ بیٹی کو جہیز میں بنگلہ اور فیکٹری دے دیں۔ وہ تو داماد کو بطور جہیز ساتھ لے جانے کے چکر میں ہیں۔ مجھے بھی پھانسنا چاہ رہے تھے۔ وہ تو عمرانہ کے دماغ نے کام کیا اور جان چھڑائی۔''

''اچھا کیا عمرانہ نے' ظاہر ہے میری بیٹی بھی اب تمہارے گھر آئے گی۔ اس کا گزارا زینب جیسی کے ساتھ نہیں ہونے والا۔ کہاں میری گھریلو سی سیدھی سادی بیٹیاں اور کہاں یہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی امریکن۔''

''نہیں باجی! ایسی بات نہیں' زینب اچھی لڑکی ہے۔'' فاطمہ نے پھر سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''امریکا میں پلی بڑھی ہونے کے باوجود اس میں اچھی عادات پائی جاتی ہیں۔''

''رہنے دو تم فاطمہ! رہنے دو' تم تو ہمیشہ بے وقوف ہی رہو گی۔ زینب جیسی لڑکیاں ہماری تمہاری بیٹیوں کی جیسی نہیں ہوتیں۔ اس کی ماں نے اس کی خاک تربیت کرنی تھی وہ تو خود کسی شرابی' حبشن کی اولاد تھی۔ میری صبوحی نے خود بتایا ہے کہ وہ روز رات کو چوری چھپے سُوٹے لگاتی ہے۔ کیا خبر بوتل بھی چھپا کے رکھی ہو۔ ارے میں تو کنواری لڑکی کی چال پہچان لیتی ہوں۔ یہ...... یہ تو روز کلبوں میں رُلنے والی لگتی ہے' تب ہی شکل پر

لعنت برستی ہے۔''

سرمد کے اعصاب منجمد ہو گئے۔ اس کی رگوں میں خون کے بجائے لاوا اُبلنے لگا۔ اس کے برف پڑتے پیر جم چکے تھے۔ اس کے اندر باہر...... ایک ہی سوال کی تکرار تھی۔

''کیوں؟ کیسے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ناظمہ ایسا کیسے کہہ سکتی ہے؟ میری ہی ماں جائی ہے وہ...... کیسے وہ میری بیٹی کے بارے میں اتنے بے بنیاد الزام......''

''بالکل درست فیصلہ کیا آپ نے باجی! میں تو چھوٹا ہوں' منہ پر سچ نہیں کہہ سکتا۔ آپ ہی اپنے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھاتیں اور کھری کھری انہیں سنا دیتیں۔'' منصور کے اکسانے پر ناظمہ نے احسان جتاتے ہوئے کہا۔

''کیا کروں' آخر ہے تو بھائی...... اور پھر......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ آخر اسے اپنی بیٹی بھی تو ٹھکانے لگانا تھی۔ اسامہ کے لیے...... اسامہ...... جو اسی حبشن کا بیٹا ہے جس کا خون زینب کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔

''میری بیٹی ان کے لیے گالی ہے تو اپنی بیٹی میرے لیے گھر میں دینے کے لیے وہ اتنے بے تاب کیوں ہیں؟''

''بھئی مان گیا ہوں اپنے بھائی صاحب کو' چالیں چلنا تو کوئی ان سے سیکھے۔ کس قدر چالاکی اور مکاری سے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔'' یہ وہی منصور تھا جو دو روز قبل اسے کہہ رہا تھا۔

''بھائی جان! آپ بھولے بہت ہیں' دنیاداری تو آپ کو چھو کے نہیں گزری۔ کوئی آپ سا سادہ بھی نہ ہو۔'' منصور کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ وہ خود کو سنبھالتا ڈولتے قدموں کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔

''ہاں کوئی مجھ سا بھی نہ ہو' کم زور' بے بس' بزدل...... محبت نے مجھے بزدل بنا دیا تھا۔ اپنوں کی محبت...... میں بزدل ہی تو تھا' ڈرتا رہا میرے کسی عمل سے یہ لوگ مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں۔ مجھے خود سے الگ نہ کر دیں۔ زینب سچ کہتی ہے کہ جن کی ناراضی کے ڈر سے آپ دل کی بات نہ کہہ سکیں وہ اپنے کیسے ہو سکتے ہیں۔ کم از کم اتنا مضبوط تو بننا ہی ہوگا کہ اپنی بیٹی کی طرف اٹھنے والی انگلیاں توڑ کے رکھ دوں۔'' ایک محبت نے اسے کم زور بنا دیا تھا تو ایک محبت نے اسے مضبوط بنا دیا۔ یہ محبت اس کی بیٹی کی محبت تھی۔ اسی محبت نے اسے پھر سے ان کا سامنا کرنے پر اکسایا۔

اس کے ایک دم اندر آ جانے سے عمرانہ' منصور اور ناظمہ کے قہقہے تھم گئے۔

"بھائی جان! آپ اس وقت؟ آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟" سب سے پہلے منصور نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں، اسامہ کا فون آیا تھا اور ابھی ابھی اس سے پروگرام فکس کرنے کے بعد میں تمہیں بتانے آیا ہوں۔"

"کیا؟" وہ چاروں بے تابی سے کہہ اٹھے۔

"یہی کہ صبح کی فلائٹ سے میں اور زینب اسلام آباد جا رہے ہیں۔ اسامہ کو وہ شہر بھی پسند آیا ہے اور سعید کا آئیڈیا بھی۔ دراصل میں آپ سے ذکر کرنا بھول گیا۔ میں اپنے دوست سعید کے مشورے پر اسلام آباد میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل کھولنا چاہتا ہوں۔ اس مقصد کے لیے میں نے فیملی سمیت پاکستان مستقلاً شفٹ ہونے کا ارادہ کرلیا ہے اور ناظمہ! تم سے اور منصور دونوں سے معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گا کہ میرے بیٹے کو سعید کی بیٹی عروبہ پسند آ گئی ہے اس لیے تم دونوں کی خواہش پوری کرنا اب میرے بس میں نہیں۔"

اتنا کہہ کر اس نے باری باری منصور اور ناظمہ کے چہرے دیکھے، دونوں ہی ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔

"حالاں کہ تم دونوں نے ہی اسامہ کے لیے اپنی اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا، ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ میں خود تذبذب کا شکار تھا کہ بینش اور عندلیب میں سے کس کا انتخاب کروں۔ ایک کو پسند کرتا ہوں تو دوسرے فریق کی ناراضی کا خدشہ تھا اور ویسے بھی مجھے تو کوئی درست مشورہ دینے والا ہی نہیں تھا، اگر منصور سے پوچھتا ہوں تو اس کی رائے کے مطابق عندلیب اور صبوحی میرے بیٹے کے لیے قطعی مناسب نہیں۔ وہ کچھ ذکر تو کررہا تھا ان دونوں کی تلخ مزاجی اور بدزبانی کا...... اور بھئی میرے گھر کا ماحول تو بڑا پرسکون ہے۔ میں اس میں کسی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتا۔"

اس کے صاف صاف کہنے پر ناظمہ نے دانت کچکچاتے ہوئے منصور کو دیکھا جو اتنی کھری سن لینے کے بعد آئیں بائیں شائیں کر رہا تھا۔ سرمد نے مزید کہا۔

"ادھر ناظمہ کی رائے بھی بینش کے بارے میں کچھ ٹھیک نہیں تھی کہ وہ دن میں ایک تنکا تک نہیں توڑتی اور تو اور کئی سالوں سے میٹرک نہیں کر پا رہی جب کہ اسامہ اعلا تعلیم یافتہ ہے، اس کا گزارا نان میٹرک کے ساتھ کیسے ہوسکتا ہے؟"

عمرانہ نے کھا جانے والی نظروں سے نند کو دیکھا جس کو اعتماد میں لے کر ہی اس

لیے یہ ڈھونگ رچا رکھا تھا کہ بینش تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔

"جاتے جاتے میں ایک دفعہ پھر آپ دونوں سے معذرت کروں گا۔ میں نے تو کوشش کی تھی کہ ہمارا رشتہ آئندہ نسلوں تک جڑ پکڑ جائے۔ زینب کا معاملہ تم دونوں کے آگے رکھنے کی بھی یہی وجہ تھی ورنہ میری بیٹی کو رشتوں کی کمی نہیں لیکن اگر ایسا کچھ بھی طے نہ پاسکا تو خدا کی یہی مرضی ہوگی۔ میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا، اس لیے میرا یقین ہے کہ اللہ بھی ہر کام میں اچھائی ہی اچھائی رکھتا ہے۔ عروبہ اچھے گھرانے کی تعلیم یافتہ پردہ دار لڑکی ہے۔ یہ جو پردیسی ہوتے ہیں نا...... انہیں اپنی اقدار، دیس میں رہنے والے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ وہاں کی سرد بے رحم ہواؤں کے ڈر سے ہم اپنی نسل کو زیادہ سنبھال سنبھال کے بچا رکھتے ہیں۔ اسامہ کو ایسی ہی حیادار اور مشرقی لڑکیاں پسند ہیں اور میں بھی اپنی آئندہ نسل کے لیے ایسی ہی بہو کا متلاشی تھا۔

اور بالکل یہی خیالات میرے امریکا میں رہنے والے دوست انور کے ہیں۔ وہ بھی اپنی آنے والی نسلوں کی بہتر تربیت کے لیے ایک ایسی بہو کا خواہش مند ہے جو حسنِ صورت کی بجائے حسنِ سیرت سے مالا مال ہو جو اپنی ستھری سوچ اور پاک کردار کے بل بوتے مغرب کی بے باک فضا میں بھی ایک آئیڈیل گھرانہ تشکیل دے سکے اسی لیے اس نے زینب کا ہاتھ مانگا تھا۔ اس کا بیٹا حافظ قرآن ہے اور کینیڈا کی پاکستانی ایمبیسی میں اعلا پوسٹ پر سفارت کار بھی ہے لیکن میں نے اسے ٹال دیا۔ میری خواہش تھی کہ اگر میں پاکستان شفٹ ہورہا ہوں تو بہتر ہے کہ زینب بھی میرے پاس رہے لیکن...... لیکن مجھے یہ جان کے بڑا دکھ ہوا کہ یہاں سب دل لبھانے والی صورتوں کے طلب گار ہیں۔ شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ زینب نے قرآن مجید بمع تفسیر کے پڑھ رکھا ہے اور وہ باقاعدگی سے اسلامک سینٹر میں تبلیغی درس کے لیے جاتی ہے، اس لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسے اسی گھر میں بھیجوں جہاں اس کی ضرورت ہو، قدر ہو...... اپنے مذہبی رجحان کی یہ دولت وہ بھی کسی دین دار شوہر کی آرزومند ہے۔ یہ تو خدا کا ہی بنایا ہوا قانون ہے کہ دین دار کو دین دار، حیادار کو حیادار اور پاک باز کو پاک باز ساتھی ہی نصیب ہوتا ہے۔"

اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ناظمہ، منصور اور عمرانہ کے دھواں دھواں ہوتے چہرے دیکھے۔ فاطمہ کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ اس نے سکوت کو توڑنے میں پہل کی۔

''بہت بہت مبارک ہو آپ کو بھائی جان!'' اس کے لہجے میں حقیقی مسرت کی جھنکار تھی۔ ''واقعی آپ کا ایمان درست ہے کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے۔ جو بھی ہوا' جس طرح بھی ہوا' آپ کے اور آپ کی اولاد کے حق میں تو بہتر ہی ہوا۔''

سرمد نے فاطمہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کمرے سے نکل گیا۔ سامنے ہی زینب چہرے پر ہزاروں سوال لیے کھڑی تھی۔ اس نے بیٹی کے شانے پر بازو دراز کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

''ساری پیکنگ مکمل کرلو' ہم صبح کی فلائٹ سے ہی اسلام آباد جارہے ہیں۔''

''تو کیا یہ سب...... آپ نے...... یہ آپ نے بالکل سچ کہا؟'' وہ اس کے اس بیان کو انتقامی کارروائی سمجھ رہی تھی۔

''تمہارے پاپا نے کبھی جھوٹ نہیں بولا زینب! مجھ میں بہت سی کمزوریاں ہوں گی بیٹا! لیکن میں نے نہ تو کبھی کسی کو دکھ دینے کی کوشش کی' نہ ہی دھوکا دینے کا ارادہ کیا۔ ہمیشہ نیک نیتی سے خود سے وابستہ ہر شخص کو مطمئن رکھنے کی کوشش کی۔ شاید خدا کو میری یہی ادا پسند آگئی ہو' تب ہی تو اس نے مجھ پر ہمیشہ اپنا کرم رکھا۔ بے وطنی کا دکھ دیا تو رزق بھی بے حساب اتارا۔ بہن بھائیوں کی وفا تقدیر میں نہ تھی مگر اس نے مجھے اس قابل تو بنایا کہ مرتے وقت میرے ماں باپ کے لبوں پر میرے لیے دعا ہوگی۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے اسی لیے کہ میرے پاس ان کھوکھلے سہاروں کے بجائے دوستی' محبت اور اعتماد کے وہ مضبوط ستون ہیں جو خدا نے میرے ہر دکھ اور محرومی کے مداوے کے طور پر مجھے دیے ہیں۔ تم' اسامہ اور کلثوم...... تم تینوں کا وجود ازالہ نہیں بلکہ انعام ہے میرے لیے۔''

اس نے زینب کا ماتھا چوم لیا۔

★★★

آنکھوں سے میری دیکھو

دروازہ بند ہونے کی آواز سے اس نے محسوس کیا کہ کوئی کمرے میں موجود نہیں، خود کو تنہا پاتے ہی اس پہ چھائی گھبراہٹ عروج پہ جا پہنچی تھی۔ حلق خشک ہونے کو تھا۔

زرمین باجی جاتے جاتے اسے کمرے میں موجود ضرورت کی ہر چیز کے بارے میں بتا گئی تھیں، لیکن پھر بھی اس کی ہمت نہ ہوئی، ہاتھ بڑھا کے سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھانے کی۔ کچھ منٹ کے بعد بھاری آنچل کی جھری سے نگاہیں ادھر ادھر دوڑا کر اس نے کسی کے نہ ہونے کا اطمینان کیا اور پھر اس کے سجے سنورے وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ مہندی کے گل بوٹوں سے سجا نازک پیر ٹھنڈے ماربل پہ پڑا اور ایک سرد سی لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ ساتھ ہی بھاری پازیبیں چھنک چھنک گئیں۔ اب تک اسے جس راستے سے گزار کر یہاں اس کمرے تک لایا گیا تھا وہاں اس نے دبیز قالینوں کی نرمی ہائی ہیل کی سینڈل کے باوجود محسوس کی تھی، جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ خوش رنگ قالینوں پہ بکھری پھولوں کی پتیاں بھی دیکھی تھیں اور اب وہ قدرے حیرت کے ساتھ ننگے پیر کے نیچے سرمئی جھاگ کا سا چمکدار سنگی فرش دیکھ رہی تھی۔

بیڈ پہ بھی وہ آرائش مفقود تھی جو عموماً دلہنوں کے استقبال کی غرض سے کی جاتی ہے۔ ویلوٹ کا ڈارک گرے کور بچھا تھا جس کے وسط میں اور سرہانوں کے اوپر ایک انتہائی جان دار سا گلاب کا پھول پرنٹ تھا۔ جان دار اس لیے کہ دور سے ہی اس کی پتیوں پہ پڑے شبنم کے قطروں کی نمی محسوس ہوتی تھی۔

اس نے ذرا سا ہاتھ بڑھا کر اس کے مخملیں نقش پہ انگلیاں پھیریں۔ سائیڈ ٹیبل پہ رکھے خوش نما گلدان میں تازہ گلاب خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ فضا میں ان کی خوشبو اس طرح رچی ہوئی تھی کہ اسے اپنے بدن سے اٹھتی ابٹن، مہندی اور عطر کی مہک مدھم پڑتی محسوس ہوئی۔ صندل اور چنبیلی کے عطر میں گوندھ گوندھ کر یہ ابٹن اسے اس کی بچپن کی سہیلی نازو نے تین دن تک لگایا تھا اور ہاں...... اس کے آنسو بھی تو اس میں گندھے ہوئے تھے۔ اسے اشکوں کے موتی تحفے میں دینے کے سوا اور وہ کیا کر سکتی تھی۔ حالانکہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا کہ نازو کے آنسو اسے کتنی طمانیت دے رہے تھے۔ اسے یہ سوچ سوچ کر تسکین ہو رہی تھی کہ کوئی تو ہے، کوئی تو ہے اس بھری دنیا میں اس کی رخصتی پہ رونے والا۔

نازو کی یاد نے خوش نما کو پھر سے اداس کر دیا۔ آنکھیں ڈبڈبا سی گئیں۔ اس نے مشکل سے خود کو رونے سے باز رکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو زرمین باجی نے کسی لڑکی سے کہہ کر اس کا میک اپ درست کروایا تھا۔ ایک تو رخصتی کے بعد وہ پورے چار گھنٹوں کا سفر کر کے یہاں پہنچی تھی اور ویسے بھی میک اپ کون سا بہت عمدہ ہوا تھا۔ نازو اپنی بھابھی کے ساتھ اسے محلے کے جس بیوٹی پارلر لے گئی تھی، وہ بس یونہی سا تھا جیسا کہ چھوٹے شہروں کے پرانے محلوں میں ہونا چاہیے، سونے پہ سہاگہ یہ کہ وہ علاقہ لوڈ شیڈنگ کی زد میں تھا۔

آدھی سے زیادہ تیاری کے بعد اچانک ہی لائٹ چلی گئی چونکہ لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ طویل تھا۔ اس لیے فنشنگ ٹچز لالٹین کی روشنی میں دیے گئے تب اسے پہلی بار اپنی لاپروائی اور لاتعلقی پہ غصہ آیا۔ جب سے اس کی شادی طے پائی تھی۔ دل مرا مرا سا تھا۔ اماں کی موت نے ہر چیز سے بیزار تو پہلے ہی کر رکھا تھا، اوپر سے یہ آناً فاناً شادی، مزید بوکھلا گئی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھا ہی کیا جو وہ کوئی فیصلہ کرتی۔ سب معاملات تقدیر پہ چھوڑ کر وہ یوں الگ تھلگ ہو گئی جیسے یہ شادی اس کی نہیں کسی اور کی ہو رہی ہو۔ محلے اور خاندان کی عورتیں اس کی شاندار بری اور بارات کے

ساتھ آنے والی کے بارے میں کیا کیا تبصرے کر رہی تھیں اسے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ نازو نے اس کے عروسی لباس اور بیش قیمت زیورات کی تعریف میں کیسے کیسے قصیدے پڑھے۔ اس نے پروانہ کی۔ بت بنی آنے والے وقت کا انتظار کرتی رہی۔

اور تب...... تب پہلی بار اسے اپنی یہ کوتاہی کھلی۔ ''جب شادی کرنی ہی تھی تو ذرا ڈھنگ سے دلہن بھی بن جاتی...... اب اچھا تماشا لگے گا میرا۔'' وہ مایوس تو پہلے ہی تھی، مستقبل سے، اب ناامید بھی ہو گئی۔

''ایک تو پہلے ہی تھوبڑا کچھ خاص نہیں۔ اوپر سے اس آٹھویں فیل بیوٹیشن نے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے نجانے کیا لیپا پوتی کی ہے۔ مجھے اپنی تو نہیں، زرمین باجی کی فکر ہے، لوگ انہیں ہی باتیں سنائیں گے۔ آخر اپنے دیور کے لیے میرا انتخاب ان ہی نے کیا ہے۔ چلو اچھا ہے، اب بھگتیں اقربا پروری کا خمیازہ، بڑا شوق تھا اپنی سسرال میں مجھے کھپانے کا۔''

اس نے بے ڈھنگے پن سے آنچل کا پلو گز بھر آگے لٹکا لیا۔ کوئی ہاتھ سے پیچھے کرنے کی کوشش بھی کرتا تو میخوں کی طرح ٹھونکی پنیں کامیاب نہ ہونے دیتیں۔ باجی کو نازو سے ''واردات'' کی تفصیل ملی تو انہوں نے معاملہ سلجھا لیا۔ گھر آتے ہی پہلے اس کا حشر درست کروایا اور پھر مووی بنوائی۔ اور اب جاتے جاتے وہ اس کی خاصی تعریفیں کر کے گئی تھیں۔

خوشنما کی ساس تو تھیں نہیں، نہ ہی کوئی نند۔ رشتے کی ممانیوں، چچیوں نے خوب تبصرے کیے۔ ملا جلا سا ردِ عمل تھا۔ تعریف بھی، پینڈو ہونے کا ہلکا سا طنز بھی۔ اور یہ جملہ تو تقریباً ہر سسرالی آنٹی نے ادا کیا۔

''ہاں بھئی، ساس سر پہ نہیں، سسر لاتعلق، دیور کی منہ چڑھی بھابھی ہے، اس لیے لے آئی اپنی مرضی سے اپنے ہی خاندان کی لڑکی ورنہ اپنے نصیب کو کوئی کمی تھی لڑکیوں کی۔ خاندان میں اور خاندان سے باہر ہزاروں رشتے تھے۔ خود لڑکے کے ہی مزاج نہ ملتے تھے۔ اتنی اونچی پسند تھی۔ اب نجانے کیسے بھابھی نے قابو کیا ہوگا۔''

خوش نما کا کمزور سا دل دھڑک دھڑک جاتا یہ بے لاگ تبصرے سن کر۔ اور پھر ایک بارعب سی آواز نے ان تمام سرگوشیوں کا گلا گھونٹ دیا۔

''کیوں بچی کو گھبرائے دے رہی ہو، یوں اردگرد جمگھٹا بنا کر۔''

اس کے سر پہ چڑھی تمام خواتین اپنی اپنی جگہ پہ بیٹھ گئیں۔ باجی نے تعارف کرایا۔

"خوشی! یہ نانو ہیں، امی کے بعد ان ہی نے اس گھر کو اور ہم سب کو سنبھالا ہے۔ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے یہ اتنا لمبا سفر نہیں کر سکیں۔"

اس نے مدھم آواز میں سلام کیا، ایک مشفقانہ ہاتھ اس کے سر پہ ٹھہر گیا اور ڈھیروں ڈھیر دعائیں لبوں سے برسنے لگیں۔ دعا میں بھی اپنی ہی ایک طاقت ہوتی ہے۔ اسے یکا یک تقویت کا احساس ہوا اور سن ہوتے بدن میں زندگی کی نئی لہر دوڑی اس نے مشکور نگاہوں سے نانو کو دیکھنا چاہا۔ آنچل کی سنہری اوٹ سے ایک نورانی سا ہیولہ نظر آیا تھا۔

"کون جانے یہ دعائیں کتنی بااثر ہیں۔"

کمرے کی تنہائی اسے پھر سے کمزور کرنے لگی۔ اجنبیت کا احساس ہر احساس پہ حاوی ہو گیا۔

"میرے پلو میں ماں کی دعا تو ہے ہی نہیں۔" اس بات کا ملال اسے کئی محرومیاں دے گیا۔

ماموں، ممانی، خالو کتنے لوگ جمع تھے وداعی پہ لیکن کسی کے ہاتھ نے سر پہ ٹھنڈا سایہ نہ کیا۔ کسی کے لبوں نے سدا سکھی رہنے کی نوید نہ سنائی۔ سب کو اس کی رخصتی کی جلدی تھی، جیسے ناکارہ اور سڑی ہوئی بدبودار چیز کو لوگ جلد از جلد باہر پھینکنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ اسے تو آنے والے وقت سے بھی کوئی خوش کن امید نہ تھی۔ اور اس کا خدشہ شاید سچ ثابت ہو رہا تھا کمرے کی سادگی مکین کی سرد مہری کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس نے اپنا دھیان بٹانے کی غرض سے ایک بار گردوپیش کا تفصیلی جائزہ لینے کا ارادہ کیا۔

کمرہ وسیع بھی تھا اور خوبصورت بھی لیکن کسی بھی طرح ایک نئی دلہن کے لیے بطور خاص تیار کیا گیا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ سیاہ رنگ کی جھلک ہر چیز میں نمایاں تھی، جس نے اسے اور متوحش کر دیا۔

ہلکے سرمئی ماربل کے فرش کے کناروں پہ سیاہ پٹی کی ٹائلیں نصب تھیں۔ کمرے کے وسط میں مختصر سا سیاہ قالین گہرے سرمئی ڈیزائن سے سجا عجیب پرشکوہ لگ رہا تھا۔ سفید دیواروں پہ ہلکے سرمئی پردے لٹک رہے تھے جن پہ سلور پتیوں کی بیلیں اوپر کو بل کھاتی جا رہی تھیں۔ آئرن راڈ کا جدید اسٹائل کا بلیک فرنیچر تھا۔ نازک سی عجیب و غریب ڈیزائن والی چیئرز اور ڈریسنگ ٹیبل، آئرن راڈ کا ہی یہ بڑا سا بیڈ تھا، فرنیچر کے گہرے سیاہ رنگ میں سلور کلر کا امتزاج تھا۔

چمکتے ہوئے سلور نازک پتے جا بجا نقش تھے۔ دیواروں پہ آرائشی اشیاء مفقود تھیں۔ عقب میں ایک خوبصورت پینٹنگ ٹنگی تھی تو دائیں طرف کی دیوار پہ چیئرز کے عین اوپر نصیب کی تصویر سجی تھی۔ اس نے غور سے تصویر کو دیکھا ایسی ہی ایک تصویر اسے شادی سے پہلے نازو نے بھی دکھائی تھی۔ جسے بے دلی سے ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے پرے کر دیا تھا، لیکن اب اس وقت اس چہرے کی تو جیسے شان ہی اور تھی شاید کمرے کے ماحول کا اثر ہو یا پھر انلارج ہونے کے بعد تصویر کی خوبصورتی سو گناہ بڑھ گئی تھی۔

خوش نما نے حیرت کے ساتھ ایک ایک نقش کا جائزہ لیا۔ کسی مرد کی اتنی خوبصورت آنکھیں، اس نے تو شاید تصور بھی نہیں کیا تھا، شفاف چمکتا سنہری سی دمک لیے گورا رنگ، خوش وضع پیشانی، گھنے سیاہ بال، لمبی مڑی ہوئی پلکوں والی چغتائی آنکھیں، خوبصورت کٹ والے بھرے بھرے لب، وہ متحیر رہ گئی۔

شادی سے پہلے صرف ایک جھلک تصویر کی دیکھنے کے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بندہ اچھا خاصا خوش شکل ہے۔ کل مہندی کی تقریب میں نازو کے بے حد اصرار پر کھڑکی سے باہر جھانک کر اسے دیکھا تو سچ مچ پزل سی ہو گئی۔

"یہ اتنا شاندار سا شخص اور نرمین باجی نے بھلا اس کے ساتھ کیا کیا، کتنا ظلم ہے یہ......" لیکن تب بھی اتنی دور سے اسے دیکھنے پر یہ اندازہ وہ نہ کر سکی کہ اس کا چہرہ اس حد تک وجیہہ ہے۔

کئی منٹ وہ ٹکٹکی باندھے دیوار پہ نصب تصویر کو تکتی رہی، باہر سے آتی آوازوں کے قریب آنے پہ وہ چونک گئی۔ اپنی بے ساختہ حرکت پہ قدرے محجوب سی ہو کر اس نے سر جھکا لیا۔

"چل بھئی نصیب! یہاں تک تو ہم نے پہنچا دیا۔ آگے تیرا نصیب......" کسی مرد کی شوخ آواز سے اس کی گھٹنوں پہ دھری انگلیاں کپکپا گئیں۔

"نصیب پہ بھروسا رکھنے سے کیا حاصل، بندے کو کچھ خود ہی حفاظتی اقدامات کرنے چاہئیں یہ دیکھو اس جیب میں ہائی بلڈ پریشر کی دوا ہے اور اس میں لو بلڈ پریشر کی گولیاں، ملٹی وٹامن کا سیرپ بھی رکھ لیا ہے تا کہ اگر دل کو کچھ ہو جائے تو دو گھونٹ پی کر حوصلہ کر لوں۔ آخر لوڈ شیڈنگ میں تیار کی گئی دلہن کا دیدار کرنا ہے، دل گردہ مضبوط ہونا چاہیے۔"

"ہائیں......" اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ "یہ خبر کس نے نشر کی وہ شرمندگی سے

مزید سر جھکا کے رہ گئی۔

"اچھا اب زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں۔" زمین باجی نے اسے ڈپٹا۔

"اور اب تم سب لوگ جان چھوڑ دو اس کی ورنہ یہ یونہی کھڑا باتیں بگھارتا رہے گا۔"

"اوہو، کہاں گئی ....." وہ شاید جیبیں ٹٹول رہا تھا۔

"ہوش میں لانے کی دوا تو رکھنا ہی بھول گیا بھابی۔"

"کوئی بات نہیں، میں جوتی سنگھا دوں گی۔" باجی نے تسلی دی اور اسے تقریباً دھکا دے کر اندر گھسایا۔

"ہائے ہائے بڑے بے آبرو ہو کر اپنے ہی کوچے میں ہم آئے۔" اس نے دہائی دی اور بھابی اس کی تک بندی پہ ہنستی واپس چلی گئیں۔

"یار! کم از کم آئندہ اتنی دور کے شہر شادی نہیں کرنی۔" انگڑائی لیتے ہوئے اس نے عجیب وغریب سا اعلان کیا جو خوش نما کے سر سے گزر گیا۔

"چار گھنٹے بارات لے جانے میں اور چار گھنٹے واپس لانے میں، تم نہیں تھکیں۔؟" کوٹ اتار کے چیئر پہ پھینکنے کے بعد اس کے قریب بیٹھتے ہوئے وہ اس قدر دوستانہ انداز میں پوچھنے لگا، گویا دونوں کے درمیان عرصہ کی بے تکلفی ہو۔

"شادی اچھا خاصا بور کام ہے، ہے ناں؟" تصدیق کی خاطر وہ قدرے جھک کر آنچل کی لمبائی جانچنے لگا۔ "اور خاص طور پہ اپنی شادی، بیگانی شادی پہ تو پھر بھی کوئی نہ کوئی تماشا دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو انسان خود تماشا بن جاتا ہے۔"

ابھی وہ اس عجیب سی تعارفی گفتگو پہ الجھ ہی رہی تھی کہ وہ پھر گویا ہوا۔

"سنا ہے، اب تم خاص بہتر لگ رہی ہو۔ میرا مطلب ہے رباب کے کیے گئے میک اپ کے بعد، لیکن میں سنی سنائی پہ یقین نہیں کرتا۔"

اس کے طویل جملے کے ابتدائیہ میں الجھی وہ خود کو تسلی دے ہی رہی تھی کہ یقیناً نصیب کا مطلب وہ نہیں، جو اسے لگا کہ اچانک اس کے گھونگھٹ الٹا دینے پہ وہ ہڑبڑا کے رہ گئی، چند سیکنڈ خاموشی سے گزرے۔ اس کے کمرے میں آنے کے بعد یہ واحد لمحات تھے جب اس کی زبان کو بریک لگی۔ خوشنما اس خاموشی کی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔

"یہ تمہاری رونمائی کا تحفہ۔"

"اس کی جھکی نگاہوں کے سامنے دو بھاری کنگن لہرا کر چھنکائے۔ وہ گود میں دھرے

ہاتھ مزید سمیٹنا چاہتی تھی کہ اس نے اس کا ٹھنڈا برف پڑتا ہاتھ تھاما اور کنگن پہنا دیئے، کتنی دیر وہ اس کے ہاتھ دیکھتا رہا خوش نما نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

نازو کی کئی ٹوٹکوں سے رچائی مہندی اس کے نازک کومل انگلیوں والے گندمی ہاتھ پہ خوب اٹھی تھی۔ مہندی کی گہری سرخی والے بیل بوٹوں سے سجا اس کا ہاتھ خاصا نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ بری کی طلائی چوڑیاں سیدھے ہاتھ میں تھیں جب کہ اس کلائی میں کانچ کی سنہری مینا کاری والی میرون چوڑیاں تھیں۔ ان کے آگے نصیب کے پہنائے، کنگنوں نے جیسے پوری کلائی سجا ڈالی تھی۔ کچھ دیر توصیفی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد نصیب نے کہا۔

"اچھا ڈیزائن ہے ناں کنگنوں کا۔ یوں تو میں نے کبھی یہ خالص زنانہ شاپنگ نہیں کی پھر بھی دیکھ لو، کتنی اچھی چوائس ہے میری۔"

وہ اس کی کلائی کو کسی بے جان چیز کی طرح ادھر ادھر گھماتا ہر زاویہ سے اپنے خریدے گئے کنگنوں کا جائزہ لیتا رہا اور خوشنما کے دل کی آخری امید نے بھی چپکے سے ہار مان لی۔ ان ہاتھوں کے سوا اسے کبھی خود میں کوئی قابل ذکر چیز نظر نہ آئی تھی۔

"بھئی، یہ رونمائی کا تحفہ ہوتا ہے تو پھر جیسے میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا ہے، تم بھی تو مجھے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ میری منہ دکھائی کی رسم بھی پوری ہونی چاہئے، جب تمہیں اتنے مہنگے کنگن مل سکتے ہیں تو پھر ہمیں تو سونے میں تول دینا چاہئے کیوں؟" وہ اترا اترا کر کہہ رہا تھا جب کہ وہ جاننے سے قاصر تھی، یہ مذاق تھا یا خود پسندی کا سنجیدہ مظاہرہ۔

"ارے کہیں تم گونگی تو نہیں ...... مارے گئے یعنی ٹیکنیکل فالٹ بھی ہے۔"

"اس کے "بھئی" نے تو خوش نما کو جیسے آگ ہی لگا دی، چڑ کر بولی۔

"جی؟ کیا مطلب؟"

"چلو شکر ہے، اتنا اطمینان تو ہوا کہ آواز سلامت ہے، یعنی بالکل اندھیر نہیں پڑا۔" وہ سکون کی سانس لیتے ہوئے کہنے لگا۔

"اور آواز نہ صرف ہے، بلکہ خاصی مدھر اور دلنشین سی بھی ہے۔" اس نے بلاشبہ پچھلے آدھ گھنٹے میں یہ پہلا جملہ اپنی نئی نویلی دلہن کی تعریف میں کہا تھا۔ وہ شرماتے ہوئے دل ہی دل میں مسرور ہو ہی رہی تھی کہ نصیب کا اگلا جملہ اسے سیدھا زمین پر پٹخ گیا۔

"اور کیوں نہ ہو، ایسی شکل وصورت والی خواتین کی آوازیں ہمیشہ ہی خوبصورت ہوتی ہیں، شاید خدا اس طرح ہی ازالہ کر دیتا ہے جیسے لتا، رونا لیلیٰ شازیہ منظور وغیرہ

،ویسے کبھی کبھی شکل اور آواز دونوں ہی سونے پہ سہاگہ ہو جاتی ہیں جیسے نصیب لعل۔"

مرے مرے دل کے ساتھ وہ اس کے اترائے لہجے کی لن ترانیاں سنتی رہی۔ لباس تبدیل کرنے سے قبل اس نے ڈریسنگ روم میں نصب قد آدم آئینے میں خود کو جانچنا چاہا۔

"کیا میرے وجود میں کچھ بھی ایسا نہیں کہ وہ اپنی ذات سے ہٹ کر ایک نظر مجھ پہ بھی ڈال لیتا۔"

اس سوال نے اسے آئینے کے سامنے لا کھڑا کیا ورنہ پہلے نازو کے اور اب رباب کے تیار کرنے کے بعد باجی کے کہنے کے باوجود اس نے خود کو دیکھنا گوارا نہ کیا تھا۔

بھاری میرون شرارے میں ملبوس' فل میک اپ کے ساتھ وہ خود کو پہچان نہ پائی۔ چہرے کے اطراف پھیلے بھاری دوپٹے سے زرتار شعاعیں پھوٹ کر سانولے چہرے کو ایک جگمگاہٹ سی دے رہی تھیں۔ صبیح پیشانی پہ میرون نگوں والا گولڈن ٹیکا، چھوٹی سی ناک میں اٹکی چاند کے ہالے جیسی نازک سی نتھ' لانبی گردن میں جڑاؤ گلوبند' دونوں ہاتھوں میں بھر بھر پہنی طلائی اور کانچ کی چوڑیاں اس کے دلہناپے کو مکمل کر رہی تھیں۔ اس نے ذرا قریب سے خود کو دیکھنا چاہا۔

"نہ تو رونا لیلیٰ کی سی سیاہ پکی رنگت ہے نہ شازیہ منظور والی گول شیشوں کی عینک نہ ہی لتا منگیشکر کی طرح چہرے پہ چیچک کے نشان' پھر کیا سوچ کر اس نے مجھے "ایسی صورتوں" میں شمار کیا۔ اگر اتنی لیپا پوتی اور مصنوعی چمک دمک کے سہاروں کے ساتھ بھی میں اسے ایک آنکھ نہیں بھائی تو پھر مجھے سمجھ جانا چاہیے کہ کل صبح منہ دھونے کے بعد میرے چہرے کے میک اپ کے ساتھ ساتھ نصیب کی وقتی مروت بھی بہہ جائے گی۔"

⁂

"محترمہ خشک نما..... خشک نما....."

اسے سوتا ہوا چھوڑ کر وہ ابھی واش روم گئی تھی۔ رات کو کلینزنگ ملک سے میک اپ صاف کر دینے سے اسے کوئی خاص تسلی نہ ہوئی تھی۔ اس وقت وہ صابن کے جھاگ اڑاتے ہوئے رگڑ رگڑ کر چہرہ دھو رہی تھی کہ دروازہ دھڑ دھڑ پیٹنے کے ساتھ وہ خود بھی بلند آواز میں اسے پکارنے لگا۔ گھبرا کر دو تین چھپاکے مارتے ہوئے اس نے چہرہ صاف کیا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ سامنے کھڑا جمائی لے رہا تھا۔

"اتنی دیر سے میں..... ہیں.....؟ یہ تم شیو کر رہی تھیں؟" اس کے بے تکے سوال

پہ خوش نما گڑبڑا گئی' پلٹ کر بیسن کے اوپر لگے آئینے میں چہرہ دیکھا' جلدی میں صحیح طرح پانی سے صاف نہ کرنے کی وجہ سے اچھی خاصی جھاگ ٹھوڑی اور کانوں کے پاس لگی ہوئی تھی۔ خجل سی ہو کر وہ دوپٹے کے ساتھ چہرہ رگڑنے لگی۔

"وہ میں میک اپ صاف کر رہی تھی۔"

"دھو رہی تھیں یا کھرچ رہی تھیں۔ خیر جو بھی کرنا ہے ذرا جلدی کرو بھابھی نے اعلان کر دیا ہے آج سے مجھ اکیلے کو ناشتہ ہرگز نہیں ملے گا۔ اب تم ڈائننگ ٹیبل کو رونق بخشو گی تو مجھ غریب کو کچھ کھانے کو ملے گا۔"

وہ بال سکھانے کے بعد دوپٹہ پھیلا کر کمرے سے نکلنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ نرمین باجی آ گئیں۔ ساتھ ہی ایک ہنستی مسکراتی خوش باش سے چہرے والی لڑکی بھی تھی۔

"رباب! تم اسے جلدی سے تیار کر دو' میں ذرا کچن میں دیکھوں' ناشتہ کہاں تک پہنچا اور ہاں وہ لائٹ پنک سوٹ نکالنا' ساتھ میں کوئی لائٹ سا سیٹ۔" عجلت میں اسے ہدایت دیتی وہ نیچے اتر گئیں۔ اس نے پسندیدہ نظروں سے رباب کو دیکھا۔

"تو یہ ہے نصیب کی وہ خالہ زاد جس نے کل مجھے تیار کیا' افسوس بے چاری کی محنت ضائع گئی۔"

کل باجی نے تعارف تو کروایا تھا مگر دلہن بنی خوش نما اسے دیکھ نہ پائی تھی' اب سادہ سے انداز میں مسکراتی وہ لڑکی اسے پہلی ہی نظر میں اچھی لگی۔ رباب کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے پسندیدگی تھی۔

"واؤ بھابی! آپ کی اسکن کتنی فریش اور لائیو ہے۔ کتنی شائن ہے آپ کے بالوں میں' سچ کہوں رات سے زیادہ آپ اس وقت اچھی لگ رہی ہیں۔" اس کی پونی کھول کر اس نے شانوں تک آتے ہلکے گھنگھریالے بال پھیلا دیے۔

"ایسے زیادہ جچ رہے ہیں اور میک اپ سے تو آپ کی اسکن کی ساری خوبصورتی ہی چھپ جاتی ہے بس یہ مسکارا اور یہ لائٹ پنک لپ اسٹک ہی ٹھیک ہے۔" اس نے جارجٹ کے سبز کڑھائی والے سوٹ سے ہم رنگ لپ اسٹک نکالی تو خوش نما گھبرا گئی۔

"نہ نہ..... نہیں..... یہ کلر نہیں..... اتنے لائٹ شیڈ کی لپ اسٹک سے میرا رنگ دبا دبا لگے گا۔"

"ایویں ہی..... میں باقاعدہ بیوٹیشن ہوں جناب' چہرے اور رنگت کے حساب سے ہی میک اپ کرتی ہوں' تیز رنگوں کی ضرورت پھیکے کومپلیکشن والی لڑکیوں کو ہوتی ہے

کیونکہ زیادہ سفید رنگت ہلکے میک اپ کے ساتھ اڑی اڑی سی لگنے لگتی ہے۔"

اس کے انکار کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ اپنا کام کرتی رہی۔ آنکھوں کو بلیک لائنر اور مسکارے سے نمایاں کر کے' لبوں پہ ایک تہہ گلوری شائن والی لپ اسٹک کی لگائی' تھوڑے سے فیس پاؤڈر کے پف کے ساتھ میک اپ مکمل ہوا۔

"یہ لیجیے' نہ چہرے کی رنگت یکساں دکھانے کے لیے فاؤنڈیشن لگانا پڑا نہ ہی چھائیاں' حلقے چھپانے کے لیے کنسیلر استعمال کرنا پڑا نہ ہی مصنوعی چمک کے لیے ہائی لائٹر ضائع کرنا پڑا۔" خوش نما ہولے سے مسکرادی۔

اسے رباب کا یہ تعریفی تبصرہ سراسر پروفیشنل عادت محسوس ہوا۔ (شاید سب ہی بیوٹیشنز اپنی کلائنٹس کی تعریفوں میں یونہی زمین آسمان کے قلابے ملاتی ہیں۔ ورنہ ایسی ہی بات ہوتی تو رات کو بھی تو اس نے تیار کیا تھا۔ مجھے نصیب کو کیوں نہ نظر آئی یہ چمک..... یہ تازگی) وہ بے دلی سے اس کی بقایا کارروائی دیکھتی رہی۔ میرون چوڑیاں اتار کے اس نے میچنگ کی چوڑیاں پہنانی چاہیں تو اس نے منع کر دیا۔

"بس یہ کنگن ٹھیک ہیں۔"

"ارے یہ تو میں نے دیکھے ہی نہیں' اچھا اچھا۔ نصیب بھائی کا تحفہ ہوگا۔ ہاں بھئی' اب آپ کو کچھ اور کہاں جچے گا ان کلائیوں میں۔"

سفید نگوں والی جھمکیاں' گلے میں نانو کی دی گئی چین پہن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈائننگ روم میں اس نے سب کو فرداً فرداً سلام کیا۔ حسیب بھائی' بچے' ابا جی اور نانو سمیت سب ہی موجود تھے۔ نصیب کی خالہ یعنی رباب کی امی آنٹی نور جہاں بھی تھیں۔

"ماشاء اللہ' دلہن پہ روپ تو بڑا چڑھا ہے۔"

وہ حیرت سے آنٹی کو دیکھنے لگی۔ یہ ماں بیٹی کو دوسروں کا دل رکھنے کی عادت ہے یا پھر ان دونوں کا معیارِ حسن ہی اتنا کمزور سا ہے۔"

"شکر ہے' خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے' تم آ گئیں۔" دوسرے دروازے سے اندر آتے نصیب نے والہانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سو چکر لگا چکا ہوں تمہارے انتظار میں یہاں سے وہاں تک لیکن تمہیں شاید آتش شوق بھڑکانے میں مزا آتا ہے۔" اس کے بے باک انداز پہ وہ جھینپ گئی۔

"اب تمہیں دیکھا ہے تو جان میں جان آئی ہے' مچلتے دل کو قرار ملا ہے۔" اس نے شپٹا کر ابا جی اور نانو کو دیکھا پھر اسے۔ (تنہائی میں تو اپنے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا' اب

اتنے لوگوں میں کس لیے کھلم کھلا بے تابی دکھا رہے ہیں۔)

"شکر ہے اب ناشتہ تو ملے گا۔ بھابی! آ گئیں آپ کی دیورانی' خدا کا واسطہ ہے اب تو کچھ کھانے کو دے دیں۔" اگلے ہی لمحے اس کی بے تابی کی وجہ سامنے آ گئی۔ اپنی خوش فہمیوں کو زور سے ڈپٹ کر کونے لگانے کے بعد وہ چپ چاپ سلائس کترنے لگی۔

ناشتے کے بعد سب اسے گھیر کر بیٹھ گئے۔

"خالہ! آپ مجھے تو جانتی ہی ہیں ناں؟" جگنو نے تصدیق چاہی۔

"یہ اب تمہاری خالہ نہیں' چچی ہیں۔" باجی نے اطلاع دی۔

"تو پھر خالہ کہاں گئیں؟" بلبل پوچھنے لگی۔

"اسے میں نے کھالیا۔" نصیب نے اطمینان سے کہا۔

"ہٹو پرے جی سارے......" ایک موٹی تازی سانولی سی نوعمر لڑکی جو یقیناً ملازمہ تھی آگے بڑھی۔

"پہلاں' میرا تارف (تعارف) کراؤ باجی ہوراں سے۔ میرا ٹیم ختم ہونے والا ہے۔"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو من دو من! جیسے دنیا میں تمہارا وقت تمام ہو چکا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ تمہاری باجی ہوراں نہیں بھابی ہوراں ہیں اگر تمہارے دلی جذبات کو کوئی ٹھیس نہ پہنچتی ہو تو....." نصیب نے تصحیح کی۔

"کیا جی! کس کو کیا نہ پہنچتی ہو؟ میں کیوں نہ بھابی کہوں گی....." سو سو باری کہوں گی الفاظ اس کے سر پر سے گزر گئے تھے لیکن بات بہر حال سمجھ میں آ گئی تھی۔

"سو سو دفعہ کہنے سے کیا تمہیں زیادہ تنخواہ مل جائے گی۔ کیا اوور ٹائم لگانے کا ارادہ ہے؟"

"میں تے ناں سئی' میں آپے بتاتی ہوں بھابی جی کو' میں ناں جی انجمن ہوں انجمن' اتی سی تھی جب سے یہاں کام کر رہی ہوں۔" اس نے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت سے انچ بھر کا اشارا کیا۔ سب کے ساتھ ساتھ اسے بھی ہنسی آ گئی البتہ نصیب نے ٹوک دیا۔

"خدا کا خوف کرو من دو من! اتی سی تو تم کبھی بھی نہیں رہیں۔ ہاں اتنی ضرور تھی جب ہمارے گھر آنا شروع ہوئیں۔" اس نے تین سالہ بلبل کی طرف اشارا کیا۔

"اور یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم تب سے یہاں کام کر رہی ہو۔ تب تمہاری اماں یہاں صفائی کرتی تھیں اور تم صفایا...... فریج سے' کچن سے......"

"بھابی! آپ کا ناں (نام) بوت سوہنا ہے۔ مجھے اپنا ناں پسند نہیں۔ دراصل میری بے بے کو سلطان راہی بہت پسند تھا' وہ کہتی تھی پتر ہوا تو ناں سلطان راہی رکھوں گی پر اس کو نری بیٹیاں ہی ہوئیں۔ چوتھی واری میں ہوئی تو اس نے چڑ کر میرا نام انجمن رکھ دیا کہ شاید میرے ناں کے پیچھے سلطان راہی بھی آ جائے پر ناں جی......" وہ تیل سے بھرا بڑا سا سر ہلانے لگی۔

"یہ جو نصیب پائی جان ہیں' ہر کسے کا ناں وگاڑتے ہیں۔ مجھے انجمن نہیں من وومن کہتے ہیں۔ بوبے کو کبا کہتے ہیں۔ رباب باجی کو کباب' منظر کو بندر' وڈی بھابی ہوراں کو غمگین بھابی کہتے ہیں پر آپ کا ناں کیسے وگاڑیں گے' اتنا پیارا ناں....."

تب ہی اسے نصیب کا صبح سویرے پکارنا یاد آ گیا۔

"خشک نما....."

صبح اپنی و میں اس نے توجہ نہ دی تھی' اب ساری بات سمجھ میں آ گئی اور اس سے اس رعایت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ سب کے سامنے اس فضول سے نام سے پکارنے سے پرہیز کرے گا۔

"چلو اب ہٹو بھی' جم کے ہی بیٹھ گئی ہو۔ جاؤ وہ ڈھیر برتنوں کا دھوؤ۔" خالہ نور جہاں نے اسے ہٹانا چاہا۔

"بیٹھے رہنے دیں ناں ملکہ ترنم....آپ کا کیا لیتی ہے بیچاری۔" نصیب نے اس کی سائیڈ لی پھر پلٹ کر دوسرے ملازم کو آواز دی۔

"ہاں بھئی محبوب! عرف بوبا عرف کبا! تم کیوں دور کھڑے شرما شرما کر شمیم آرا بننے کی کوشش کر رہے ہو' آگے آؤ' کہیں تمہارے دل میں کوئی حسرت نہ رہ جائے۔ تعارف کی۔" منحنی سا بوبا شرماتے لجاتے آگے بڑھا اور منمناتی آواز میں سلام کر کے پلٹ گیا۔

"بھابی جی! یہ کڑے پائی جان نے دیے ہیں۔ میں صدقے کتنے اچھے ہیں۔"

"بوبے! ذرا اس من وومن کو پچھلے خالی پلاٹ میں پھینک آؤ۔" نصیب کے آرڈر پہ وہ کنگنوں کی تعریف کرنا بھول گئی۔

"ہائے ہائے کیوں خیری صلا۔"

"خود ہی تو کہہ رہی ہو میں صدقے' اور صدقے کی چیزیں کوئی گھر میں تو رکھتا نہیں' باہر پھینکتے ہیں۔"

"آپ بھی ناں پائی جان ہر ویلے مخول (مذاق) ہی کرتے رہتے ہیں۔ ہاں بھابی جی میں کہہ رہی تھی یہ جو کڑے ہیں بالکل ویسے ہی ہیں جیسے صیمہ (صائمہ) نے فلم میں پہنے تھے اور گانا گایا تھا۔

گل سن وے سجن دیا کنگنا
چونڈی وڈ (چٹکی بھر کے) کر مینوں تنگ نا

بھابی جی! یہ بھی چونڈی تو نہیں وڈتے؟

"نہیں لیکن پائی جان زیادہ بک بک کرنے والوں کی "تون وڈتے" (گردن کاٹتے) ہیں۔" اس بار اس کے دھمکانے پہ وہ سچ مچ ڈر کے بھاگ گئی۔

"بیٹی! تم تو کچھ بولتیں ہی نہیں' کب سے ایسے چپ چاپ بیٹھی ہو۔" نانو نے پیار سے اسے مخاطب کیا۔

"بھابی کی آنکھیں جو بولتی ہیں' انہیں کیا ضرورت ہے الفاظ ضائع کرنے کی۔" یہ رباب کی رائے تھی۔

"قسم سے اتنی پیاری آنکھیں....."

"کہاں ہیں.....؟ کہاں ہیں؟" نصیب اخبار چھوڑ چھاڑ اس کے قریب آ بیٹھا' وہ گھبرا اٹھی۔

"کہاں ہیں؟ مجھے بھی دکھاؤ.....اچھا وہ.....وہ رہیں....." وہ کو لمبا کھینچتا ہوا وہ آنکھیں سکوڑ کر اس کے چہرے پہ کچھ ڈھونڈنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔ باجی نے ایک دھپ پیچھے سے اس کی کمر پہ لگائی۔

"نوٹنکی......ڈرامے باز......ایکٹر ہے پورا......"

"مجھے تو لگ رہا ہے دلہن کی شکل کسی ایکٹریس سے ملتی ہے.....نہیں نہیں .....ایکٹریس سے نہیں ماڈل سے۔" خالہ نور جہاں نے نیا شوشہ چھوڑا۔ "وہ کس اشتہار میں آتی ہے بھلا؟"

"ڈٹرجنٹ کے اشتہار میں۔" جواب نصیب نے دیا۔ "وہی ناں خالہ جو بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ اب اس کا شوہر چاہے نہاری کھا کر پلیٹ کرتے کے دامن سے پونچھے' چاہے گولہ گنڈا قمیص کے گلے پہ گرا ڈالے' چاہے سائیکل کی گریس نئے ریشمی تہبند سے صاف کرے....اب کوئی غم نہیں.....کیونکہ صفا چٹ ڈٹرجنٹ میرے میلے کچیلے شوہر کے غلیظ کپڑوں کے ساتھ ساتھ کالی بھجنگ دیگچیوں کی۔ کالک بھی صاف کر

ڈالتا ہے.....ڈنگ ڈانگ.....خوب یاد دلایا خالہ! آپ نے' بالکل ملتی ہے شکل.....''

وہ اتنے سارے لوگوں کے قہقہوں کے جواب میں لب کچلتی رہی۔ دل تو چاہ رہا تھا۔ ابھی اور اسی وقت محفل سے اٹھ کر چلی جائے لیکن.....کیسے.....کس برتے پہ وہ اتنا طنطنہ دکھاتی، نانو شاید اس کی کیفیت بھانپ گئیں۔ باجی کو اشارا کیا کہ وہ اسے کمرے میں لے جائیں۔ وہاں سے نکلتے ہوئے اس نے نانو کو نصیب سمیت سب کھی کھی کرنے والوں کو ڈانٹتے سنا۔

''ہم تو بس یونہی ہنس پڑے نانو! نصیب بھائی نے بات ہی ایسی کی۔'' رباب دبے دبے انداز میں بولی۔

''یہ تو ہے ہی بدتمیز۔''

''کمال ہے' ذرا سا مذاق ہی تو کیا ہے۔''

''ہنسی مذاق کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے' موقع محل ہوتا ہے۔ یہ تو دیکھو' اس کی پہلی صبح ہے اس گھر میں' گھلتے ملتے کچھ دن لگیں گے۔ رفتہ رفتہ تمہارے اونگے بونگے مذاق کی بھی عادت ہو جائے گی۔ ابھی کچھ دن تو بخش دو۔ لے کر درگت بنا کر رکھ دی بیچاری بچی کی۔''

''مجھے کیا ضرورت بنانے کی۔ محترمہ'' ریڈی میڈ'' ہیں۔''باجی کے دروازہ بند کر کے واپس پلٹنے تک وہ نصیب کا یہ جملہ بھی سن چکی تھی۔ جو اس کے آنسوؤں کے بند توڑنے میں خاصا مددگار ثابت ہوا تھا۔

***

یہ رونا' سسکنا' اس کے لیے نئی بات تو نہیں تھی۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ پہلے ہر چوٹ پہ وہ اماں کی گود میں منہ چھپا کے رویا کرتی تھی۔ جب اماں نہ رہیں' کوئی اس کے اشک پونچھنے والا بھی نہ رہا۔ پھر نجانے کیسے نرمین باجی آگے بڑھیں۔ اسے امید کا ایک جگنو تھمایا اگرچہ وہ خوش فہم تو کبھی بھی نہ رہی تھی لیکن بندہ بشر تو تھی، سو دل کے کسی کونے میں ڈرتے جھجکتے ذرا سی امید بھی روشن کر بیٹھی' اب نصیب کا رویہ اس آخری امید کا بھی قاتل ثابت ہوا، اس لیے آج اس کے رونے میں عجیب ہی دل شکستگی اور بے بسی تھی۔

ہوش سنبھالتے ہی اس نے خود کو اماں کے ساتھ ماموؤں کے در پہ پڑا دیکھا، اور ماموں بھی سوتیلے، سگے بھائی بھی شاید ہی کشادہ دلی سے کسی مطلقہ بہن کو عمر بھر کے لیے سر پر سوار کرتے ہوں اور یہاں تو سوتیلے پن کی رعایت بھی تھی، لیکن.....دنیا، دنیاداری بھی

تو کوئی چیز ہے۔ آخر تھی تو بہن۔

طلاق کے بعد بچی سمیت شوہر نے تو گھر سے نکال دیا۔ بھائی کیسے نکالتے، آخر اسی دنیا میں رہنا ہے، اسی خاندان میں بسنا ہے۔ سو سو باتیں سننے کے بجائے بہتر تھا کسی نہ کسی طرح دل پہ جبر کرتے ہوئے گھر کے کسی کونے میں ڈال لیا جائے۔ دنیا والوں کی زبان تو بند ہوگی۔ گھر کی چار دیواری کے اندر بھلے ہی ٹھوکروں کی زد پہ رکھیں، جھوٹے برتن چٹائیں، اس بات کی دنیا کو فکر نہیں۔ اب کوئی سوال نہ کرنے آئے گا۔ الٹا واہ واہ ہی ہوگی۔ یہ سوچ کر دونوں ماموں بہن کو لے ہی آئے۔ بیویوں کو بھی سمجھا لیا۔ (خاصی شرطوں کے ساتھ) اور ہر ہر شرط ممانیوں نے اپنے پورے مفاد میں رکھی۔

سر پہ چھت دینے اور دو وقت کی روٹی (کیسی بھی) کے علاوہ کسی چیز کی ذمہ داری نہ لی۔ اتنی مہربانی ضرور کی کہ شرط سے انحراف کرتے ہوئے اپنی اور بچوں کی اترن بھی عنایت کر دی جاتی، جس نے اماں کو خوش گمانیوں میں مبتلا کر دیا۔ وہ سمجھنے لگیں کہ شاید شرائط میں لچک کی گنجائش ہے۔ اسی برتے پہ خوش نما کے پانچ سال کا ہونے کے بعد بھائیوں سے اسے اسکول داخل کرا دینے کی فرمائش کر بیٹھیں۔ اس قدر بھونچال آیا کہ مانو سر پہ رکھی چھت تک اڑنے لگی۔ بوکھلا کر وہ فوراً کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے توبہ توبہ کرنے لگیں۔ لیکن دل کو کیسے مارتیں، بھائیوں کے بچوں کو روز صبح صاف ستھرے یونیفارم میں چمکتے شوز کے ساتھ بیگ اٹھائے اسکول جاتے دیکھتیں تو فرش پہ بیٹھی ناکارہ اور فضول سی چیزوں کے ساتھ کھیلتی بیٹی کے سامنے اپنا وجود مجرم لگنے لگتا۔

اس کے کھلونے ایسے ہی ہوتے تھے۔ بیٹری ختم ہوئے سیل، بسکٹ کے خالی ڈبے، بال پوائنٹ کے ڈھکن، بوتلوں کے ڈھکن......ایسا ہی عجیب سا حلیہ بھی ہوتا، شمائلہ کے پرانے فراک جو اس کے ٹخنوں تک آتے، کبھی رینا کی شلوار جو گھٹنوں سے ذرا ہی نیچے ہوتی، نوید کی گھسی ہوئی نیکریں۔''

انہی دنوں اماں کی چچازاد بہن کویت سے مستقلاً لاہور منتقل ہو گئیں۔ ان کے لیے تو جیسے ہارون اور سجاد بھائی ویسے ہی خوش بخت بہن، بچپن میں اور لڑکپن میں خاصی دوستی بھی رہی دونوں میں پھر شادی کے بعد وہ کویت اور یہ پہلے سسرال اور اب اس جہنم کدہ میں آ کر بس گئیں۔ تاجور ان کے حالات جان کر اور سب سے بڑھ کر خود ان کی کم ہمتی دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ سخت سست سناتے ہوئے انہیں شرم دلائی۔

''وہ تو فرعون بنے بیٹھے ہیں، سگے سوتیلے میں الجھ کر یہ فراموش کر بیٹھے ہیں کہ خون

تو تم میں بھی اسی باپ کا ہے جس کا نام ان کے ناموں کے آگے لگا ہے۔شوہر بھی تمہارا بے غیرت نکلا جو بیوی کے ساتھ ساتھ معصوم بچی کو بھی گھر سے باہر نکال دیا۔لیکن میں پوچھتی ہوں تمہاری اپنی ممتا کہاں گئی؟ کس قدر سکون سے تم اپنی اکلوتی اولاد کو رلتے دیکھ رہی ہو۔ذرا اس کا حال تو دیکھو......سنا تھا باپ مرجائے تو اولاد پل ہی جاتی ہے۔ماں مرے تو رل جاتی ہے۔مجھے لگتا ہے تم مرچکی ہو۔تمہارا ہر احساس، ہر ذمہ داری مرچکی ہے۔باپ، شوہر اور بھائی کے بعد دنیا ختم تو نہیں ہوجاتی۔تم چاہو تو خود اپنی بیٹی کی ڈھال بن سکتی ہو۔"

"میں کیا کروں، اکیلی عورت بڑی کمزور ہوتی ہے، اس نے بھی کل کو جوان ہونا ہے کہاں خوار کرتی پھروں اسے۔"

"میں نے کب کہا کہ تم یہاں سے نکلو، یہ تمہارے باپ کا گھر ہے، تمہارا پورا حق ہے کس کی ہمت جو تمہیں یہاں سے نکالے۔میرا مطلب یہ ہے کہ تم خود کچھ ہاتھ پیر ہلا کے اپنی بچی پالو، بغیر اچھی خوراک، لباس اور سب سے بڑھ کر تعلیم کے بغیر اسے پال کر تم اس پہ کیا احسان کروگی۔"

بات تو خوش بخت کے دماغ میں آگئی، لیکن راستہ نہ سجھائی دیا۔تعلیم ایسی خاص نہ تھی، ملازمت کرنہ سکتی تھیں، برتن مانجھنے پہ بھی راضی تھیں۔لیکن بھائیوں کی غیرت اور خاندان کی عزت آڑے آتی تھی۔یہاں بھی تاجور نے مدد کی۔وہ اپنا بوتیک شروع کر رہی تھیں۔جانتی تھیں کہ خوش بخت سلائی جانتی ہیں، اس لیے اپنے کئی آرڈر دے ڈالے۔اتنے سالوں تک بھابیوں اور ان کے بچوں کے لیے ڈھیروں ڈھیر کپڑے سی سی کر اب ہاتھ میں اور صفائی آچکی تھی۔

کئی بار سوچا کہ اگر بھابیاں تھوڑی بہت اجرت دے دیا کریں تو......لیکن کہنے کی ہمت نہ کی، اشارے کنائے سے محلے کے گھروں کے کپڑے سینے کی اجازت ضرور طلب کی جسے خاصے غیض وغضب کے مظاہرے کے بعد رد کردیا گیا۔تاجور کی مدد خاصی امید افزا تھی۔

خوش نما کی تربیت میں بھی بروقت تبدیلی آگئی، اسکول جانے اور ماں کے خود مختار ہونے کے احساس نے اسے اعتماد بخشنا شروع کردیا۔اب کٹ پیس سے بھی سہی مگر اماں اس کے لیے نئے کپڑے سیتی تھیں۔سستے ہی سہی مگر کھلونے ہوتے تو تھے۔انگلش میڈیم اسکول میں وین میں بیٹھ کر بھلے نہ جاتی تھی، لیکن پیدل چل کر سرکاری اسکول میں بھی

اس نے تعلیم وذہانت کے وہ ریکارڈ قائم کیے جو ماموؤں کی اولادیں کئی سہولیات ہونے کے بعد بھی حاصل نہ کرپائیں، لیکن ایک احساس سے وہ نجات حاصل نہ کرپائی تھی۔اور وہ نہ باپ سے محرومی تھی اور نہ اس کے حوالے سے اماں کو ملنے والی ذلت، کوئی اولاد کی وجہ سے بیوی چھوڑتا ہے، کوئی دوسری عورت کے چکر میں پڑ کے، کوئی جہیز کے لالچ میں......

اس کی اماں کا قصور کم صورتی تھا۔کشمیری خاندان سے تعلق رکھنے والے، وجیہہ باپ اور حسین وجمیل سی ماں کے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے کس کے نقش لیے تھے۔تنگ پیشانی، قریب قریب لگی چھوٹی اندر کو دھنسی بٹن نما آنکھیں، باہر کو نکلے دانت جن کی وجہ سے دہانہ بھی پھیلا پھیلا سا لگتا۔موٹی بیٹھی ہوئی ناک اور تھوڑی پہ بدنما سا مسہ، شکل سے ہی وہ کرخت سی بدمزاج عورت نظر آتیں، لیکن یہ تو ان کو قریب سے جاننے والے جانتے تھے کہ اس بدہیئت اور بے کشش وجود میں کس قدر حسین فطرت چھپی ہوئی ہے۔خوش نما کو اماں سارے جہاں سے پیاری لگتیں پھر بھی وہ یہ سوچتی ضرور۔

اماں کا رنگ تو صاف ہی ہے، بدن بھی دبلا پتلا ہے۔اگر آنکھیں، ناک اور ہونٹ بھی خوبصورت نہ سہی مناسب ہی ہوتے تو اماں کتنی اچھی لگتیں، یہ دانت بھی ٹھیک ہوسکتے تھے اور مسہ بھی غائب کروادیا جاسکتا تھا، ان کے اپنے نقش اپنی اپنی جگہ مناسب و موزوں تھے لیکن قسمت......کہ رنگ اس نے باپ کا لیا، سانولا......جس کی وجہ سے ماموؤں کے گورے چٹے موٹے تازے کشمیری بچوں کے درمیان وہ سیاہ دھبہ محسوس ہوتی۔سب اسے کالو کہہ کر پکارتے۔جیسے جیسے اس کا قد نکلتا گیا۔رنگ صاف ہوگیا۔نقوش کی دلکشی مزید کھل کے سامنے آگئی۔سراپا بھی بڑا سبک سا تھا، لیکن اماں کے حوالے سے شکل وصورت کا یہ کامپلیکس اس کے دماغ سے نکل نہ سکا۔کالج جانے کے بعد بھی یہی حال رہا۔فرینڈز اکثر کہتیں۔

"ہائے خوش نما! تمہارے ہاتھ کتنے پیارے ہیں، نازک نازک سے۔"

"یار! تمہاری اسکن بہت ملائم ہے، کیا لگاتی ہو......؟" یا پھر......

"یہ کلر اچھا لگ رہا ہے تم پہ......لیکن یہ کوئی نہ کہتا......" خوش نما! تم کتنی خوبصورت ہو، تم ہر رنگ میں اچھی لگتی ہو۔"

اور کیوں کہتا، کالج میں ایک سے ایک حسین لڑکی موجود تھی۔کسی کے بال گھٹاؤں جیسے تھے تو رنگ میں گلابیاں گھولنے میں بھی قدرت نے فیاضی سے کام لیا تھا۔کسی کے

لب یاقوتی تھے تو نیلم سی آنکھیں اور چار چاند لگا تیں، جب کہ وہ بس ٹھیک ہی تھی۔

تاجور آنٹی کا پاکستان آنا شاید اس کے لیے غیبی امداد تھی، اماں کے گزر جانے کے بعد بلاشبہ وہ بے حد اکیلی رہ گئی تھی لیکن پھر بھی یہ سوچ سوچ کر لرز جاتی کہ اگر خدانخواستہ تاجور آنٹی نے اماں کی ہمت نہ بندھائی ہوتی تو آج اماں کے بعد ماموں کے گھر کی باورچن اور جمعدارنی وہ ہوتی۔

اماں جاتے جاتے اسے تعلیم کی مضبوطی عطا کر گئی تھیں۔ ان کی انتھک محنت نے اسے ایم اے کروا بھی دیا تھا، لیکن افسوس رزلٹ آنے سے پہلے ہی اماں گزر گئیں۔ بہن کو تو پھر بھی کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیا تھا، لیکن اس کی یہ بیٹی سراسر ناکارہ وجود تھی۔ جو نہ تو مفت میں کپڑے سی سکتی تھی نہ ہی درجنوں افراد کے لیے روٹیاں پکا سکتی تھی۔

یہاں بھی تاجور آنٹی کام آئیں، وہ اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔ تسلی دینے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ روتی بلکتی خوش نما کو چند دنوں میں اس حالت تک تو وہ لے آئیں کہ وہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچنے کے قابل ہوگئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ رزلٹ آنے کے بعد وہ کوئی جاب کر لے گی۔ چاہے کم تنخواہ والی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا خرچہ ہی کتنا تھا ابھی وہ یہ پلاننگ کر ہی رہی تھی کہ تاجور آنٹی کی بڑی بیٹی زرمین باجی نے دھماکا کر دیا۔

وہ ماں سے بڑھ کے فلاحی منصوبہ لائیں۔ اپنے اکلوتے اور کماؤ دیور کا رشتہ یتیم و مسکین بے آسرا سی خوشنما کے لیے لا کر۔ وہ ہرگز تیار نہیں ہوتی لیکن تاجو آنٹی کی ایک ہی بات نے اسے تھکا کر ایک طرف بٹھا ڈالا۔

بیٹا! میں بھی بہوؤں والی ہوں، تمہاری ماں تمہارے ماموؤں کی سگی بہن نہ تھی، اس لیے تم اس کا حال دیکھ چکی ہو، تم بھی میرے بیٹوں کی دور پرے کے رشتے سے بہن لگتی ہو۔ میں جب تک ہوں، چاہے کس دل سے بھی سہی وہ تمہیں برداشت تو کر لیں گے لیکن میرے بعد..... ذرا سوچو کیا تم وہ زندگی گزارنا چاہو گی جو خوش بخت۔"

"نہیں لیکن آنٹی! اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میری شادی کے بعد زندگی بہت آسان ہو جائے گی، اس گھر میں میرے لیے خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔"

"کوئی گارنٹی نہیں۔" آنٹی نے صاف گوئی سے کہا۔ "لیکن امید تو ہے، یہاں تو یہ بھی نہیں۔ اور پھر وہاں عزت بھی ہوگی جو یہاں معدوم ہے۔ کل کلاں کو کوئی بھی بہو تمہارے، یعنی ایک جوان جہاں غیر لڑکی کے یہاں رہنے پہ اعتراض کر سکتی ہے جو

تمہارے لیے ذلت کا باعث ہوگا اور پھر سو فیصد نہ سہی۔ اتنی گارنٹی تو میں دے سکتی ہوں کہ تمہیں وہاں عزت ملے گی۔ آخر میری اپنی بیٹی کی سسرال ہے۔ سالوں سے جانتی ہوں اگر تمہیں میرے خلوص پہ شبہ ہے تو یہ سوچو جہاں اپنی بیٹی دے سکتی ہوں وہ غلط جگہ تو نہیں ہوگی۔"

"نہیں آنٹی......! آپ کے خلوص پہ مجھے کوئی شک نہیں......لل......لیکن زرمین باجی تو اکثر......میرا مطلب ہے اپنے سسرال۔"

"ہاں، وہ......" انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ "تم میں اور زرمین میں بہت فرق ہے بیٹا۔ اس نے ہتھیلی کا چھالا بن کر زندگی گزاری ہے، لیکن چھالے کی جلن کیا ہوتی ہے وہ نہیں جانتی۔ اس کی ساس اللہ بخشے ذرا مزاج دار خاتون تھیں۔ سخت مزاج بھی تھیں، لیکن ویسی نہیں جیسی کہ زرمین بتایا کرتی تھی۔ ساس بہر حال ساس ہی ہوتی ہے۔ ایسی ایسی جلاد فطرت ساسیں ہوتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اچھے مزاج کی ساس کی بھی چند ایک باتیں چبھتی ہیں۔ لیکن زرمین ذرا جلدی بھڑک جاتی تھی، باقی سب تو ٹھیک ہیں۔ شوہر بھی شریف بندہ ہے، اس لیے زیر عتاب آیا رہتا ہے۔ خیر اب تو وہ گزر گئیں۔ سارا گھر زرمین کے کاندھوں پہ ہے۔ سب نے خوشی خوشی اس کی حکمرانی قبول کی ہے۔ تمہاری بات اور ہے، تم میں صبر و برداشت زیادہ ہے۔ اب تو تمہاری کوئی ساس نہ ہوگی، لیکن اگر وہ زندہ ہوتیں تب بھی تمہاری مزے سے نبھ جاتی۔"

وہ یہ سن کر چپ کر گئی۔ اس کی چپ کو رضامندی جانتے ہوئے آنٹی نے ان لوگوں کو مثبت جواب دے دیا، شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ خاندان میں خبر پھیلی کہ شادی کے دوسرے سال گھر سے طلاق کا لیبل لگا کر نکالی جانے والی خوش بخت کی وہ بیٹی جسے اس نے سلائی کر کر کے پالا ہے اور جسے ماں کے بعد ماموؤں نے رکھنا تک گوارا نہ کیا۔ اس کی شادی فیکٹریوں کے مالک حاجی سلطان احمد کے چھوٹے بیٹے، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ، خوبرو، وجیہہ، نصیب احمد سے ہو رہی ہے۔ سب کے دلوں پہ جیسے سانپ لوٹ گئے۔ جلے دل کی بھاپ منہ کے رستے نکلنے لگی۔

"ارے ہٹو، کہاں کی شادی، کیسی شادی، زرمین تو سدا کی مطلبی اور چالاک ہے۔ اپنی چاکری کرانے کے لیے ملازمہ نکاح میں لے جا رہی ہے۔"

"اور کیا۔ سنا ہے لڑکا اسلام آباد میں رہتا ہے، اپنا فلیٹ ہے، گاڑی ہے اتنی اچھی نوکری اور حسین بھی بہت ہے، اس کے لیے یہ یتیم مسکین مری چھپکلی ہی رہ گئی تھی۔"

"ہاں وہ تو بھابھی کے سپرد کر کے خود اسلام آباد چلا جائے گا۔ ارے دیو بھوت سے لڑکوں کو ذرا اچھی نوکریاں مل جائیں تو حور پریاں مانگتے ہیں، بمعہ جنت کے یعنی رعب داب والی سسرال ہو اور بھاری جہیز بھی، نجانے نرمین نے کیا جادو چلایا ہوگا۔؟"

"تم نے اس کے سسر کو تو دیکھ رکھا ہوگا۔ اپنے حاجی صاحب کو۔ انہی کے ذریعے معاملہ طے کیا ہوگا۔ بڑے خدا ترس انسان ہیں۔ نرمین نے نقشہ کھینچا ہوگا۔ خوش نما کی بیچارگی کا، وہ جنت کے لالچ میں بیٹا داؤ پہ لگانے کو تیار ہو گئے۔ جوان لڑکا وہ بھی کماؤ، خود مختار، پتا نہیں کس طرح دھمکیاں دے دے کر مجبور کیا ہوگا۔"

یہ سب چہ میگوئیاں اسے سراسیمہ کرنے لگیں۔ نرمین باجی سے وہ بخوبی واقف تھی قدرے لاپروا، کام چور اور ناشکری سی ضرور تھیں، لیکن آخر کو تاجور آنٹی کی بیٹی تھیں، خود غرض اور منصوبہ ساز ہرگز نہیں تھیں اس لیے اس بات پہ تو اسے یقین نہ آیا کہ وہ اسے بے دام کی ملازمہ بنانے کی خاطر دیورانی کے روپ میں لیے جا رہی ہیں، البتہ خدا ترسی، بیچارگی، اور ثواب کمانے والی بات کہیں دماغ کے اندر اٹک کے رہ گئی۔

"باجی پلیز! میرے ساتھ یہ ظلم مت کریں، آپ اور آنٹی میرے اپنے ہیں۔ آپ کے سو احسان میں جی جان سے اپنے سر لے سکتی ہوں، لیکن غیروں کے آگے مجھے ہلکا مت کریں۔ مجھ سے ساری عمر کسی کے آگے احسان مندی سے سر جھکا کے نہیں جیا جائے گا، اس احساس کے ساتھ کہ مجھے میری اوقات سے بڑھ کے نوازا گیا۔ میں نہیں چاہتی، مجھ پہ ترس کھا کر، بحالت مجبوری کوئی مجھے اپنائے۔"

"پگلی! تم کن چکروں میں پڑ گئی ہو، کون کھا رہا ہے تم پہ ترس، ارے ہم سب پورے ارمانوں کے ساتھ تمہیں اپنا بنا رہے ہیں۔"

"مجھے بنائیے مت باجی! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آج کل لوگوں نے اپنی بہوؤں کے لیے کیا معیار بنا رکھے ہیں۔ میں کم از کم آپ کی سسرال کے معیار کے مطابق تو نہیں ہوں، نہ باپ نہ بھائی، نہ جائیداد نہ جہیز......"

"انہیں صرف تمہاری ضرورت ہے۔"

"ہاں، ایسی ہی حور پری ہوں ناں میں۔" وہ چڑ کے اٹھ گئی، کسی سے اپنی بات منوانے کی پوزیشن میں ہی نہ تھی۔ آنٹی نے اس دن خدشہ بھی تو ایسا ظاہر کیا تھا، ناچار آنسو بہاتی مایوں بھی بیٹھ گئی۔

نرمین باجی کی سسرال (اور اب اس کی بھی) جہلم میں تھی۔ بارات لے کر انہیں

لاہور تو آنا ہی تھا۔ باجی کے مشورے پہ مہندی کی تقریب مشترکہ کر لی گئی تاکہ آنے جانے کے وقت کی بچت ہو، سب لوگ مہندی والے دن ہی لاہور پہنچ گئے۔ لاہور میں ان کے قریبی عزیز تھے جہاں قیام کیا۔ شام کو جب لڑکے والے مہندی لے کر آئے تو لڑکا بذات خود ہمراہ تھا۔

طے پایا کہ ابھی اسی وقت لڑکی والے بھی رسم ادا کر لیں۔ اور لڑکی والے تھے کون، تاجور آنٹی اور ان کی فیملی بلکہ تاجور آنٹی ہی کیونکہ ان کے بیٹوں کو اس شادی پہ تو کوئی خاص اعتراض نہ تھا، مگر ماں کا، ایک پرائی لڑکی کے لیے اتنا روپیہ پانی کی طرح بہانا پسند نہ آیا۔ حالانکہ خوش نما نے ہر ممکن طریقے سے آنٹی پہ زیادہ بار نہ ڈالنے کی کوشش کی۔

دوسری جانب سے بھی جہیز کا خاص مطالبہ نہ تھا پھر بھی آنٹی نے تقریب وغیرہ کا جو خرچہ کیا وہی کافی تھا۔ چند سوٹ اور سینڈلیں آنٹی اور باجی نے بنا دیں۔ ماموؤں نے دنیا دکھاوے کو دس دس ہزار روپیہ اس کی ہتھیلی پہ رکھا، وہ لینے میں متامل تھی، مگر آنٹی کے اشارے پہ رکھ لیا۔

یوں دس جوڑے کپڑوں، ڈھائی تولے کے زیورات اور بیس ہزار نقد کے ساتھ وہ رخصت ہونے کو تیار تھی۔ اسے بڑے ماموں کی بیٹی شائلہ کی شادی کی تمام تفصیلات یاد تھیں، کیا چیز تھی جو جہیز میں نہ دی گئی تھی۔ اور باجی نرمین کی شادی پہ کیا کم رونق تھی لیکن اسی گھر سے جب اس کے لیے مہندی آئی تو اسے اپنی کم مائیگی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔

تاجور آنٹی جوان بیٹوں کے آگے مجبور و بے بس تھیں، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ہاتھ بندھے ہی رہے جب کہ وہاں سے آنے والی مہندی کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بری بھی اسی دن دے دی گئی۔ تاکہ شادی کے روز دلہن کو بری کے زیورات اور لباس پہنایا جائے، اس کی کزنز آ آ کر اسے شاندار ڈریسز اور بھاری جیولری کی تفصیلات سناتی رہیں اور وہ الجھتی رہی۔

"اتنی انویسٹمنٹ اور اس بیکار وجود پہ......" یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

کبھی کبھی اسے ان عورتوں کی باتوں پہ یقین سا آنے لگتا کہ ضرور اس میں نرمین باجی کا کوئی مفاد وابستہ ہے۔ کبھی فلموں کہانیوں میں پڑھی سچویشنز یاد آتیں کہ کس طرح ایک ایب نارمل لڑکے یا منشیات کے عادی کو دھوکے سے کسی غریب بے سہارا لڑکی کے پلے باندھ دیا جاتا ہے اور کبھی وہ تاجور آنٹی کے خلوص کے آگے ہار مانتے ہوئے ان

تمام وسوسوں کو جھٹک دیتی، لیکن مطمئن پھر بھی نہ ہوتی۔

نازو اس کے پیچھے پڑی تھی کہ ایک نظر کھڑکی سے باہر اپنے ہونے والے دولہا کو دیکھ لے۔

"اٹھ ناں خوشی! اک منٹ ذیکھ تو سہی، کیسے بھنگڑے ڈال رہا ہے اپنی مہندی پہ خود ہی۔"

اس کے بار بار کہنے پہ تنگ آ کے وہ مرے مرے قدموں سے کھڑکی تک گئی۔ باہر جھانکا، نازو کی نشاندہی پہ لان کے وسط میں پیڑھے پہ عورتوں کے درمیان اسے بیٹھا دیکھا گیندے اور سورج مکھی سے سجا پیڑھا لان میں بچھی زرد اور سرخ دریاں، سبز اور پیلے ملبوسات میں سجی سنوری عورتیں اور ان کے درمیان راجہ اندر بنا بیٹھا وہ نصیب تھا۔

دو تین روز کی بڑھی شیو، تیل لگے بکھرے بالوں میں وہ اس قدر دمک رہا تھا کہ وہ خود حیران رہ گئی۔ جو حالت عورتوں نے اس کی کردی تھی تیل، ابٹن اور مٹھائی کے ساتھ، اس کے باوجود اس کے چہرے کی بشاشت اور شگفتگی کمال تھی۔ سب سے بڑھ کر اس کی شفاف موتی سی رنگت کی سنہری چمک...... نجانے یہ گردوپیش میں چھائے پیلے رنگ کی جگمگاہٹ تھی یا اس کی اپنی جلد میں سونا گندھا ہوا تھا۔

"منڈا تے رج کے سوہنا اے۔"

تاجور آنٹی کی ضعیف ساس نے تبصرہ کیا۔

"سوہنا نہیں نانی! سونا ہے سونا۔" کسی لڑکی نے بڑی حسرت سے کہا۔ باہر لان میں کسی نے کیسٹ لگا دیا۔

"منڈا سونے رنگ دا دل لے گیا میرا سوں رب دی......"

شبنم مجید کی آواز ماحول پہ چھا گئی اور دولہا کے دوست پیلے دوپٹے لہرا لہرا کر ناچنے لگے۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

اپنی جگہ تک جاتے جاتے اس نے راستے میں لگے آئینے کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز کیا۔ باجی کے اصرار پہ وہ یہ گہرے پیلے رنگ کا کرتا پاجامہ پہن تو چکی تھی جس پہ سبز اور سلور گوٹا تھا لیکن جانتی تھی اس گہرے رنگ کے لباس میں اس کا گندمی رنگ مدھم ہو کر سانولا پڑ گیا ہوگا۔ ماتھے پہ بہتے تیل نے سارا چہرہ چپچپا کر رکھا تھا۔ نازو کے لگائے ابٹن نے پورے وجود میں زردی گھول رکھی تھی، اسے تو صبح آئینہ میں خود کو دیکھ کر گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ ٹی بی کی مریضہ لگ رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا، ابٹن ایسے ہی اثر کرتا ہے جب نہاؤ گی تو پھر دیکھنا میرے جادو اثر ابٹن کا کمال......" اس نے تسلی دی۔

"تو نے لڑکا دیکھا رینا، یہ خوشی تو اس کے آگے کچھ بھی نہیں۔" شائلہ کی سرگوشی نے اس کو احساس کمتری کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ جب نرمین باجی اسے رسم کے لیے لینے آئیں تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

"پلیز باجی! میرا تماشا مت بنوائیں۔ آپ چاہتی ہیں سب لوگ کھلم کھلا میرا مذاق اڑائیں۔ آپ نے اپنے دیور کو خدا ترسی اور ہمدردی کے نام پہ راضی تو کر لیا ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو' آپ کی ساری بھاگ دوڑ بیکار ہی جائے مجھے اس مرجھائی ہوئی حالت میں دیکھ کر اس نے عین رسم کے موقع پر ہی انکار کر دیا تو پھر......؟"

"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ کیسی اناپ شناپ باتیں کر رہی ہو۔ کس نے بھری ہے یہ خرافات تمہارے دماغ میں' اسٹوپڈ لڑکی! اتنا پڑھ لکھ کے گنوایا ہے بس تم نے۔ تم میں کیا کمی ہے بتاؤ تو؟ ارے تعلیم اور ذہانت کے بل بوتے پہ معذور اور نامکمل انسان بھی دنیا کا سامنا پوری جرات کے ساتھ کر لیتے ہیں اور تم......؟ یہ موقع نہیں اس قسم کی بحث کا ورنہ میں تمہاری خوب خبر لیتی' چلو اٹھو' وہ دیکھو میرے سسرال کی خواتین بھی اندر آ رہی ہیں۔ شاباش بی کونفیڈنٹ......"

"کہاں سے لاؤں کانفیڈنس' وہ تو میرے باپ نے اس وقت میری روح سے کھینچ لیا تھا جب شاید میں اس دنیا میں بھی نہیں آئی تھی۔ آپ تعلیم' ذہانت کی بات کرتی ہیں' جرات اور حوصلے کی' بتایئے میری ماں میں کیا کمی تھی' سگھڑ' صابر' شاکر' محنتی' خوش اخلاق اعلیٰ خاندان سے تعلق' لیکن اس کے بل بوتے پہ تو وہ ایک دن بھی نہ قبولی گئیں۔"

نرمین باجی کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر لڑکیوں کو قریب آتے دیکھ کر آہستہ آواز میں بس اتنا کہہ سکیں۔

"عجیب ضدی لڑکی ہو' اچھا کل کیا کرو گی' اسی طرح منہ چھپائے بیٹھی رہو گی۔"

"کل کا کل دیکھیں گے۔ آج تو بالکل ہمت نہیں اس حلیے میں باہر جانے کی۔ کل نازو کسی بیوٹی پارلر میں لے جا تو رہی ہے۔" وہ طنزیہ ہنس کر دلاسا دینے لگی۔ "شاید وہ گزارے لائق بنا ہی دیں۔"

پھر نرمین باجی نے "دلہن کی شرم و جھجک" کا بہانہ بناتے ہوئے بات بمشکل سنبھالی اور یوں چند معتبر خواتین نے کمرے کے اندر ہی رسم ادا کی۔

اگلے دن بیوٹی پارلر میں لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ہونے والی بدمزگی نے اور کام خراب کیا۔ اچھے خاصے قیمتی شرارے اور بھاری زیورات کی بھی شو ماری گئی (اس کے ذاتی خیال میں ورنہ آنکھوں کا میک اپ قدرے ڈارک ہوجانے اور ہیئر اسٹائل ڈھنگ کا نہ بننے کے علاوہ کوئی خاص بات نہ ہوئی تھی) سسرال پہنچنے کے بعد رباب نے اس کا از سر نو میک اپ کیا اور کافی عورتوں کے تعریفی کلمات نے اس کی پسیجتی ہتھیلیوں' ڈوبتے دل اور کپکپاتے قدموں کو سہارا دیا۔

لیکن نصیب اس کی توقع سے کہیں بڑھ کے مغرور اور خود پسند واقع ہوا تھا اس نے اسے ذرا لفٹ نہ کرائی نہ صرف یہ بلکہ شادی کے اگلے دن بھی سب کے سامنے کھلم کھلا اسے مذاق کا نشانہ بنایا۔

وہ اس کی زبان سے ڈرنے لگی تھی' کبھی بھی کہیں بھی' کسی کے بھی سامنے کچھ بھی کہہ سکتا تھا اس حد تک زبان دراز تھا۔

سسرال میں باقی سب کچھ فی الحال تو معمول کے مطابق ہی تھا۔ ساس دو سال پہلے گزر چکی تھیں اگرچہ خوش نما نے انہیں سرسری سا دیکھ رکھا تھا لیکن زرمین باجی کے حوالے سے ان کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ ان کی اپنی ساس سے ذرا نہیں بنتی تھی' شوہر سے بھی اسی سلسلے میں اختلافات رہتے۔

سسر البتہ بے حد شریف النفس' نمازی' پرہیزگار انسان تھے۔ ان کی شخصیت کا نور چہرے سے ہی چھلکتا تھا۔ خوش نما کو یقین تھا وہ ضرور اس گھر میں ان کی حمایت سے آئی ہے ورنہ زرمین باجی اتنی بااثر بھی نہیں کہ دیور پہ زبردستی کرسکیں۔

''انہوں نے نیکی کمانے کے لیے میرا انتخاب کیا لیکن یہ کیا جانیں کہ انہیں تو ثواب مل جائے گا' مجھے کیا ملے گا؟ ہردم پیروں کے تلے زمین کھسکنے کا خوف' سر کی چھت اڑنے کا اندیشہ۔ بیٹے کو نجانے کیا دھمکیاں' ڈراوے' جذباتی بلیک میلنگ کے ذریعے رضامند کرکے وہ تو مطمئن ہیں لیکن ساری بے اطمینانی تو میرے حصے میں آئی۔''

وہ دل گرفتہ ہوکر سوچتی۔ شادی کے پہلے ہفتے ہی اس نے اس رشتے کے انجام کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔

''میرا تو اب کوئی ٹھکانا بھی نہیں۔ خدانخواستہ کل کو ابا جی نہ رہے تو نصیب پر کس کا زور؟ وہ اپنی من پسند لڑکی سے شادی کرلیں گے۔ میں کہاں جاؤں گی۔ اس سے تو اچھا تھا زرمین باجی میری شادی کسی کم رو ان پڑھ اور غریب سے بندے سے کروا دیتیں۔ کم

از کم وہ میری قدر تو کرتا۔ اس کے ساتھ کھڑے ہونے میں مجھے یہ خدشہ تو نہ تھا کہ میری شخصیت گہنا رہی ہے۔ اُف..... آنٹی! آپ نے غلط کہا تھا.... میں پہلے بھی غیر محفوظ تھی اب بھی وہی بے سکونی ہے۔ مجھے تحفظ ہی تو چاہیے تھا' اسی کی تلاش میں آپ کے آسرے سے نکل کر شادی پہ تیار ہوئی تھی مگر کہاں ہے تحفظ' کہاں ہے عزت' ہر وقت یہی ڈر کہ کب وہ میرے باپ کی طرح مجھے اپنے گھر سے۔''

وہ گھبرا کر ابا جی کی لمبی عمر کی دعائیں مانگنے لگتی۔ جن کے دم سے اتنی تسلی تو تھی کہ نصیب کسی نہ کسی طرح اسے برداشت کرتے رہیں گے۔

رشتے کے بہنوئی کی حیثیت سے حسیب بھائی کو پہلے سے جانتی تھی' البتہ ان کی سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔ اب جیٹھ کے قریبی رشتے میں بھی وہ اتنے ہی سرد مہر اور اجنبی اجنبی سے لگتے۔ اسے ان کا یہ گریز زیادہ اس لیے نہ چبھتا کہ صرف اسی کے ساتھ نہیں بلکہ گھر کے تمام افراد کے ساتھ وہ لیے دیئے ہی رہتے۔

زرمین باجی بھی ان کی خشک مزاجی سے نالاں تھیں بلکہ وہ تو سراسر اسے بے حسی کا نام دیتیں۔ خود ان کا اپنا حال تو یہ تھا کہ بلا کی شدت پسند تھیں۔ مزاجوں کا یہی تضاد تھا جو وجہ تنازعہ بنا ہوا تھا لیکن اس معاملے میں جہاں باجی کی جذباتیت اور جلد بازی نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی وہاں حسیب بھائی کی متحمل مزاجی مددگار ثابت ہوتی تھی اور دونوں نبھائے چلے جارہے تھے۔ نہ صرف بیوی بلکہ نصیب بھی بڑے بھائی سے خائف اور گلہ کناں رہتا۔

انہیں لمبے لمبے لیکچر جھاڑنے کا عارضہ تھا' بسا اوقات وہ اسے چھوٹے بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے۔ چڑ کر اس نے انہیں ''خطیب بھائی'' کا نام دے چھوڑا تھا۔

نام کے حوالے سے بخشتا تو خیر اس نے کسی کو بھی نہیں تھا۔ زرمین باجی کو ہمیشہ غمگین بھابھی کہہ کر پکارتا اور یہ تو خوش نما بھی جانتی تھی' انہیں سب کچھ حاصل ہوتے ہوئے بھی دکھڑے رونے کا کس قدر ہوکا ہے۔ اس نے ان کی زبانی اپنی سسرال کے اتنے قصے سن رکھے تھے کہ سوچ کر لرز جاتی اب چند ہی دنوں میں گھر کا ماحول پرکھ لینے کے بعد وہ جان گئی کہ وہ صرف عادتاً ذرا سی بات کو بڑھا چڑھا کے بیان کرتی ہوں گی۔

نصیب کی والدہ کو گزرے دو ہی سال تو ہوئے تھے اگر انہوں نے گھر کو اس قدر اذیت ناک بنا رکھا ہوتا تو کچھ اثرات تو اب بھی نظر آتے۔ اسے تو زرمین باجی کے تمام تر شکوے شکایتیں بے جا ہی لگتیں۔

جگنو اور بلبل' ان کے پیارے پیارے بچے' نصیب ان کے درست نام لیتا تو اسے بڑی حیرت ہوتی ایک روز اس نے خود ہی بتایا۔

''غمگین بھابی نے اپنی اولاد کے نام رکھنے میں کوئی کسر چھوڑی ہے جو میں بگاڑوں۔ پتا ہے انہوں نے شادی کے بعد علامہ اقبال کی ''ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا' بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا'' بہت پڑھی تھی یہی دو نام ذہن پہ سوار تھے۔ یہ تو شکر ہے انہوں نے ''ایک مکڑا اور ایک مکھی'' زیادہ نہیں پڑھی۔''

اور نانو' اس گھر کی سب سے متوازن ہستی۔ بارعب بھی' سنجیدہ بھی' دوستانہ مزاج بھی۔

خوش نما کو حیرت ہوتی کہ ان کی اپنے چھوٹے نواسے سے اتنی کیسے بنتی ہے۔ وہ تو اس قدر منہ پھٹ اور بڑبولے ہیں' نانو کی کیسے نبھ جاتی ہے۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

اس کا اپنا دل تو نانو کے پاس بہت لگتا۔ انہیں مقابل کے دل میں جھانکنا آتا تھا۔ ہمیشہ مخاطب کے موڈ کے مطابق گفتگو کرتیں۔ ابا جی نے بالکل درست فیصلہ کیا تھا انہیں یہاں لانے کا۔ نرمین باجی فطرتاً لاکھ مخلص سہی' ذمہ دار ہرگز نہ تھیں۔

اور گھر کا سب سے اہم فرد (کم از کم اس کے لیے) تو نصیب تھا کیونکہ وہ اسی کے حوالے سے یہاں موجود تھی لیکن یہ حوالہ قابل فخر نہ تھا اس کے لیے۔ وہ اس کا سامنا کم سے کم کرنے میں ہی اپنی عافیت جانتی۔ اسی سے بچنے کی خاطر اس نے جلد ہی گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا' باجی اور نانو کے لاکھ منع کرنے کے باوجود۔ ویسے بھی اس نے اس گھر میں جگہ بنائے رکھنے کا یہی طریقہ سوچا کہ زیادہ سے زیادہ ''مفید'' ثابت ہو کر دکھاؤں۔

رہا نصیب تو اس کا کیا تھا' چھٹی ختم ہوتے ہی اس نے واپس اسلام آباد جانا تھا۔ گھر کے بقایا افراد کے ساتھ گھلنا ملنا اس کے لیے اتنا مشکل نہ تھا۔ وہ دن گن گن کے اس کے واپس جانے کا انتظار کرنے لگی۔

★★★

وہ نانو کے پاس بیٹھی مٹر چھیلتی ہوئی ان سے ''قصص الانبیاء'' کے اقتباسات سن رہی تھی۔ ابا جی رائے ونڈ کسی مذہبی اجتماع میں شرکت کے لیے گئے تھے' حبیب بھائی حسب معمول فیکٹری' بچے اسکول تھے اور نرمین باجی مکمل فرصت کا یہ طویل دورانیہ اپنے کمرے میں انجوائے کرتی تھیں۔ انجمن کے کام کی نگرانی نانو ہی کرتی تھیں اور اس کے

سر پہ سوار ہو کر دوپہر کا کھانا بھی پکواتیں۔ اب دو تین روز سے یہ ذمہ داری خوش نما اٹھا رکھی تھی۔ اس کا بس چلتا تو خود ہی پکانا بھی شروع کر دیتی لیکن نانو کو تو اس کا کچن میں جانا ہی سرے سے پسند نہ تھا۔

''ہفتہ بھر تو ہوا ہے تمہیں بیاہ کر آئے۔ خبردار جو چولہے کے پاس بھی گئیں تو۔ بس اتنا بہت ہے کہ اس موٹی انجمن کی نگرانی کر لیتی ہو۔ بڑی دلہن بس رات کا ہی کھانا بناتی ہیں وہ بھی حسیب کے کہنے پر کیونکہ اسے ملازمہ کے ہاتھ کا پکا کھانا پسند نہیں۔ ورنہ وہ تو کچن میں جھانک کر بھی نہ دیکھیں۔ خیر تسلی تو مجھے بھی نہیں ہوتی۔ اسی لیے مسلسل اس کے سر پہ کھڑی رہتی ہوں۔ میں نہ دیکھوں تو گندے سندے ہاتھوں سے ہی آٹا بھی گوندھ لے اور سبزی گوشت بھی بغیر دھوئے چڑھا ڈالے۔ کم بخت کے ہاتھ ہر وقت تو سر میں گھسے رہتے ہیں' جوؤں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے کو۔''

''لیکن نانو! مجھ سے یوں فارغ وقت بھی تو نہیں گزرتا۔''

''بس بس' چپ کر کے یہ مہینہ گزار لو۔ پھر تمہارا ہاتھ کھیر میں ڈلواتی ہوں۔''

''کیوں کھیر خراب کرنی ہے نانو! خود ہی کہتی ہیں' رزق کی عزت کرو خود ہی اسے کھیر میں ہاتھ مارنے کی ترغیب دے رہی ہیں۔ چمچہ کا استعمال کیوں نہیں سکھاتیں۔''

حسب عادت نصیب نے گفتگو میں دخل دیتے ہوئے ادھر ادھر کی ہانکی۔

وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔ ''آخر یہ اسلام آباد چلے کیوں نہیں جاتے۔'' اس کی سوچ کی ہر تان یہیں آ کر ٹوٹتی۔ اس وقت بھی یہی ہوا وہ اچھی بھلی بیٹھی نانو سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملکہ سبا سے ملاقات کے احوال سن رہی تھی کہ اچانک وہ شور وغل مچاتا اس طرف چلا آیا۔

''کیسی ہیں میری پری چہرہ نانو۔'' وہ نانو سے لپٹ گیا۔

''تمیز سے برخوردار۔ کتنی بار کہا ہے' کم از کم مجھے تو الٹے سیدھے ناموں سے مت پکارا کرو۔'' انہوں نے گردن سے اس کا حلقہ پرے ہٹایا۔

''یہ تو آپ کا خطاب ہے۔ اچھا بتائیں' آپ کا نام کیا ہے۔'' اس نے پھر سے باہیں گلے میں ڈال دیں۔

''میرا دماغ مت چاٹو نصیب۔''

''نسیم بانو۔'' وہ سن کر بھی نہیں سن رہا تھا۔ یہی اس کی عادت تھی بس اپنی ہی ہانکے جانا۔ ''یہی نام ہے ناں.... اور نسیم بانو کا خطاب پری چہرہ ہی تھا۔ ہے کہ نہیں؟ بتایئے

آپ کے زمانے کی تو بڑی مشہور ہیروئن رہی ہے۔''

''حد سے زیادہ بدتمیز ہوتے جا رہے ہو تم نصیب۔ اب بوڑھی نانی کو گانے بجانے والیوں سے ملانے لگے ہو۔'' وہ بگڑ گئیں۔

''استغفراللہ..... توبہ توبہ..... آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ لگتا ہے آپ کو فلموں وغیرہ سے دلچسپی نہیں رہی' اس لیے نہیں جانتیں کہ پری چہرہ نسیم بانو گانے والی نہیں تھی وہ تو صرف.....''

''اب تم چپ کرو گے یا پھر میں تمہیں دو لگاؤں؟''

''ہیں؟ نانو..... یہ آپ کہہ رہی ہیں؟'' وہ صدمے کی شدت سے بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔

''آپ تو ایسی نہ تھیں نانو..... یہ کس کی خشک صحبت نے آپ کی محبت کے سوتے خشک کر دیے۔ اچھا اچھا سمجھ گیا..... ضرور پری چہرہ نسیم بانو نانا جان کی پسندیدہ ہیروئن رہی ہوگی اسی لیے آپ اتنا خار کھا رہی ہیں اس کے نام سے۔''

''تمہیں تو میں.....'' سامنے سے آنٹی نور جہاں کو آتے دیکھ کر نانو نے اسے ڈپٹنے کا پروگرام سمیٹتے ہوئے چپ رہنے کا اشارا کیا مگر وہ نصیب ہی کیا جو چپ کر جائے۔

''بڑے دنوں بعد ملکہ ترنم کی سواری آئی ہے اور آہا..... بندر یار! تو بھی آیا ہے۔ تجھے فرصت مل گئی اپنی دکانداری سے۔'' خالہ زاد منظر اس کا لنگوٹیا کہلایا جا سکتا تھا۔

''مجھے تو فرصت ہی فرصت تھی۔ آیا اس لیے نہیں کہ تم فرصت سے نہیں ہو گے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

خوش نما بھی رباب کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔ نانو تو بیٹی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نصیب منظر کو لے کر وہیں بیٹھ گیا۔ اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھنے سے احتراز ہی کیا کرتی۔ اس کی فقرے بازی کی رگ ارد گرد کسی کو دیکھ کر زیادہ ہی پھڑک جایا کرتی تھی۔ وہ رباب کو لے کر وہاں سے ہٹنا ہی چاہتی تھی کہ انجمن آ گئی۔ وہ اسے کچن کے ضروری کاموں کی تفصیل بتانے رک گئی لیکن اس سے پہلے نصیب اس کی کلاس لینے بیٹھ گیا۔

''کیوں بھئی من دو من؟ یہ وقت ہے تمہارے آنے کا؟''

''ہاہائے پائی جان' کیا بتاواں' رات کتنی زور کا درد اٹھا میرے پیٹ میں حالانکہ میں نے سکھی روٹی چائے کے ساتھ کھائی تھی' ککڑ' کباب کھانے والوں کے پیٹ ٹھیک

رہتے ہیں' ہم غریبوں کے ہی درد ہوتا ہے۔ آدھی رات تڑپ کے گزاری۔ سویرے آنکھ دیر سے کھلی۔''

''یہ کہانیاں کسی اور کو سنانا' کیا میں نہیں جانتا کہ تم ہر پیر والے دن دیر سے کیوں آتی ہو۔ اتوار کی رات سارے گلی والے کرائے پہ وی سی آر منگا کر ساری ساری رات فلمیں دیکھتے ہو۔ سوکھی روٹی چائے کے ساتھ کھانا منظور ہے لیکن فلم دیکھنی نہیں چھوڑنی۔''

''جب آپ کو پتا ہے تو پوچھتے کیوں ہو؟'' ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتی وہ کچن کی طرف مڑنے والی تھی کہ خوش نما نے آواز دے کر روک لیا۔

''انجمن! مٹر کے دانے میں نے نکال دیے ہیں یہ لے جاؤ' ان میں سے تھوڑے سے نکال کر ابلنے کے لیے رکھ دینا' باقی دھو کر رکھ دو۔ فریج میں سے ایک پیکٹ مرغی کا اور ایک قیمے کا نکال کر پگھلنے کے لیے سنک میں رکھ دو۔ لہسن' پیاز وغیرہ بنا کر رکھ دو۔ آدھی پیاز سالن کے لیے کاٹنا اور آدھی کبابوں کے لیے باریک پیس لینا۔ کھانا میں خود بناؤں گی۔ خالہ آئی ہیں تم تو نجانے کیا گھول کر سامنے رکھ دیتی ہو۔''

کل ہی نانو نے اس سے فرنی بنوائی تھی اس کے بے حد اصرار پہ لیکن اس تاکید کے ساتھ کہ اسے ابھی سے کچن میں گھسنے کی کوئی ضرورت نہیں' وہ ان کی تاکید فراموش کیے اس وقت صرف مہمانداری کی فکر میں ہلکان ہو رہی تھی۔

''نہیں بھابی پلیز' کھانے کا اہتمام مت کرنا۔'' رباب نے روکا۔

''اور کیا' ہم لوگ تو آپ کو ڈنر پہ انوائٹ کرنے آئے ہیں۔'' منظر نے بھی منع کیا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ منظر بھائی! یہ آپ کا اپنا گھر ہے' تکلف کی کیا بات اور آپ کا گھر بھی ہمارا اپنا ہی ہے' خاص طور پہ انوائٹ کرنے کی کیا ضرورت۔'' وہ اخلاق سے گویا ہوئی۔ اس محبت کے مظاہرے نے دونوں کو مزید تکلف کا مظاہرہ کرنے سے روک دیا۔

''من دو من! یہ تو بتاتی جاؤ رات کون سی فلمیں کھڑکائیں۔'' نصیب نے پھر اسے باتوں میں الجھانا چاہا۔

''مولے دا کھڑاک' اک گجر سو بدمعاش اور چور رانی۔ ساری کی ساری شان کی فلمیں تھیں۔ ایک سے ایک زبردست۔'' وہ مزا لے کر بولی۔ ''پائی جان! ویسے آپس کی بات ہے۔ تسی کیوں نئیں فلماں میں کام کرتے۔ تسی کسی ہیرو سے کم ہو۔''

''یار! فلموں میں کام کرتو لوں مگر ہیروئن کہاں سے لاؤں۔ کوئی جچے گی میرے ساتھ؟'' بڑے نخرے کے ساتھ پوچھا گیا۔ خوش نما نے چونک کر اس کی اکڑی گردن پہ سجے مغرور چہرے کو دیکھا۔

''لو جی' صیمہ (صائمہ) ہے' ریما ہے....'' وہ گنوانے لگی کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''بس بس اب مجھ سے اپنی چہیتیوں کی شان میں گستاخی مت کروا بیٹھنا۔''

''تمہارے لیے انڈیا سے ہیروئن امپورٹ کروائیں۔'' منظر نے پوچھا۔

''توبہ کرو' مجھے تو انڈیا کی کوئی ہیروئن ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ عجیب چالاکو ماسیاں سی ہوتی ہیں' پھاپے کٹنیاں سی۔''

''خیر ایسی بات تو نہیں اور سب کا چھوڑ' ایشوریہ رائے کے حسن کے بارے میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں' ہر طرح سے مکمل اور بے داغ حسن۔'' وہ خود سب سے بڑا فین تھا۔

''بے شک.....لیکن اس کی خوبصورتی پلاسٹک میڈ لگتی ہے۔ کسی موی مجسمے کی طرح' شوکیس میں سجی سنوری پتلیاں ہوتی ہیں ناں.....اس میں خوبصورتی ہے مگر دلکشی نہیں۔ حسین تو لگتی ہے مگر ''پیاری'' نہیں۔''

''اس نے یہ بھی ریجیکٹ کردی تو اندر جانے کا ارادہ موقوف کر کے خوش نما بہانے سے وہیں ٹک کر کارپٹ پہ بکھرے اخبار سمیٹنے لگی تاکہ اس شہزادہ گلفام کے معیار حسن کی حدیں تو جانچ لی جائیں۔ منظر کو بھی اس ذکر میں دلچسپی محسوس ہوئی وہ یوں ایک کے بعد ایک نام گنوانے لگا جیسے نصیب کے کسی پہ ہاں کرتے ہی وہ فوراً اسے سائن کر کے فلم بنوا ڈالے گا۔

''ایسا کرتے ہیں' ہالی وڈ کھنگالتے ہیں۔ ہالی ووڈ کی کوئن جولیا رابرٹس؟''

''وہ بڑے دانتوں اور اونٹنی کے ہونٹوں والی؟''

تمسخر سے کہا گیا۔

''پینلوپ؟''

''اس کے نقش ضرورت سے زیادہ تیکھے ہیں' نوکیلی سی ناک اور تیز دھار ٹھوڑی۔''

''ڈریو بیری ومر؟''

''قدرے بہتر لیکن ایک تو موٹی ہوتی جارہی ہے دن بدن۔ دوسرے اس کے

چہرے پہ ایک مخصوص سا ہونق پن ہے' اجڈ سا تاثر جو ساری خوبصورتی غارت کر دیتا ہے۔''

''وینونا رائڈر؟''

''اس چورنی کا تو نام بھی مت لینا۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''اچھا تو پھر نکول کڈمین؟''

''نہیں' اس کی ناک تم سے ملتی جلتی ہے۔''

سنجیدگی سے کہا گیا۔

''مجھ سے؟'' منظر اپنی ناک ٹٹول کر رہ گیا۔

''ہاں.....مونکی نوز.....'' (بندر جیسی ناک)

''واہیات شخص.....ذلیل آدمی۔'' وہ بڑبڑا کے گالیاں دیتا رہ گیا۔

''ایسا کریں نصیب بھائی.....'' رباب نے اس بے تکی بحث میں حصہ لیتے ہوئے مشورہ دینا چاہا۔ ''پھر تو آپ کے ساتھ بھابھی کو ہی ہیروئن لینا چاہیے۔ ان کی ناک بھی ستواں ہے۔ ہونٹ بھی نہ پینلوپ کی طرح پتلے پتلے نامعلوم سی حدود والے ہیں نہ جولیا کی طرح پھولے پھولے' دبلی پتلی بھی ہیں۔''

''یار بندر! ایک ہیروئن کا نام تو تونے لیا ہی نہیں۔ ہیلی بیری۔''

''میرا دماغ خراب ہے کیا؟ تونے فوراً کہہ دینا تھا وہ کالی.....گنجی.....''

''بس میں اب بھی وہی کہتا ہوں۔'' مبہم سے انداز میں اس نے خوش نما پر ایسا وار کیا کہ وہ سر سے پیر تک سلگ اٹھی۔

''لو.....اسی لیے تو میں نے اس کا نام نہیں لیا۔ تم خود ہی کہہ رہے ہو۔'' منظر شاید اس کی بات کی گہرائی تک نہیں پہنچا تھا یا پھر جان کر انجان بن گیا تھا اور رباب تو سرے سے متوجہ ہی نہیں تھی۔ اس کا سارا انہماک ٹی وی پہ لگے ککنگ پروگرام کی طرف منتقل ہوگیا تھا۔ اس کے باوجود خوش نما کو سخت ترین سبکی کا احساس ہوا۔ غم کے ساتھ ساتھ غصے نے اس پہ ایسا شدید حملہ کیا کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کر سکی۔ اچانک ایک احساس نے اسے اس سکتے سے باہر آنے پہ مجبور کیا۔

''غصہ؟ غصہ اور مجھے.....مجھے تو صرف درد ہوتا تھا' بے بسی اور کسمپرسی کا احساس ہوتا تھا' تکلیف پہنچتی تھی.....غصہ کبھی نہیں آتا تھا.....پھر اب کیسے؟''

آنٹی کے نہ نہ کرنے کے باوجود نانو نے انہیں کھانے پہ روک لیا۔ انہیں خوش نما کی

پھرتی اور مہمان نوازی کی یہ ادا بھی بہت بھائی تھی۔ نرمین باجی تو کھانا لگنے سے بس چند منٹ پہلے ہی کمرے سے برآمد ہوئیں۔

"ارے نئی دُلہن کا ہاتھ کھیر میں ڈلوا بھی لیا؟ ابھی سے....ابھی تو دس روز ہوئے بیاہ کر آئی ہے۔" اس حیرت پہ نانو نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا' جیسے کہہ رہی ہوں۔" میں نہ کہتی تھی۔" اس نے فوراً وضاحت پیش کی۔

"بس آنٹی! بڑی ضد کے بعد یہ بات منوائی نانو سے۔ ان کا بس چلے تو سال بھر مجھے تنکا نہ توڑنے دیں۔ دراصل مجھ سے فارغ بیٹھے وقت نہیں گزرتا۔ یہ الگ بات کہ کھیر پکوا لینے کے بعد آج اتفاقاً ہی میرا داؤ لگ گیا۔ ورنہ نانو کی نظر بڑی تیز ہے۔ کچن میں گھسنے ہی کہاں دیتی ہیں۔"

"تو یہ سب تم نے اس ایک گھنٹے میں تیار کیا ہے؟" انہوں نے میز پہ نظر دوڑائی۔ مٹر پلاؤ' کچے قیمے کے کباب' مرغی اور آلو کا سالن' دہی پھلکیاں' چٹنی' رائتہ' سلاد..... ہر طرح سے مکمل تھا۔ "ماشاءاللہ بڑی پھرتیلی ہو۔"

"آنٹی! آپ کھانا شروع کیجیے۔ باقی تعریفیں بعد کے لیے اٹھا رکھیں۔ اس قدر لذت ہے خوشی کے ہاتھ میں۔" جو بھی تھا' نرمین باجی کم از کم اس کے لیے فراخ دل ہی تھیں۔ سست مزاج سی طبیعت میں حسد کا مادہ ذرا نہ تھا۔

اور پھر کھانے کی سب ہی نے جی بھر کے تعریف کی۔

"کباب بے حد خستہ ہیں۔" منظر نے کہا۔

"اور پلاؤ کی مہک بھی جدا ہے۔ کیا کسی کے بنائے مرغ پلاؤ میں بھی ایسی لذت ہوگی۔" آنٹی نے قصیدہ پڑھا۔

"اور مجھے تو ولایتی مرغی کا سالن کبھی پسند نہیں آیا' عجیب بے لذت سا گوشت ہوتا ہے ربڑ جیسا مگر تم نے تو اس میں بھی ذائقہ بھر دیا۔" نانو نے کہا۔

"سلاد کی سجاوٹ تو بے حد مہارت سے کی ہے آپ نے بھابی۔" رباب بولی۔

خوش نما حیران تھی' اس نے تو عام سا کھانا بنایا تھا جیسا ہمیشہ بناتی چلی آ رہی تھی اگرچہ ماموں کے گھر اماں نے اسے کام کاج میں زیادہ نہیں الجھایا تا کہ ان کی طرح وہ بھی گھن چکر نہ بن کے رہ جائے پھر بھی آتا اسے سب کچھ تھا۔ جب اماں کی طبیعت ٹھیک نہ ہوتی وہ ان کے منع کرنے کے باوجود سارا کام اپنے سر لے لیتی۔ اتنے بڑے کنبے کے لیے تین وقت پکا کر بھی کبھی ایک لفظ تعریف کا نہ اس کے حصے آیا نہ ہی اماں کے اور

یہاں سب کو مسلسل تعریفیں کرتا دیکھ کر وہ پزل سی ہوگئی۔ ایسا نہ تھا کہ اس گھر میں کبھی خوش ذائقہ کھانا بنا ہی نہ تھا۔

وہ اتنے دنوں سے دیکھ تو رہی تھی۔ دوپہر کو انجمن کھانا اس لیے پکاتی تھی کیونکہ ابا دوپہر کا کھانا شروع سے ہی نہیں کھاتے تھے' حبیب بھائی آفس ہوتے تھے، اس لیے زیادہ تردد نہ ہوتا۔ آج کل اگرچہ نصیب آیا ہوا تھا لیکن وہ چھٹیاں بھرپور طریقے سے انجوائے کرتے ہوئے صبح دیر تک سویا رہتا' بھاری ناشتے کے بعد وہ بھی لنچ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ رات کو چونکہ تمام افراد اکٹھے ہوتے' اس لیے نرمین باجی خاصا اہتمام کرتیں۔ سب ہی کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے مینیو تیار ہوتا اور خوش نما مان گئی تھی کہ بے شک ان کے ہاتھ میں بھی بے حد لذت تھی اور یہ اعتراف تو باجی برملا کرتیں کہ ان کو کھانا پکانا ان کی ساس نے سکھایا ہے۔

"بات صرف اتنی ہے کہ ان لوگوں کو دل بڑھانا آتا ہے' تعریف کرنے کے معاملے میں سارے ہی فراخ دل ہیں....سوائے۔" اس نے یہ نتیجہ نکالا اور دزدیدہ نگاہوں سے سامنے بیٹھے نصیب کو دیکھا اس نے چونکہ گھنٹہ بھر پہلے ناشتہ ڈٹ کے کیا تھا اس لیے اس وقت صرف وہ کباب ڈال کے بیٹھا تھا۔

"واہ......" اس کے منہ سے بھی تعریفی کلمات ادا ہوئے تو وہ چونک گئی۔

"زبردست.......یار! کیا مزا ہے ایمان سے....کس نے بنایا ہے یہ؟"

"کیا.....؟ یہ کباب؟" باجی نے پوچھا۔

"نہیں.....یہ اچار...."

"بازار کا ہے۔" باجی کے بجائے اس نے نارمل سے لہجے میں کہا۔ خلاف معمول اب اسے اس کی دل شکنی زیادہ محسوس نہیں ہوئی شاید باقی سب نے اتنی حوصلہ افزائی کی تھی کہ اب مزید ایک لفظ بھی توصیف کا سننے کی تشنگی نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اسے دیکھنا چاہا۔ چٹخارے لے لے کر چٹوری عورتوں کی طرح آم کی پھانک چوستا ہوا وہ سر ہلا رہا تھا۔ خوش نما کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ جانے سے پہلے رباب اسے مزید ہدایت دے گئی۔

"بھابی! پرسوں آپ کو جو ڈریس پہن کے آنا ہے' وہ میں نکال دیتی ہوں اور اس کے ساتھ کی میچنگ سینڈل اور جیولری کے بارے میں بھی بتا دیتی ہوں۔ بڑی بھابی آپ کو پارلر لے جائیں گی۔ چپ چاپ اچھی بچیوں کی طرح تیار ہو جایئے گا۔"

''گھر ہی کی تو بات ہے' چلو تمہاری پسند کا ڈریس میں پہن لوں گی لیکن یہ پارلر سے تیار ہونا کیا بہت ضروری ہے؟''

''بھابی! آپ نہیں جانتیں' پرسوں کا ڈنر بڑا اسپشل ہوگا۔ میرے تایا زاد بھائی کی بھی آپ کے ساتھ ہی شادی ہوئی ہے' ان کو بھی انوائٹ کیا ہے میرا سارا ددھیال ہوگا۔ سب ہی دونوں دلہنوں میں مقابلہ کریں گے اور میں چاہتی ہوں، میری فیورٹ بھابھی ہی پرسوں کی پارٹی کی جان ہو۔''

''نن...... نہیں...... تم تو مجھے نروس کررہی ہو رباب؟'' وہ سچ مچ گھبرا گئی۔ ہمیشہ سے اس قسم کی مقابلہ بازی سے اس کی جان جاتی تھی بلکہ وہ تو سرے سے کسی ایسی جگہ جانا ہی پسند نہیں کرتی تھی جہاں کوئی اس کا نوٹس لے' تنقیدی نظروں سے دیکھے اور یہ رباب اسے کمپٹیشن کے لیے تیار کررہی ہے۔

''عجیب بچکانہ سا خیال ہے۔ دیکھو ناں' اچھا نہیں لگتا یوں بڑھ چڑھ کے..... میرا مطلب ہے..... کہ.....'' وہ وضاحت نہ کرسکی۔ دراصل وہ رباب پہ ظاہر نہ کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ اس کے کزن کی بیوی کے مقابل آنے سے خوف زدہ ہے۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی اور باجی کو بھی یہی تاکید کرکے چلی گئی اور خوش نما جانتی تھی کہ اگر وہ گریز کرے بھی تو زمین باجی نے نہیں بخشنا تھا۔

''نجانے کیسی ہوگی رباب کی دوسری بھابی۔ سنا ہے کراچی سے آئی ہے۔ پھر تو ضرور ماڈرن سی ہوگی' باجی بتارہی تھیں' رباب کے یہ کزن نیوی میں ہیں' ظاہر ہے کوئی ایسی ویسی بیوی تو پسند نہیں کی ہوگی' کسی اونچے گھرانے کی الٹرا ماڈ حسین نازک سی لڑکی ہوگی۔ آنٹی نور جہاں کو دونوں فیملیز کو اکٹھے انوائٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

لیکن یہ تو اس کی سوچ تھی' آنٹی نے اس کے مشورے سے تو یہ گیدرنگ نہیں رکھی تھی۔

* * *

ناچار اسے وہی کرنا پڑا جو باجی نے کہا۔ نصیب صبح سے غائب تھا۔ جاتے جاتے اسے تاکید کرگیا تھا۔

''کبا میرا گرے سوٹ ڈرائی کلین سے لے کر آتا ہی ہوگا۔ سامنے ہی رکھ دینا، بلیک ڈریس شوز، میرون سلور لائننگ والی ٹائی بھی نکال دینا۔ تم لوگ اپنے ٹائم پہ جانا۔ مجھے اگر کچھ دیر بھی ہوگئی تو میں خود ہی تیار ہوکے آجاؤں گا۔''

''آپ کو گرے، بلیک اور سلور کلر بہت پسند ہے؟'' بے ساختگی میں وہ سوال کر بیٹھی۔ جواباً اس نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔

''یہ رنگ مجھے اتنے پسند تو نہیں، البتہ میری مجبوری ضرور ہیں، سیاہ رنگ مجھ پہ اٹھتا زیادہ ہے۔''

''اللہ رے خوش فہمی۔'' اس نے جل کر سوچا پھر آئینے میں اس کی شبیہہ دیکھ کر سوچا (کہتے تو ٹھیک ہی ہیں...... لیکن آخر یہ اپنے منہ سے آپ اپنی تعریف اتنی آسانی سے کیسے کرلیتے ہیں)

رباب کا نکالا لائٹ پرپل نیٹ کا اسٹائلش سوٹ دیکھ کر وہ گڑبڑا گئی۔ بالکل جدید اسٹائل کی مختصر سی چست قمیص تھی اور تنگ پائنچوں والا ٹراؤزر، البتہ ساڑھے تین گز کے گھیردار دوپٹے نے مشرقیت کی تھوڑی بہت لاج رکھی تھی۔ بری کے بہت سے سوٹ اس نے اب تک کھول کر بھی نہ دیکھے تھے، ویسے بھی ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے، بمشکل دو ہفتے۔ اس لیے اسے پتا نہ تھا کہ رباب کا منتخب کردہ سوٹ کھولنے کے بعد اس قسم کا نکلے گا۔

اس نے ہمیشہ سے ایک مخصوص طرز کا شلوار قمیض پہنا تھا۔ بدلتے فیشن اس پہ اثر انداز نہ ہوتے تھے نہ کبھی آستینیں کٹیں، نہ قمیص کی لمبائی کم یا زیادہ ہوئی، نہ پائنچے کھلے یا تنگ کیے۔ ڈرتے جھجکتے اس نے یہ ڈریس پہن ہی لیا۔

''اف میری لمبی لمبی ٹانگیں کتنی بے ڈھنگی لگ رہی ہیں چھوٹی قمیص کے ساتھ۔ کتنی فضول سی لگ رہی ہوں گی، بالکل زرافہ......''

بچپن میں ہی اچانک اس کا قد تاڑ سا لمبا ہونا شروع ہوگیا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ خود سے چار سال بڑی شمائلہ سے اونچی لگنے لگی۔ قد بڑھنے سے دبلا پن بھی نمایاں ہوگیا۔ سینک سلائی منحنی بازو، چوہیا سی گردن اور بانس جیسی ٹانگیں ...... یہ خصوصیات اس کے کزن گنوایا کرتے۔ اپنے لمبے قد سے اس حد تک خائف ہوئی کہ گھبرا کر جھک کر چلنا شروع کردیا۔ الٹا اور مذاق بنا۔

''دیکھو اس عالم چنی کو، اب تو کبُ بھی نکل آیا ہے۔''

''اب تو بالکل اونٹنی ہی لگ رہی ہے۔ کوہان بھی بنا ہوا ہے۔''

بڑی مشکل سے اماں نے اس کے کندھے جھکا کر، کمر نکال کر چلنے کی عادت چھڑائی۔ اس وقت خود کو اس لباس میں دیکھ کر اسے پھر سے ''اونٹنی، اونٹنی'' کی

آوازیں آنے لگیں۔

باجی نے اس کا میک اپ بھی ڈریس اور پارٹی کے حساب سے کروایا، بال تو قدرتی گھنگھریالے تھے، بیوٹیشن کو سیٹ کرنے میں محنت نہ کرنی پڑی۔

آنٹی کے گھر جا کر اسکے قدم ایک بار پھر لڑکھڑا گئے۔ وہاں تو اچھے خاصے لوگ جمع تھے۔ بالکل شادی والا گھر ہی لگ رہا تھا۔

جب رباب نے اس کا تعارف اپنے کزن کی دلہن سے کرایا تو وہ حیران رہ گئی۔ اتفاق سے اس نے بھی وہی سوٹ پہن رکھا تھا صرف رنگ کا فرق تھا۔ باقی ڈیزائننگ وغیرہ تک وہی تھی، لیکن اس کی حیرانی کی وجہ صرف یہ نہیں تھی بلکہ ان محترمہ، سحرش کی شخصیت تھی۔

”اچھے خاصے فربہ وجود اور ٹھگنے سے قد کے ساتھ انہوں نے یہ فٹنگ والا ڈریس پہن رکھا تھا۔ شکل وصورت بری نہیں تھی بلکہ آنکھیں تو بہت ہی خوبصورت تھیں، ابھرے ہوئے پپوٹوں کے ساتھ گہری بھوری، بڑی بڑی اور مسکراتی ہوئی مسکراہٹ تو آنکھوں کے ساتھ ساتھ لبوں پہ بھی کھلی ہوئی تھی، ایک قطار میں سجے موتیوں کے سے ہموار دانت بھی بھلے لگ رہے تھے، کمر سے نیچے آتے گھنے، سلکی براؤن بالوں کی آبشار تو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”بس سحرش رنگ اور جسم کی وجہ سے مار کھا گئی تھی۔ خوشنما کی رنگت اس کے ساتھ کھڑے ہوئے نکھرنے لگی تھی۔ اس کا رنگ تو اچھا خاصا پکا سا نولا تھا۔ تھوڑی سے لٹکا گوشت، تھل تھل کرتے بازو اور کمر سے نمایاں ہوتی اضافی چربی اس کی ساری خوبصورتی کو مات دے رہی تھی، لیکن شاید اسے اس بات کا ذرا احساس نہ تھا۔ اس نے بڑی شان سے گہرے جامنی رنگ کا یہ چست لباس پہن رکھا تھا، ہم رنگ شیڈ کی لپ اسٹک اور آئی شیڈ اس کے سانولے چہرے پہ عجیب سا لگ رہا تھا۔

گردن برائے نام تھی۔ اس پہ اس نے سونے کا ملتانی بھاری سیٹ پھنسا رکھا تھا۔ اپنی ہیئت کذائی سے بے پرواہ وہ سارے میں ادھر ادھر بے تکلفی سے چٹکلے چھوڑتی پھر رہی تھی۔ خاصی ہنسوڑ طبیعت تھی شاید اس کی۔ سب ہی اس کے اخلاق اور شگفتہ مزاجی سے متاثر نظر آ رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ خوش نما کی سلجھی ہوئی طبیعت اور باوقار شخصیت کا بھی چرچا ہو رہا تھا۔ رباب کے ددھیال کی کتنی ہی لڑکیوں نے کھلے دل سے اس کے فگر اور قد کی تعریف کی۔ وہ جھینپ کر رہ گئی۔

پارٹی کے دوران مسلسل وہ سحرش کو ہی دیکھتی رہی۔ اس کے بے پناہ اعتماد کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔ اور یہ انکشاف تو اسے ششدر ہی کر گیا کہ یہ دونوں کی لومیرج ہے۔

ڈنر کے بعد جب سحرش اور خوش نما کو گفتگو کرنے کا موقع ملا تو سحرش اپنی عادت کے مطابق جلد ہی بے تکلف ہوگئی۔

”فرید میرے بہنوئی کے دوست ہیں، ایک پارٹی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے تو خیر ہمیشہ سے ہی نیوی بہت پسند رہی ہے۔ فرید کو بھی میرا کانفیڈنس اور میرا گفتگو کا انداز بہت پسند آیا۔ ہسٹری سے انہیں بھی دلچسپی تھی اور مجھے بھی۔ میری معلومات سے تو وہ ایک دم متاثر ہوگئے۔“

اس نے مزے سے بتایا اور وہ حیران سوچتی رہی...... ”بھلا معلومات سے متاثر ہو کر شادی بھی کوئی کرتا ہے؟ کیا کسی کے بات کرنے کے انداز سے بھی محبت ہوسکتی ہے؟“

جو بھی تھا سحرش سے ملاقات اور اس پارٹی میں شرکت کرنا، دونوں ہی اس میں ایک مثبت تبدیلی لانے کا باعث بنے۔ سحرش سے اس نے یہ جانا کہ کسی بھی انسان میں محض کمیاں ہی نہیں ہوتیں، قدرت ہر کسی کو کوئی نہ کوئی تحفہ تو دے ہی دیتی ہے، سحرش کا بدن بھاری تھا تو کیا ہوا دل تو بڑا نرم و ملائم سا تھا، قد چھوٹا تھا تو کیا ہوا ذہانت کا گراف اچھے اچھوں سے بلند تھا، ہونٹ گلابی نہیں تھے، لیکن دانت موتیوں کے سے شفاف تھے۔ آواز سریلی نہیں تھی لیکن باتیں دل موہ لینے والی تھیں۔ رنگ سانولا تھا لیکن آنکھوں میں قدرت نے شہد گھول رکھا تھا۔

فنکشن میں موجود تقریباً سب ہی افراد کا اسے پسندیدگی سے دیکھنا خود اس کا اعتماد بڑھانے میں بھی مددگار ثابت ہوا۔ اپنا لمبا قد جس سے وہ سدا شرمندگی کا شکار ہی رہی، پہلی بار اچھا لگا جب سب نے ہی کہا۔

”خوش نما! یہ لباس تو بنا ہی تمہارے لیے ہے۔“

اپنی کم گوئی کے باعث وہ ہمیشہ جھینپی...... ہی رہتی، اس کا خیال تھا کہ اسے زیادہ اچھے طریقے سے بات کرنا نہیں آتی، اس لیے محفل میں زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتی۔ آج اس کی اس ادا کو بھی قبول کرلیا گیا، باوقار اور سلجھی ہوئی شخصیت کا نام دے کر۔

* * *

آج انجمن خوب سج دھج کے آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو لڈو بھی تھے۔ خوش نما کو یاد آیا، کل اس کے سسرال والوں نے تاریخ رکھنے آنا تھا یقیناً شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہو گی۔ جب ہی اس کے دانت اندر نہیں جا رہے تھے۔

"آپ کو بھی مبارکاں بھابھی جی، بس آپ کی دعائیں ہیں۔" اس کے مبارک باد دینے پہ وہ بڑی مدبری بن کے سر جھکاتے ہوئے بولی۔ رباب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ کل سے یہاں رہنے آئی ہوئی تھی جب سے اس گھر میں خوشنما کا اضافہ ہوا تھا اس کا دل یہاں خوب لگتا۔

"ویسے انجمن! تمہارا منگیتر کرتا کیا ہے؟" رباب نے پوچھا۔

"جی اپنا کاروبار ہے اس کا۔ آج کل شادیوں کا سیزن ہے ناں جی تو اس کا دھندا خوب زوروں پہ ہے۔"

"کیوں کیا وہ ڈھولک کرائے پہ چڑھاتا ہے؟" نصیب نے کمرے سے نکل کر گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہائے ہائے کیوں جی...... خیری صلا......" وہ بگڑ گئی۔ "تو پھر بینڈ باجے والوں کے گروپ میں ہوگا۔"

"نہ جی۔ میرا چھیما کوئی میراثی ہے۔ وہ تو جی شادیوں پہ کھانے پکاتا ہے۔" انجمن نے فخر سے بتایا۔

"اچھا اچھا نائی ہے۔"

"ایویں ای؟ اتنا کاروبار ہے، اتنے بندے ملازم ہیں، وہ کوئی آپ دیگ پکاتا ہے؟ بس دیگوں کے پاس منجی (چارپائی) ڈال کے مسالے نوکروں کو پیس پیس کر دیتا ہے۔" اس نے اپنے منگیتر کا "گریڈ" واضح کیا۔

"یوں کہو ناں کہ "ہیڈ باورچی" ہے۔ اچھا چلو چھوڑو اس ذکر کو۔ ایک بات تو بتاؤ۔" وہ صلح جو انداز میں دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

"من دو من! آج تم نے اتنا لشکتا لشکاتا لال جوڑا پہن رکھا ہے، چہرے اور گردن پہ پاؤڈر بھی تھپا ہے، کلائیوں میں چوڑیاں بھی پھنسا رکھی ہیں، نینوں میں کاجل بھی بہہ رہا ہے، بالوں میں تیل کی شیشی بھی انڈیل رکھی ہے، ناک میں لونگ، کان میں بندے بھی پہن رکھے ہیں، کمر پہ شیشوں والا پراندہ بھی لہرا رہا ہے...... پھر بھی...... پھر بھی تم خوبصورت کیوں نہیں لگ رہیں۔" اتنی لمبی چوڑی تمہید کے بعد سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

سوال سن کر شرم سے لچکتی دوہری ہوتی انجمن بھڑک اٹھی۔

"آپ بھی ناں پائی جان...... بڑی زیادتی کرتے ہو...... اپنا رنگ کیا چٹا ہے، ہر ویلے دوسروں کو باتیں ہی سناتے رہتے ہو۔ رنگ کا کیا ہے، وہ تو رنگیلے کا بھی چٹا ہی ہے۔ آپ کے ذرا بال جھڑ جائیں، موٹے ہو جاؤ تو رنگیلے ہی لگو گے۔"

بڑی جرأت کے ساتھ کہتی وہ کچن میں چلی گئی۔ رباب اور خوش نما اپنی ہنسی پہ کنٹرول نہ کر سکیں اور نصیب شرمندہ سا باہر دروازہ کھولنے چلا گیا۔ مسلسل بیل ہو رہی تھی۔

"خشک نما! نجانے کس نے آپ کو محترمہ لکھتے ہوئے یہ رجسٹری بھیجی ہے۔ پکڑیے۔" اس کی گود میں خاکی لفافہ پھینکتے ہوئے وہ صوفے پہ نیم دراز ہو گیا۔ نانو بھی اسی وقت لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ خوشنما حیرت زدہ تھی اسے کون رجسٹری بھیج سکتا ہے۔ اس کا دھیان تاجور آنٹی کی طرف گیا، لیکن وہ تو خط ہی بھیج سکتی تھیں، جب کہ اس الفافے کا تو اچھا خاصا وزن تھا۔ تجسس سے بے قرار ہو کر اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لفافہ کھول لیا ایک معیاری ماہنامے کا پرچہ پھسل کر گود میں آ گرا۔

رباب، رسائل کی شیدائی تھی، اس سے پہلے اس نے اچک کر رسالہ کھول لیا، اندر مختصر سے خط میں اطلاع دی گئی تھی کہ محترمہ خوش نما صاحبہ کی نظم نہ صرف قابل اشاعت ہے بلکہ ایڈیٹر صاحب نے بے حد پسند کی تھی اور اس سے مزید قلمی تعاون جاری رکھنے پہ اصرار بھی کیا تھا۔ رباب جلدی جلدی صفحے پلٹنے لگی جب کہ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"ٹھیک ہے، کبھی کبھار میں تک بندی کر لیتی ہوں، لیکن کس کو خبر ہوئی جس نے یہ مذاق کیا۔" جسے وہ مذاق سمجھ رہی تھی، وہ سچ ثابت ہوا۔ رباب اس کی نظم با آواز بلند سب کو پڑھ کے سنا رہی تھی۔

وہ مجھے
اپنے دل میں بسا لے تو
میں اس کی ہر دھڑکن پہ
اپنے لب رکھ دوں
وہ مجھے
آنکھوں میں چھپا لے تو
میں اسکی پلک پلک پہ

ستارے بھردوں
لیکن وہ تو مجھے
اپنی مٹھی میں رکھتا ہے
جہاں میں
سانس بھی اس سے مانگ کے لیتی ہوں

خوش نما کا سر جھک گیا۔ دل کے کسی گہرے کونے میں چھپے ان جذبات کا سرعام اشتہار لگوانا تو اس نے ہیں چاہا تھا۔ اس نے مشکوک نظروں سے رباب کو دیکھا، کہیں اس کی شرارت تو نہیں لیکن اس کے چہرے پہ چھائی معصومیت نے زیادہ شک نہ کرنے دیا...... ''تو پھر کیا باجی......؟'' اس سے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہ سکی۔ باجی، نانو اور تو اور ابا جی تک اس کی نظم کی تعریفیں کرنے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔

''اب ہمارے گھر میں ایک اہلِ قلم کا اضافہ ہوگیا ہے۔'' نانو نے کہا۔

''ہاں بھئی، یہ تو واقعی فخر کی بات ہے کہ ہماری بہو کا شمار اب ادیبوں، شاعروں میں ہوگا۔ آخر اتنے معیاری ماہنامے میں بڑے بڑے نامی گرامی شعرا کے کلام کے ساتھ اس کی نظم شائع ہوئی ہے۔'' ابا جی کا جوش بھی قابلِ دید تھا۔ اس نے نصیب کا ردعمل جانچنے کے لیے چپکے سے اس طرف دیکھا وہ اسنوکر ٹورنامنٹ میں پوری طرح مگن تھا۔

''ہونہہ، جل گئے...... خود پسند اور احساس برتری کے شکار افراد کسی کی تعریف برداشت ہی نہیں کرسکتے۔ انہیں کہاں اچھا لگ رہا ہوگا کہ میری کسی صلاحیت کی یوں قدر ہو۔'' اس نے خود میں احساس برتری پیدا کرنے کی ناکام سی کوشش کی لیکن غرور و فخر سے سدا کے الرجک دل نے آئینہ دکھا دیا۔

''اتنا اترانے کی ضرورت نہیں۔ اسے یہ پتا چل گیا کہ یہ نظم تم نے کس کے لیے لکھی ہے تو پھر......؟'' وہ جھنجلا کر رہ گئی۔

''مجھ سے اچھی تو انجمن ہے، کم از کم منہ پہ بات تو جرأت سے کرجاتی ہے، میں تو دل ہی دل میں بھی کچھ کہنا چاہوں تو بات نہیں بنتی۔''

''بھابھی! آپ صرف شاعری کرتی ہیں یا افسانے بھی لکھتی ہیں؟''

''دوپہر کو وہ کپڑے استری کررہی تھی جب رباب نے پوچھا۔ اب وہ اسے کیسے سمجھاتی کہ وہ تو یہ تک نہیں جانتی تھی کہ تنہائی میں ڈائری میں کبھی کبھار وہ جو چند الفاظ

ترتیب دے لیتی تھی اسے کسی انجان کی شرارت کے باعث تسلیم کرلیا جائے گا۔

''نہیں کبھی کوشش نہیں کی لکھنے کی، ویسے افسانے پڑھنا پسند ہیں۔''

''مجھے بھی۔ لیکن ممی بہت ناراض ہوتی ہیں میری اس عادت سے۔ کہتی ہیں لڑکیاں آئیڈیلسٹ ہوجاتی ہیں افسانے پڑھ پڑھ کے۔ کیا واقعی؟''

''ہوسکتا ہے، شاید نہیں۔'' وہ کیا جواب دیتی، اس نے کبھی اس بات پہ غور ہی نہیں کیا تھا۔

''ویسے اگر آپ نے کوئی آئیڈیل بنا بھی رکھا ہوگا تو وہ نصیب بھائی کی صورت آپ کو مل ہی چکا ہے، ہے ناں بھابھی۔'' خوش نما جانتی تھی برابر کے کمرے میں نصیب کمپیوٹر پہ کچھ کام رہا ہے۔ اس لیے اسے سنانے کو ذرا بلند آواز میں بولی۔

''کیسا آئیڈیل رباب! وہ جو افسانوی ہیروئنز کے تصور پہ چھایا ہوتا ہے وہ والا؟ مجھے تو آج تک ان کے آئیڈیل ہیروز کے خاکے ہی سمجھ میں نہیں آسکے۔ گھنے گھنگھریالے بھورے بال، چوڑی پیشانی، بھوری کانچ سی آنکھیں، سرخ و سفید رنگت، گھنی مونچھوں کے تلے مسکراتے گلابی بھرے بھرے ہونٹ...... ذرا ان سب کو تصویری خاکہ دے کر دیکھو۔ ایوب کھوسو کی تصویر بنتی ہے۔''

رباب کا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا۔ خود خوش نما اپنی جرأت پہ حیران تھی نہ اس کی زبان لڑکھڑائی نہ لفظ آگے پیچھے ہوئے۔ بڑی صفائی کے ساتھ وہ درپردہ نصیب کے گورے رنگ اور خدوخال پہ وار کرگئی تھی۔ اس کامیابی نے اسے اور دلیر کیا۔

''اور ابھی تمہارے سامنے انجمن کہہ رہی تھی کہ گورا رنگ تو رنگیلا کا بھی ہے، اسی سے اندازہ کرلو کہ مردوں کے اوپر یہ تشبیہات اور حسن کے استعارے کتنے بے ڈھب معلوم ہوتے ہیں۔ (دوسرے کمرے میں موجود نصیب یقیناً تلملا رہے ہوں گے) اس نے مسرور ہوکر سوچا۔

''کیا بحث چل رہی ہے بھئی۔'' نرمین باجی اندر آئیں۔ ''خوشی! تم سے ایک کام تھا۔ دو تین دن ذرا ٹائم نکال کر جگنو اور بلبل کو پڑھا دینا، ان کی ٹیوٹر ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔''

''میں......؟ میں باجی؟'' وہ گھبرا گئی۔ جگنو اور بلبل دونوں بیکن ہاؤس میں پڑھتے تھے اور وہ ہمیشہ سے اردو میڈیم میں رہی، اسکول سے کالج تک۔

''لیکن باجی! وہ تو...... ان کا کورس تو بہت مشکل ہے۔ اتنی موٹی موٹی کتابیں۔''

''اوکم آن خوشی! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ جگنو تھرڈ میں ہے اور بلبل نرسری میں، ایسا کیا افلاطونی کورس ہے ان کا۔ اور تم نے ایم اے کس لیے کر رکھا ہے۔''

''لیکن میں نے ایم اے اسلامیات میں کیا ہے جب کہ جگنو کے سب سبجیکٹس انگلش میں ہیں۔ میری انگلش بیکن ہاؤس کے لیول کی نہیں ہے۔ میں پڑھا نہیں پاؤں گی۔'' اس نے معذرت کرنا چاہی لیکن نرمین باجی نے ایک نہ سنی۔

''تم اردو میڈیم میں پڑھی ہو مگر کالج تک انگلش سبجیکٹس پڑھ تو رکھا ہے ناں۔ ایسی بات بھی نہیں کہ پرائمری لیول تک کی انگلش نہ سمجھ سکو۔ نخرے مت کرو۔'' یہ طعنہ کاری ثابت ہوا۔ اپنے انکار کو نخرا سمجھنا اسے پسند نہ آیا اور وہ فوراً پڑھانے پہ تیار ہو گئی۔

* * *

''دیکھا، تم خوامخواہ جھجک رہی تھیں۔ جگنو تو اتنا خوش ہے تم سے پڑھنے کے بعد کہ کہنے لگا ٹیوٹر سے زیادہ اچھی طرح چچی بات سمجھاتی ہیں، اس کا آج کا پیپر بھی بہت اچھا ہوا ہے۔''

''ہاں واقعی...... دراصل کانونٹ اسکول کے نام کا رعب ہی اتنا ہوتا ہے کہ میں کترا رہی تھی، لیکن اب پتا چلا، میری انگلش اتنی بری بھی نہیں، پرائمری لیول تک تو میں اچھی طرح پڑھا سکتی ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو انگلش جگنو تھرڈ اسٹینڈرڈ میں پڑھ رہا ہے۔ وہ میں نے انٹر میں پڑھی تھی۔ اب تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ آپ بے شک روز انہیں بھیج دیا کیجیے۔''

روز پڑھانے کی آفر اس نے یہ سوچ کر کی کہ نصیب تو شاید ایک آدھ روز میں جانے والا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ ذہنی طور پر زیادہ تر و تازہ ہو کر بچوں کو پڑھا سکے گی۔ اس کی موجودگی ہر وقت خوش نما کے اعصاب پہ سوار رہتی۔

ویسے وہ نوٹ کر رہی تھی، دو تین دن سے وہ کم ہی اس کے مذاق اور طنز کی زد میں آ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اب خوش نما نے ہی اس کی پھبتیوں کو خاطر میں لانا کم کر دیا تھا۔ اب پہلے کی طرح اس کے کسی دل جلے ریمارکس پہ وہ گھنٹوں کڑھتی نہیں رہتی تھی نہ ہی خود ترسی کا شکار ہو کے کمرہ بند کر کے رویا کرتی۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ اس کی باتوں کو خاطر میں لائے بغیر ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا کرے۔

اب گھر کے دوسرے افراد کے سامنے اسے اپنی سبکی کا احساس ہلکا نہیں کرتا تھا

کیونکہ سب کے خلوص اور اعتماد نے اس کو اتنا بھاری بھرکم کر دیا تھا کہ فقط اس ایک شخص کی بے اعتنائی اور ناپسندیدگی اسے ڈانواڈول نہیں کرتی تھی۔ اس کی شخصیت میں یہ تبدیلی اس ایک مہینے کے اندر اندر ہوئی تھی۔ اس ایک مہینے میں اس نے شدت سے نصیب کی چھٹی ختم ہونے کا انتظار کیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس گھر میں اور اس گھر کے مکینوں کے دل میں اس کے لیے خوب جگہ ہے۔ وہ ساری عمر سکون کے ساتھ اس گھر کی چار دیواری میں گزار سکتی ہے، یہاں تحفظ بھی ہے، اعتماد بھی، محبت بھی اور خلوص بھی جب کہ نصیب ......

اس نے سن رکھا تھا کہ ''دلہن وہی جو پیا من بھائے'' اور کبھی کبھی وہ شدت سے محسوس بھی کرتی تھی کہ ان چاہی سہاگن ہونے کا کرب کیا ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس اسے خدا کے حضور سربسجود ہونے پہ مجبور کر دیتا کہ شوہر کے نہ سہی، سسرال والوں کے دل میں تو جگہ بنا لی ہے اس نے اور اگر کل کلاں کو نصیب اپنی گرہستی نئے سرے سے کسی پسندیدہ ہستی کے ساتھ بنانا چاہے تب بھی دربدری اس کا مقدر نہیں ہو گی۔

اس گھر کے اندر اس کے قدم مضبوطی سے جمے تھے۔ اسے نصیب کے واپس اسلام آباد جانے کا انتظار تھا۔ پرسوں ہی نانو نے ذکر کیا کہ نصیب کی ایک ماہ کی چھٹی ختم ہونے والی ہے تو اسے اپنے سر سے ایک بھاری بوجھ سرکتا محسوس ہوا لیکن وہ سٹپٹا کے رہ گئی۔ جب یہ بوجھ سر سے گزر کر دل پہ آن ٹھہرا۔

''وہ واقعی چلے جائیں گے......؟''

اس اداس سے سوال کے جواب میں اس کے پاس صرف سناٹے تھے۔ وہ خوش ہونا چاہتی تھی۔ ہو نہیں پاتی تھی۔

''لو اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو گی کہ انہیں تم پڑھا دیا کرو......'' باجی کی آواز اسے خیالات سے کھینچ لائی۔ ''لیکن اب تمہیں بھی تو پرسوں اسلام آباد چلے جانا ہے۔ تمہاری وجہ سے میں تو بالکل ہی ناکارہ ہو کے رہ گئی ہوں۔ اتنے کم دنوں میں تم نے میری عادتیں ہی خراب کر ڈالیں۔ اب تمہارے جانے کے بعد مجھے پتا چلے گا۔ جب سارے گھر کی ذمہ داری ایک بار پھر میرے کاندھوں پہ آ جائے گی۔''

نرمین باجی نے تو اسکے ہوش ہی اڑا دیئے۔ وہ اڑی اڑی رنگت کے ساتھ نصیب کو دیکھنے لگی کہ شاید وہ تردید کرے اور کچھ نہیں تو جھلا کر اتنا ہی کہہ دے۔

''میرا کیا دماغ خراب ہے جو اسے ساتھ لے کر جاؤں، اس سوغات کو آپ ہی

سنبھالیے جو اتنے چاؤ سے بیاہ کر لائی ہیں۔'' وہ امید بھری نظروں سے یہ دل شکن جملہ اسکے لبوں سے ادا ہونے کے انتظار میں اسے تکنے لگی جو آج اس کے لیے حیات بخش ثابت ہوسکتا تھا، لیکن اس نے کہا تو یہ۔

''اسی لیے تو لے جا رہا ہوں۔ آپ نے میری بیوی کو باورچن اور دھوبن بنا کے رکھ دیا۔ ایک تو بے چاری پہلے ہی اللہ کی طرف سے تول کر پاؤ بھر گوشت لائی تھی۔ آپ نے اور نانو نے ایک مہینے کے اندر اندر بالکل ہی ڈھانچہ کردی۔ اب دیکھنا میرے سارے دوست احباب کیا کیا تبصرہ کریں گے...... دلہن کیا ہڑپہ سے کھود کر نکالی ہے......؟ ذرا خود کو ایک نظر دیکھیں، لیٹ لیٹ کر بے تحاشہ اور اندھا دھند ''حسین'' ہوگئی ہیں۔''

''چلو چلو......'' زرمین باجی کو اس کا اپنی صحت پہ تبصرہ پسند نہ آیا۔'' موٹی کب ہوئی ہوں میں۔ ہاں پہلے کی نسبت اب جسم ذرا بھر گیا ہے۔''

''جی ہاں...... لبالب......'' اس کے فی البدیہہ جواب پہ تپ کر باجی واک آؤٹ کر گئیں۔ وہ اب تک بت بنی بیٹھی تھی۔ نصیب نے اٹھ کر اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجائی۔

''خشک نما......''

''جی......'' مری مری سی آواز میں وہ بولی۔

''صرف کل کا دن ہے تیاری کے لیے، پیکنگ شروع کردو۔''

''کیا...... میں...... مم...... میں...... واقعی آپ کے ساتھ جا رہی ہوں؟'' اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ جو شخص اسے ایک نظر دیکھنا گوارا نہ کرتا ہو وہ بغیر کسی دباؤ کے اسے اپنے ساتھ کیسے لے جا رہا ہے (یقیناً یہ مذاق کر رہے ہوں گے)

''تو اور کیا کروں۔ بیوی تم میری ہو، مجھے سزا ملنی چاہئے، تمہیں بھگتنے کی۔ میرے گھر والوں کا کیا قصور کہ تمہیں ان کے سینے پہ مونگ دلنے چھوڑ جاؤں۔'' کڑوے انداز میں کہتا وہ الماری سے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پہ ڈھیر کرنے لگا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن کہہ نہ سکی، پھر سے ہمت کمزور پڑنے لگی، الفاظ اندر ہی رستہ کھونے لگے اور زبان گنگ ہوگئی۔

''نصیب! آپ خود پسند ہی نہیں، اذیت پسند بھی ہیں۔'' اس کی چوڑی پشت شکایتی نظروں سے دیکھتی وہ دل کے پھپھولے دل میں ہی پھوڑنے لگی۔

میں جانتی ہوں آپ کے معیار پہ پورا اترنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں......

کہ آپ کا تو معیار بھی بڑا اونچا ہے۔ حسن کے نجانے کس کس شاہکار میں آپ سو سو نقص نکال دیتے ہیں، جب کہ میں تو حسن کی کسی تشریح پہ پوری نہیں اترتی۔ مجھے یہیں رہنے دیجئے پلیز......'' وہ بند لبوں سے التجا کرنے لگی۔

اس کی خاموش فریادیں خاموش ہی رہیں۔ ہوا وہی جو وہ چاہتا تھا کسی اور نے بھی اسے خوش نما کو ادھر چھوڑنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ دن تک اس کے آنسو نہیں تھمے۔ سب سے ملتے وقت وہ یوں تڑپ تڑپ کے روئی جیسے اس کی رخصتی سات سمندر پار ہو رہی ہو۔

''خود کو سنبھالو خوشی! کیا ہوگیا ہے بیٹا...... یہ تو اسلام آباد ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر۔ ہر مہینے آ جایا کرو...... بلکہ ہر ہفتے......'' نانو نے تسلی دی۔

''ہاں نصیب! آئندہ تمہارا ہر ویک اینڈ یہیں گزرے گا۔ اینڈ ڈیٹس فائنل......'' حسیب بھائی نے آرڈر دیا۔ ابا جی نے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ رباب اور وہ ایک دوسرے کے گلے لگ کے دیر تک روتی رہیں۔ باجی نجانے کیوں روتے میں بھی بار بار اسے دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھیں۔

''یہ تو الٹا کام ہوگیا۔ غمگین بھابھی آج دلشاد بیگم بنی ہوئی ہیں اور خشک نما نے دنیا سے خشکی مٹا ڈالنے کا عزم سر کرلیا ہے، آنسو بہا بہا کر۔ ہاں بھئی من دومن! تمہارے اسٹاک میں اس وقت کوئی گانا ہے جو اس سچویشن پہ فٹ بیٹھتا ہو۔''

جواباً انجمن نے بھاں بھاں کر کے رونا شروع کردیا۔

''ہیں...... ہیں...... میں نے گانا گانے کو کہا تھا، تم تو قوالی کرنے بیٹھ گئیں۔''

نصیب کی سنہری رنگت تمتما رہی تھی، نجانے کس احساس سے۔ راستے بھر وہ گنگناتا، سیٹی بجاتا رہا۔ وہ کمپنی کی طرف سے دی گئی گاڑی میں بائی روڈ اسلام آباد جا رہے تھے۔ ڈرائیور کے لحاظ سے شاید وہ اسے چھیڑنے سے گریز کر رہا تھا۔ لیکن کب تک......؟ خوش نما نے سوچا۔

''گھر جاتے ہی یہ پھر سے وہی بن جائیں گے۔'' اس نے گردن موڑے بغیر کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

سر سیٹ کی پشت سے لگائے وہ شاید سو گیا تھا۔

آج اس نے شیو بھی نہیں کی تھی، براؤن رواں روشنی کے عکس سے چہرے پہ پھیلے سونے کے ذرے کی طرح دمک رہا تھا۔ بلا کی معصومیت لیے وہ اسے ایک دم ہی اچھا

لگا۔

''کیا تھا جو اس خوبصورت چہرے کے پیچھے ایک حساس سا محبت کرنے والا دل بھی ہوتا۔''

اس نے پہلی بار واضح طور پر اس کی وجاہت کو تسلیم کیا۔ دراصل اس کا رویہ اتنا دل شکن ہوتا کہ خوش نما کا دھیان کم ہی اس کی شخصیت کے اچھے پہلوؤں کی طرف جاتا تھا۔

''وہاں تو پھر سارے اپنے تھے۔ یہاں اجنبی شہر میں بیگانے لوگوں کے سامنے بھی اگر انہوں نے میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا تو......؟'' اسے نئی فکر لاحق ہوئی۔

''اُف توبہ، کیا مصیبت ہے۔ میں تو یوں مری جا رہی ہوں جیسے مجھے مقتل گاہ لے جایا جا رہا ہو۔ کیا کریں گے یہ زیادہ سے زیادہ......'' اس نے بہادر بنتے ہوئے سوچا۔

''ہر شخص کا ایک معیار ہوتا ہے، اگر میں ان کے معیار کے مطابق نہیں تو مجھے حقیقت پسندی سے یہ تسلیم کر لینا چاہیے۔ بڑی میچورٹی کے ساتھ اس نے خود کو سمجھا لیا۔

''نانو میری کم گوئی، احساس ذمہ داری اور سگھڑاپے کی وجہ سے مجھے پسند کرتی ہیں۔ ابا جی کو میرا نماز پنجگانہ باقاعدگی سے ادا کرنا پسند آیا تھا۔ نرمین باجی کو یہ بات اچھی لگتی تھی کہ میں کام سے گھبراتی نہیں ہوں۔ رباب کی مجھ سے دوستی کی وجہ ایک جیسی دلچسپیاں تھیں...... اب اگر نصیب کو مجھ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تو ظاہر ہے کہ جو انہیں چاہیے وہ مجھ میں نہیں۔ ان کا معیار شاید صرف اور صرف حسن ہے جو مجھ میں نہیں۔ ان کا معیار شاید صرف اور صرف حسن ہے جو مجھ میں نہیں۔ کم از کم ان کے تصور کے مطابق تو نہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں۔ اس میں نہ میرا قصور ہے نہ ہی ان کا۔ ہاں ایک بیوی ہونے کے ناتے میں یہ آخری کوشش ضرور کروں گی کہ یا تو ان کے معیار کے قریب تر پہنچ جاؤں یا پھر ان کا معیار بھی بدل ڈالوں۔ کیا مجھے یہ آخری کوشش نہیں کرنی چاہیے؟ کیا مجھے اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے تھوڑا بہت بھی ہاتھ پاؤں نہیں مارنے چاہئیں؟ کیا میں اتنی ہی بے وقعت ہوں؟ کیا میری سوچ بھی اتنی ہی سطحی ہے کہ نین نقش اور رنگت کے کامپلیکس سے اوپر ابھر ہی نہ سکے۔ آخر مجھ میں کچھ تو ہے جو کچھ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ سراہتے ہیں اور... ان کچھ لوگوں میں نصیب کیوں نہیں شامل ہو سکتے۔''

اس نے اسلام آباد پہنچتے پہنچتے اپنی سوچ کو ایک واضح عزم کی صورت دے ہی ڈالی۔

* * *

''اسلام آباد شروع ہو گیا؟'' صاف شفاف، چوڑی سڑکیں اور بارعب سرکاری عمارتیں دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''اسلام آباد کیا کوئی ڈرامہ ہے جو شروع ہو گیا۔'' الٹا ہی جواب ملا۔

وہ صبح سات بجے کے قریب گھر سے نکلے تھے اور راستے میں صرف ایک جگہ آدھ گھنٹے کے لیے چائے پینے رکے تھے، اب دن کے دس بجے ان کی گاڑی اسلام آباد کی سب سے مصروف شاہراہ سے گزر رہی تھی۔ ایک پر رونق مارکیٹ کے درمیان اونچی سی براؤن بلڈنگ کے آگے گاڑی رکی۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔

دن کے اس وقت اگرچہ مارکیٹ میں خاص چہل پہل نہ تھی، لیکن گرد و پیش کا جائزہ لینے سے پتا چلتا تھا کہ یہ ایک مصروف ترین شاپنگ سینٹر ہوگا۔ بوتیکس، سپر اسٹورز، ریستوران اور آفسز کے بورڈ لگے تھے۔ اسی بلڈنگ کے اوپری فلورز پہ رہائشی فلیٹس تھے جن میں سے ایک کا لاک وہ کھول رہا تھا۔

''کیا آپ کا آفس یہاں سے قریب ہی ہے؟'' اس نے قیاس کیا۔

''نہیں، میرا آفس تو سیکٹر ایف کے قریب ہے۔'' اس علاقے کا سکون اور خوبصورتی قابل رشک سمجھے جاتے ہیں، لیکن میرا دل وہاں نہیں لگا۔ میں شروع میں ایک کولیگ کے ساتھ وہیں پہ بنگلہ شیئر کرتا تھا۔ ایک تو پہلے ہی فیملی سے کٹ کر دوسرے شہر میں رہنا اور پھر وہ اتنے سرد ماحول میں...... اس لیے یہ فلیٹ لے لیا، یہاں دن کے کسی بھی حصے میں سنسناتی نہیں ہوتی۔ ویسے اگر تمہیں یہ پسند نہ آیا تو جہاں تم کہو گی...... بنگلہ لے لیں گے۔'' بیڈ روم کے لاک کھولتے ہوئے اس نے اتنی اپنائیت سے کہا کہ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی اسے حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ اس کمرے کی کلر اسکیم، فرنیچر، پردے، کارپٹ حتیٰ کہ پینٹنگ تک وہی تھی جو جہلم والے گھر میں تھی۔ س کی حیرت بھانپ کر نصیب نے بتایا۔

''میں بہت ہوم سک ہو رہا تھا پہلے پہل، گھر والے تو آ نہیں سکتے تھے، میں گھر ہی ٹھا کے اس کمرے میں لے آیا۔'' وہ ہولے سے ہنسا اور خوش نما سوچ کر رہ گئی کہ کیا یہ نخص بھی ایسے جذباتی دور سے گزر سکتا ہے۔

''تم ناشتہ کرنا چاہو تو ڈرائیور سے منگا لو یا خود ہی کچن میں جا کر بنا لو۔ مجھے یاد نہیں

لیکن کچھ تھوڑا بہت تو سامان ہوگا ہی فریج میں۔ کل فرصت سے بیٹھ کے لسٹ بنا دینا ضروری چیزوں کی۔"

"لسٹ تو بنالوں گی، لیکن بہتر یہی ہوگا کہ میں خود ہی یہ شاپنگ کرلوں۔ یہاں کی مارکیٹس سے بھی واقفیت ہوجائے گی۔"

"اینی وے......" اس کا مصالحت آمیز دوستانہ سارویہ خوش نما کی سمجھ سے باہر تھا۔

"یہ بعد کے کام ہیں فی الحال تم رات کے فنکشن کا سوچو۔ میرے یہاں کے دوست شادی میں شرکت نہیں کرسکے تھے۔ انہوں نے ہمارے لیے بلکہ تمہارے لیے ویلکم پارٹی ارینج کی ہے۔ آج رات کو پی سی میں۔ تم کچھ ریسٹ کرلو پھر تیاری کرلینا۔"

"آج ہی تو ہم آئے ہیں اور آج ہی پارٹی۔" وہ پریشان ہوگئی۔ (نجانے کیسی پارٹی ہو، کیسے لوگ ہیں، میں تو خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں کرپائی، دوسری تیاری کیا کروں۔"

"اچھا پھر آپ ایسا کیجئے دو گھنٹے کے بعد ڈرائیور کو بھیج دیجئے گا، میں پارلر جاؤں گی۔ آپ جانتے ہیں مجھے میک اپ بالکل بھی نہیں آتا اور یہاں نہ رباب ہے نہ نرمین باجی۔"

"اوں...... ڈرائیور تو...... مجھے بہت ضروری کام ہے ورنہ میں ضرور......" وہ پیشانی مسلتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ "اچھا دیکھتے ہیں کوئی حل......" وہ کھڑا ہوگیا۔

"میں کام سے جارہا ہوں، کچھ پتا نہیں کب آؤں، البتہ ایک خاتون آئیں گی ربا نام کی۔ میرے دوست کی مسز ہیں۔ ان کے ساتھ چلی جانا جہاں بھی وہ لے جائیں۔ البتہ میری تمام تیاری کرکے جانا، میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوگا۔" وہ ہدایت دیتا باہر نکل گیا۔

اس کے تمام انداز واطوار اتنے نارمل سے تھے کہ خوش نما کو یقین نہ آسکا، یہ وہی نصیب ہے جو سیدھی سادی بات بھی بغیر طنز کے سلمی ستارے ٹانکے بغیر نہیں کرتا تھا اور خصوصاً اس کی ہر بات کا الٹا مطلب نکال کر اسے شرمندہ کرنا تو جیسے اس کی عادت تھی۔

کافی کے ساتھ چند بسکٹ لے کر وہ کچھ دیر کے لیے سوگئی۔ حیرت انگیز طور پر وہ پرسکون تھی۔ وہاں سے نکلتے وقت اس کے دامن میں اندیشوں، وسوسوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ناامیدی اور مایوسی کی گھٹاٹوپ تاریکی تھی، رستے بھر وہ خود سے الجھتی آئی تھی، لیکن اب جیسے دل کو قرار سا مل گیا ہو۔ وہ خود اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔

پھر ربا آئیں...... مسز ولی...... بڑی گرمجوشی اور اخلاق سے اس سے ملیں۔ باتونی اتنی کہ ایک بات کہنے کے بعد مخاطب کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اگلی بات شروع کردیتیں۔

"اللہ کس قدر شوق تھا تم سے ملنے کا، نصیب نے تعریفیں کرکے اتنا اشتیاق بڑھا رکھا تھا کہ پوچھو ہی مت۔"

وہ چونکی، شادی سے پہلے نصیب نے بھلا کب دیکھ رکھا تھا مجھے اور بعد میں وہ اسلام آباد گئے ہی نہیں تو تعریفوں کے جھوٹے پل کب باندھے۔ اس کے سوال کرنے سے پہلے ہی ربا پھر شروع ہوگئیں۔

"ہمارے پورے سرکل میں ایک بس وہی کنوارا رہ گیا تھا۔ ہمارا تو خیال تھا شاید ہی اس کی پسند کے مطابق کوئی لڑکی ملے، عجیب وغریب سی تو اس کی شرطیں تھیں۔"

وہ پوچھنا چاہتی تھی "کونسی؟" لیکن ربا اب اس کے شام کو پہننے والے ڈریس کی تعریف کرنا شروع ہوگئیں۔

"واؤ، بڑی زبردست چوائس ہے تمہاری، کوئنس آف دی ایوننگ تم ہی لگو گی اس بلیک ساڑھی میں۔ ویسے بھی تمہاری ہائٹ اور فیگر اس ڈریس کے لیے آئیڈیل ہے۔"

"آئی نو۔" بڑے اعتماد کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے بیگ شولڈر پر لٹکایا اور نکلنے کو تیار ہوگئی۔ اب اس تعریف نے اسے چونکایا نہیں تھا۔

✱✱✱

پورے تین گھنٹے گزار کر وہ فلیٹ پہ پہنچی تو نصیب آچکا تھا۔

"تم نے لنچ لیا؟" اس کے سامنے کے ایف سی کے لنچ باکسز بند پڑے تھے۔ خوش نما نے وال کلاک پہ نظر ڈالی۔ شام کے چھ بج رہے تھے پھر بھی وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

"جی...... وہ...... ربا اصرار کررہی تھیں تو ہم نے......"

"اوکے...... اٹس آل رائٹ...... مجھے یہی فکر تھی کہ کہیں تم تکلف میں نہ ماری جاؤ۔ ویسے اگر کچھ ہلکا پھلکا کھانا ہو تو پلیز جوائن می...... بٹ...... ود کپس آف ٹی......"

وہ مسکراتی ہوئی چائے بنانے چلی گئی۔ اس کے سامنے بھاپ اڑاتا مگ رکھنے کے بعد وہ سامنے ہی بیٹھ کے بے تکلفی سے اس کی پلیٹ سے فرنچ فرائز اٹھا کے کھانے لگی۔ وہ دلچسپی سے اس کے چہرے پہ تازہ تازہ میک اپ کو دیکھنے لگا۔

ہیئر اسٹائل اور میک اپ سے بالکل مطابقت نہ رکھنے والے لان کے ہلکے آسمانی

سوٹ میں ملبوس وہ عجیب سی لگ رہی تھی، لیکن اسے شاید اس کا احساس تک نہ تھا۔

کمرے تک جا کے وہ دوبارہ پلٹا۔ وہ برتن اٹھا کر کچن تک لے جا رہی تھی۔

''یہ تم نے کون سا سوٹ نکال دیا ہے۔ بلیک ڈنر سوٹ نکال دو یا پھر گرے لائننگ والا جو آنٹی کے گھر پہنا تھا۔''

''میں ان دو کلرز میں آپ کو دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکی ہوں۔'' آپ یہ والا سوٹ ہی پہن لیجئے پلیز۔ اور جہاں تک آپ کی اس بات کا تعلق ہے کہ بلیک کلر آپ کی شخصیت کو ابھارتا ہے تو اس کی فکر مت کیجئے۔'' وہ ایک لحظہ رکی پھر مڑتے ہوئے کہہ گئی۔

''میں نے اپنے لیے بلیک کلر کا انتخاب کیا ہے۔''

***

کرش شیفون کی بلیک ساڑھی میں وہ سچ مچ فان کلر کے سوٹ میں ملبوس نصیب احمد کی شخصیت کو مزید ابھار رہی تھی۔ اس کی پر اعتماد چال سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ اس لباس کو پہننے کا اس سے پہلے اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔

ساڑھی کے پلو اور بلاؤز کی فل آستینوں پہ گولڈن نفیس کام تھا، سیاہ پتھروں والے گولڈ کے سیٹ، ایک کلائی میں رونمائی کا تحفہ اور دوسری میں رسٹ واچ کے ساتھ وہ سادگی و نفاست کا شاہکار لگ رہی تھی۔

ہال میں موجود نصیب کے کولیگز، ان کی مسز اور تمام لوگوں کا اپنے لیے شاندار استقبال دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ سب اس سے ایسے مل رہے تھے جیسے عرصے سے جانتے ہوں۔ نصیب اس کا ہاتھ تھامے یوں ایک ایک کے پاس لے جا رہا تھا جیسے وہ اسے ملنے والی کوئی ٹرافی تھی جسے وہ فخر سے سب کو دکھا رہا ہو۔

''نادر جمالی صاحب! ہماری بیگم نہ صرف آپ کی فین ہیں بلکہ مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یہ خود بھی بڑی خوبصورت اور حساس شاعرہ ہیں۔'' ایک باریش سے شخص سے اس نے خوش نما کا تعارف کرایا تو وہ مرعوب سی ہو گئی۔ واقعی وہ اس کے پسندیدہ شاعر تھے۔

''بہت خوب، یعنی ہمارے حلقے میں ایک اور شاعر کا اضافہ...... بھئی اب تو ان گیٹ ٹو گیدر، نیو ایئر پارٹیز اور بون فائر کے ساتھ ساتھ مشاعرے کا بھی اہتمام کرنا پڑے گا۔'' مسٹر ولی نے خوش دلی سے کہا۔

''آپ غزل کہتی ہیں خوش نما یا نظم آپ کا ذریعہ اظہار ہے؟'' نادر جمالی صاحب

نے مشفق انداز میں کہا۔

''جی بس کبھی کبھار نظم کہہ لیتی ہوں۔''

''بھئی، ہم تو غزل کے شیدائی ہیں، لیکن اچھی نظم کہنے والوں کو بھی داد دیتے ہیں۔''

''ہاں بھابھی! پلیز کوئی خوبصورت سی نظم سنائیے۔'' نصیب کے کسی اور بے تکلف دوست نے اصرار کیا۔

''بلکہ سنائیے نہیں گنگنائیے وہی گیت جسے سن کر ہمارا یار مجنوں ہوا تھا۔'' ولی کی بات پہ وہ بری طرح چونکی۔

''نصیب کا کیا قصور، میں بھی جب صبح ان سے پہلی بار ملی تو دیکھنے کے بعد نہیں بلکہ سننے کے بعد فدا ہی ہو گئی۔'' ربا نے انکشاف کیا۔

''میں تو کہتی ہوں یہ دو سال کیا، نصیب اگلے دو سال اور بھی انتظار کرتا تو یہ خوش نما کا حق بنتا تھا۔''

''گیت...... دو سال...... آواز......''

ان مبہم اشاروں میں وہ ایسا الجھی کہ کب تقریب کا خاتمہ ہوا، اسے پتا ہی نہ چل سکا۔ نصیب نے اس کا کھویا ہوا انداز بھانپ کر سب کے اصرار کے باوجود جلد ہی جانے کی اجازت طلب کر لی تھی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ مزید صبر نہ کر سکی۔

''یہ سب کیا اسرار ہے؟ میں تو کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔ کیا آپ کسی اور کو پسند کرتے تھے؟ کہیں یہ لوگ مجھے وہی تو نہیں سمجھ رہے؟'' اس کے دماغ کے اندر جتنے بھی سوال کلبلا رہے تھے، وہ سب اس نے ایک ساتھ داغ دیئے۔

''ایک منٹ ایک منٹ، بتاتا ہوں سب بتاتا ہوں، گھر تو پہنچ لینے دو۔''

''نہیں پلیز، آپ ابھی بتائیے، وہ کون تھی جس کے لیے آپ دو سال انتظار کرتے رہے اور پھر آپ کو مجبوراً مجھ سے شادی کرنا پڑی۔''

''وہ تم ہی ہو۔'' اس نے رفتار آہستہ کرتے ہوئے انکشاف کیا۔

''مجھے بیوقوف مت بنائیے۔ آپ مجھے بھلا کب جانتے تھے دو سال پہلے۔''

''جانتا نہیں تھا، مانتا تو تھا۔''

''آخر آپ صاف بات کیوں نہیں کرتے؟''

"صاف بات......" ہار مان کے وہ بتانے پہ تیار ہو ہی گیا۔ خوش نما نے خود کو ہر طرح کی بات سننے کے لیے تیار کرلیا۔

"جب مجھے یہ جاب ملی اور میں زندگی میں پہلی بار گھر سے دور ہوا تو میری حالت بہت عجیب سی تھی، کچھ عرصہ پہلے ہی امی کی وفات ہوئی تھی، کچھ اداسی اس کی تھی، بلبل تب ننھی سی تھی اور میں اس سے خاصا اٹیچ تھا۔ یہاں آنے کے بعد میں شدید تنہائی اور ڈپریشن کا شکار ہوگیا۔ ہروقت بچوں کی تصویریں پھیلائے بیٹھا رہتا۔

"ایسے ہی کسی اداس سے دن میں نے بھابھی کو فون کیا۔ ان سے خبر ملی کہ بلبل اب چلنا شروع ہوگئی ہے۔ میں اسے دیکھنے کو مچل گیا، لیکن تب میرا ٹریننگ پیریڈ چل رہا تھا میں جا نہ سکتا تھا۔ بھابھی نے اپنے بھائی کی شادی کی مووی بھیج دی۔ جس میں بلبل ادھر سے ادھر بھاگتی دوڑتی پھر رہی تھی۔ میری ساری اداسی دور ہوگئی۔ اس مووی کو دیکھنے سے۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے پیارے چہرے کھوج رہا تھا، بھابھی، حبیب بھائی، اباجی، جگنو، بلبل سب کے پیارے پیارے پوز اسٹل کرکے دیکھ رہا تھا کہ ایسے میں تم سنائی دیں۔

ہاں سنائی دیں...... میں نے غور کیا، پچھلے ایک گھنٹے کے دوران اسکرین پہ کئی بار تمہاری جھلک دکھائی دی تھی، لیکن میں چونکا تب جب تمہاری آواز سنائی دی۔ خوبصورت آوازوں کا میں ہمیشہ سے شیدائی تھا۔ تمہاری آواز سب سے جدا اور بھرپور رنگ لئے تھی۔ تم ڈھولک پہ چمچہ بجاتے ہوئے مہندی کا کوئی گیت گا رہی تھیں۔ تمہاری آواز کے لوچ کے سامنے ساری لڑکیاں سحرزدہ سی بیٹھی تھیں۔ میں اکثر وہ مووی لگا کر تمہارا گیت سننے لگا، تب مجھے صرف تمہاری آواز اٹریکٹ کرتی تھی، لیکن آہستہ آہستہ شاید تم میرے حواسوں پہ چھانے لگی تھیں۔

انجانے سے رستے سے تم کسی طرح دل کے اندر تک پہنچ گئی تھیں، مگر مجھے پتا ہی نہ تھا۔ میں تب باخبر ہوا جب پچھلے سال بھابھی نے میری شادی کا ذکر چھیڑا اور مجھ سے میری پسند کے بارے میں پوچھا۔ پتا نہیں کس طرح چھن سے تم میرے تصور میں اتر آئیں۔

"ہلکے سبز سوٹ میں میک اپ سے بے نیاز چمکتی شفاف بے داغ سلونی سی صورت کے ساتھ، سادہ سی آنکھوں میں دنیا جہاں کی معصومیت سمیٹے...... ایک سحر تھا خوش نما تم میں کہ میں وہیں بیٹھے بیٹھے جکڑ گیا۔"

نصیب کی آواز خوش نما کو کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ ساری کہانی اسے پریوں کی کہانی لگ رہی تھی۔

"بھابھی نے جیسے مجھے جھنجھوڑ کر دوبارہ یہ سوال کیا۔ تب میں نے سنبھل کر اشارے کنائیے سے انہیں تمہارا حلیہ بتایا۔

"بھابھی! وہ پہلی نظر میں چونکا دینے والی شخصیت نہ رکھتی ہو بلکہ زینہ بہ زینہ دل کے اندر تک اترنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بھلے کچھ بھی ہو مگر ان میں حیا کے سائے اور معصومیت کے عکس ضرور ہوں۔ اور سب سے بڑی بات اس کی آواز...... آواز ضرور خوبصورت ہونی چاہیے بھابھی۔ جیسے چاندی کی گھنٹیاں...... نہیں...... جیسے جھرنا...... یا پھر...... کوئل کی چہکار...... اور بھابھی! وہ اتنی معصوم ہو کہ اپنے حسن سے، اپنی کشش سے آگاہ ہی نہ ہو۔"

میرا خیال تھا کہ تم بھابھی کی قریبی عزیزہ ہوگی۔ اس لیے وہ میرے اشاروں کے ذریعے تم تک پہنچ ہی جائیں گی، لیکن نجانے کیوں وہ ادھر ادھر لڑکیاں تلاشا شروع ہوگئیں۔

کچھ عرصہ میں نے بڑے صبر سے انتظار کیا پھر ان سے بات کر ہی لی۔ وہ بے حد حیران تھیں۔ مجھے تمہارے بارے میں ساری تفصیل بتائی۔ میں رضا مند تھا، مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہئے تھا۔ بھابھی نے کچھ عرصہ اور انتظار کرنے کو کہا کیونکہ اتفاق سے کچھ روز پہلے ہی تمہاری اماں کا انتقال ہوا تھا۔ پھر انہوں نے ہی سارے معاملات طے کیے۔ اباجی کو کوئی اعتراض نہ تھا نہ تانو کو۔ سب ہی میری خوشی میں خوش تھے اور تمہیں اس گھر میں لانے کے لیے راضی۔"

گھر آ گیا تھا، اس نے گاڑی روکی۔ وہ اتر کر ایک معمول کی طرح آگے بڑھ گئی۔ اس کی خاموشی معنی خیز تھی۔ نصیب چپ چاپ اس کے پیچھے چلا آیا۔ وہ بیڈ پہ گم صم بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا خوش نما؟ کیا اتنی بدگمان ہو مجھ سے کہ میری زندگی کی سب سے خوبصورت سچائی پہ ایمان نہیں لا رہیں؟" وہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"میں کیسے ایمان لاؤں؟ کیسے بھول جاؤں آپ کے شروع دنوں کے رویے کو جو کچھ آپ اب کہہ رہے ہیں اگر یہ سچ ہے تو پھر وہ کیا تھا جو آپ اس وقت کہتے تھے جب میں لاکھوں امیدیں لیے' ہزاروں خواب آنکھوں میں سجائے آپ کے گھر آئی تھی۔" دل

کی الجھن زبان پہ آ ہی گئی۔

''لاکھوں امیدیں...... ہزاروں خواب...... اور کروڑوں وسوسے، بدگمانیاں تو ان گنت تھیں، ان کی کوئی حد تھی نہ شمار......'' نصیب نے جتایا۔ وہ سر جھکا کر رہ گئی۔

''بھابھی نے تمہارے سارے خدشے بیان کئے تھے مجھ سے کہ تم اس غلط فہمی کا شکار ہو کہ تمہیں ترس کھا کر انسانی ہمدرری کے طور پہ قبول کیا جا رہا ہے۔ پھر مہندی والے واقعہ نے مجھے یہ باور کروایا کہ تم خود ترسی کے ساتھ ساتھ احساس کمتری کا بھی شکار ہو۔ اس میں تمہارا قصور نہ تھا تمہارے ساتھ جو حالات رہے اس میں اچھے خاصے مضبوط اعصاب کے مالک افراد بھی اپنا اعتماد کھو سکتے تھے۔ اس لیے تمہارا اعتماد واپس لانے تمہاری بدگمانیاں دور کرنے کے لیے مجھے یہ سب ڈرامہ کرنا پڑا۔''

''مجھ پہ ایسے عجیب و غریب فقرے کس کے اور سب کے سامنے میرا مضحکہ اڑا کے آپ سمجھتے تھے۔ آپ میرا علاج کر رہے ہیں۔'' وہ حقیقت جان کر پھٹ پڑی۔ ''جانتے ہیں، آپ کی باتیں سننے کے بعد میرا دل چاہتا تھا۔ میں خودکشی کر لوں۔''

''یہ تمہارے ابتدائی احساسات تھے۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن میرا طریقہ کارگر رہا۔ یار! تم خود بتاؤ اگر میں پہلی ملاقات میں وارفتگی جتاتا تو تم کیا سمجھتیں۔ ترس، ہمدردی...... ہے نا؟ اس لیے میں نے رفتہ رفتہ تمہارا اعتماد بحال کیا۔ سب سے پہلے ایک طویل چھٹی کے ذریعے تمہیں اپنے گھر اور گھر والوں کے قریب رہ کر ان سے مانوس ہونے کا موقع دیا ورنہ سب سمجھ رہے تھے کہ ایک ماہ کی چھٹی میں نے کسی لمبے ہنی مون ٹرپ کے لیے لی ہے۔ جب تمہیں ایک بھرے پرے کنبے کی اپنائیت ملی تو خود پہ تمہارا اعتماد بحال ہوا۔

اب میری بے نیازی تمہیں کھلنے لگی، تم سوچنے لگیں کہ جب اور لوگ تمہاری حیثیت تسلیم کر سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں، تب تم نے اس چیلنج کو پورا کرنے کی ٹھانی۔ تمہارا بغیر کسی پس و پیش کے اسلام آباد چلے آنا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی اور یہی میں چاہتا تھا کہ بجائے اس کے کہ میں تمہیں تمہارے ہونے کا احساس دلاتا تم خود آگے بڑھ کر مجھے اپنے وجود کا احساس دلاؤ۔''

''اور اگر...... اگر اس سارے قصے میں میں آپ سے نفرت کرنے لگ جاتی...... شدید نفرت...... تو پھر؟'' لب دانتوں تلے دبا کے اس نے شرارت سے پوچھا۔

''نفرت اور مجھ سے؟ رج کے سوہنے منڈے سے...... ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ذرا میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ، کیا میں نفرت کے قابل ہوں؟'' اس نے انگلی سے اس کا

جھکا چہرہ اٹھا کر پوچھا۔ آج تو اس چہرے کی جگمگاہٹ عروج پہ تھی۔ خوش نما کی جیسے آنکھیں ہی چندھیا گئیں۔

''میں تو اب تک یہ ہی نہیں سمجھ پائی کہ آخر آپ نے مجھ میں کیا دیکھا...... ایک، عام سی لڑکی میں۔'' وہ اتنے قریب اسے پا کر اس کی شخصیت کے سحر سے مرعوب ہو گئی۔

''جب آنکھ میں شام اترے
پلکوں پہ شفق پھولے
کاجل کی طرح میری
آنکھوں کو دھنک چھو لے
اس وقت کوئی اس کو
آنکھوں سے میری دیکھے
پلکوں سے میری چومے......''

سحر زدہ سی آواز میں گنگناتا وہ اس کے قریب ہوا تو وہ بل کھا کے پرے سرک گئی۔

''اور ایک بات اور...... جس کا شک مجھے بہت پہلے سے تھا، میری ڈائری سے نظمیں چرا چرا کے آپ ہی بھجواتے رہے ہیں نا؟''

''تم میرا سب کچھ چرا لو اور میں تمہاری دو چار نظمیں تک نہیں چرا سکتا۔''

''نہیں بلکہ سچ پوچھیں تو یہ بھی آپ کا احسان ہی تھا مجھ پہ، ورنہ اس سے پہلے کب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ مجھ میں بھی کوئی صلاحیت ہے۔''

''اب ایک احسان آپ بھی کر دیجئے۔'' اس نے فرمائش کی۔

''عرصے سے خواہش تھی کہ کبھی تم میرے سامنے بیٹھ کر کچھ گنگناؤ...... پلیز...... آج صرف چند بول۔''

اس کے اتنے اصرار پہ وہ مان گئی۔

''رنگیلا رے
تیرے رنگ میں
یوں رنگا ہے، مم......

نصیب نے فوراً اس کے منہ پہ ہتھیلی جما دی۔ وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔

''خبردار لڑکی خبردار......''

''اچھا اچھا کچھ اور سناتی ہوں۔''

برے نصیب میرے
برے نصیب میرے
میں نے تجھے......

اسے ناراضی سے اٹھ کر کھڑے ہوتے دیکھا تو مشکل سے شرارت پہ آمادہ دل کو کان پکڑ کر سرزنش کی۔

''برا ہوں ناں میں، ٹھیک ہے یاد رکھو، تم تنہا بھی ہو اور بے بس بھی، ظلم و ستم کی انتہا کر دوں گا۔'' اس نے جلاد صفت شوہر کے اسٹائل میں دھمکی دی۔

''لو خوامخواہ میں تنہا اور بے بس۔ ایک فون کروں نانو، ابا جی، حسیب بھائی، باجی سب آ جائیں آپ کی خبر لینے۔''

''اس کا مطلب ہے، میں نے آپ اپنے پیر پہ کلہاڑی ماری ہے۔''

وہ روٹھ کے دور بیٹھ گیا۔ پیچھے سے خوشنما نے دھیرے سے اس کے شانے سے ٹیک لگاتے ہوئے گنگناہٹ بکھیری۔

منڈا سونے رنگ دا
دل لے گیا۔
میرا سوں رب دی
منڈا سونے رنگ دا۔

***

اجی سنتے ہو

نیم تاریک کمرے کے اس کونے میں جہاں فرانسیسی طرز کی بڑی سے کھڑکی کھلتی تھی۔ اور وہ کھڑکی اس وقت اگرچہ بند تھی اور اس پر سفید جالی اور آسمانی ویلوٹ کے خوبصورت پردے گرے ہوئے تھے مگر گرمیوں کی اس صبح نے اپنی روشنیاں اس طرح منہ زور کر رکھی تھیں کہ موٹے شیشے کی کھڑکی' اس پہ لگے ویلوٹ کے بھاری پردے اور لہراتی سفید مہین جالی بھی اس کا راستہ پوری طرح نہیں روک پا رہی تھی اور یہ کونا کمرے کے نیم تاریک ماحول سے الگ سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اسی جانب کروٹ لیے سویا ہوا تھا' یہی وجہ ہے کہ روشنی کا احساس مجھے بے دار کر گیا۔ میں نے سنبل کا نرم ملائم تکیہ چہرے پہ رکھا اور کروٹ بدل کے دوبارہ سونے کی کوشش کی۔ اے سی آف تھا مگر رات کے کئی گھنٹے مسلسل چلنے کی وجہ سے ابھی تک کمرے میں خنکی باقی تھی۔ پنکھے کی ہلکی بے آواز ہوا بھی بھلی لگ رہی تھی۔ میں نے ذرا سی آنکھ کھول کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھے کلاک پہ توجہ کی۔ صبح کے پونے نو ہو رہے تھے۔ گرمیوں کے لحاظ سے دن کب کا شروع ہو چکا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اٹھنے کا ارادہ کر لیا۔ اگرچہ آج چھٹی کا دن تھا لیکن بارہ بجے میرا ایک پبلشر سے ملنا طے تھا بلکہ میں نے اسے لنچ پہ گھر بلا رکھا تھا۔ سست

قدموں کے ساتھ میں کھڑکی کی جانب بڑھا۔ پردے کھینچے اور پورا بیڈ روم بغیر ٹیوب لائٹ آن کئے روشن ہوگیا۔ میرے اس مختصر مگر خوبصورت گھر کے دونوں بیڈ رومز اوپر والے پورشن میں تھے اور اس رخ پہ بنے تھے کہ تازہ ہوا اور روشنی کا با آسانی گزر ہوتا تھا۔ یہ اہتمام میں نے بطور خاص اپنے شاعرانہ ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا تھا۔

جی ہاں' میں ایک شاعر ہوں۔

نہ صرف شاعر بلکہ افسانہ نگار اور کالم نویس بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ایک کثیر الاشاعت روزنامے کے ادبی وسماجی ایڈیشن کا انچارج بھی ہوں۔ میرے کئی شاعری کے اور افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور بے حد مقبول بھی ہو رہے ہیں۔ یہ اندازہ آپ کو میری مناسب حد تک خوشحال زندگی کو دیکھ کر بھی ہوسکتا ہے' ورنہ محض ادب کے سہارے کون معاشرے میں باعزت طور پہ رہ سکتا ہے۔ میرے دو شعری مجموعے تو نوجوان نسل میں بے حد مقبول ہوئے تقریباً ہر سال ان کے ...... نئے ایڈیشن شائع ہوتے ہیں اور مجھے نئے سرے سے رائلٹی ملتی ہے۔ نوجوان نسل مجھے محبت کا شاعر کہتی ہے۔ محبت' حسن' بہار...... یہ سب میری شاعری کی علامات ہیں۔ میری اس مقبولیت کو کیش کرانے کے لئے پہلے پہل اس روزنامے نے مجھے کالم لکھنے کی آفر دی جسے میں نے منہ مانگی قیمت پر منظور کیا۔ میرے کالم سنجیدہ نوعیت کے ہوتے ہیں اور میں سیاسی موضوعات کے بجائے عام سماجی مسائل کے بارے میں حساس اور دردمند دلوں کو جھنجھوڑنے کی نیت سے لکھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بدلتی حکومتیں اور اپنے اپنے مزاج کے مالک اہل اقتدار میرے کام میں خلل نہ ڈال سکے۔

اس میدان میں میری کامیابی دیکھتے ہوئے اس اخبار کے ایڈیٹر نے ہفتہ وار شائع ہونے والے سنڈے میگزین کے ادبی اور سماجی صفحات کا بھی مجھے انچارج بنا دیا۔ یعنی میرا رزق اس شعبے میں بڑھتا چلا گیا جس کے لئے میرے والدین جب تک حیات رہے' مجھے خوف زدہ ہی کرتے رہے کہ صرف کاغذ کالے کر لینے سے گھر کا چولہا نہیں جلتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری صلاحیت' میرا فن' میرے روزگار کا بھی سبب بنا۔ ذرا دیر سے ہی سہی مگر میں فکر معاش سے قدرے آزاد تو ہوا۔ اسی رزق سے میں نے یہ پانچ مرلے کا گھر اس متوسط مگر نئی ہاؤسنگ اسکیم میں بنایا۔ اسی کمائی سے خریدی گئی یہ سیکنڈ ہینڈ سوزوکی ایف ایکس بھی گھر کے مختصر سے پورچ میں سیاہ کپڑے سے ڈھکی کھڑی ہے۔ مجھے آفس کی وین پک اینڈ ڈراپ کرتی ہے۔ میری بیٹی اپنی اسکول وین میں آتی جاتی ہے اور بیٹے کے پاس سائیکل

ہے' اس لئے اس عمر رسیدہ گاڑی کی صحت بھی بہتر ہی رہتی ہے کیونکہ اس عمر میں ہم اس سے زیادہ کام جو نہیں لیتے۔

میں نے بھرپور انگڑائی لے کر اپنے اس پرسکون کمرے کا جائزہ لیا۔ نیلگوں ماحول ہمیشہ سے میری کمزوری رہا ہے۔ اپنے لئے بیڈ روم سجاتے ہوئے میں نے یہی رنگ نمایاں رکھا۔ دیواروں پہ ہلکا آسمانی پینٹ' دروازے اور کھڑکیاں سفید' فرش پہ گہرا نیلا کارپٹ اور اس سے ہم رنگ پردے' سفید فرنیچر پہ نیلے رنگوں کے امتزاج والی چادریں بچھی ہوتیں۔ یہ کمرہ میرے ذوق کے عین مطابق تھا اور میری حسِ جمال کی تسکین کرتا تھا۔ یہی میرا اسٹڈی روم تھا۔ ویسے بھی اس مکان میں الگ اسٹڈی روم بنانے کی گنجائش نہ تھی۔ نچلے پورشن میں لاؤنج' ڈرائنگ روم' ڈائننگ روم اور کچن تھا۔ ان کے اوپر دو کمرے مع باتھ اور ایک اسٹور روم بنا ہوا تھا۔ اسٹور روم دونوں کمروں کے درمیان واقع ہے۔

اس طرح دوسرے کمرے کا شور میرے کمرے تک نہیں پہنچتا۔ وہ کمرہ میرے بچوں کا ہے' میری تیرہ سالہ بیٹی اور گیارہ سالہ بیٹے کا۔

میں نے کھڑکی کا شیشہ پورا کھول دیا۔ اگرچہ بڑی روشن صبح تھی مگر دھوپ اتنی تیز نہ نکلی تھی کہ بدن کو چبھتی۔ باہر کشادہ گلی میں میرا بیٹا اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا۔ یہ گلی آگے سے بند تھی۔ ٹریفک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ اس لیے اس میں بنے چھ سات مکان اس گلی کو مشترکہ طور پہ ایک پلے گراؤنڈ کی طرح استعمال کرتے تھے۔

پورچ کے ساتھ مختصر سا احاطہ تھا جس میں لگے دو پیڑ، ایک جامن کا اور ایک کچنار کا ...... گلاب اور موتیا کی باڑھ...... اور سائیڈ پہ پڑے دو گملے اسے لان کی شکل دے رہے تھے ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ان گنتی کے چار گملوں، دو پیڑوں نے اتنی جگہ بھی نہ چھوڑی تھی کہ اس ''لان'' میں دو بید کی کرسیاں ہی ڈال دی جائیں۔ میری بیٹی جاناں گھاس پہ بیٹھی اپنا ڈرائنگ کا شوق پورا کر رہی تھی۔ اس نے اوپر دیکھا تو مجھے دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلایا۔

''پاپا!'' وہ چلائی اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''اسے پتا چل گیا کہ میں جاگ چکا ہوں'' خوف زدہ ہوتے ہوئے میں نے سوچا اور کھڑکی کے آگے سے ہٹ گیا۔ میں اپنی بیٹی سے ہرگز خوف زدہ نہ تھا۔ وہ تو بچپن میں بھی کوئی تنگ کرنے والی بچی نہ تھی اور اب تو ماشاء اللہ سمجھ دار ہو چکی تھی۔ ہر وقت اپنی کتابوں، کلر، پینسلز میں گم رہنے والی پڑھاکو سی عینکو بچی۔ (مجھے اپنی اولاد کے ''عینکو'' یا ''چشماٹو'' ہونے پہ بڑا فخر تھا۔ پتا چلتا تھا کہ کسی دانشور کی اولاد ہے۔) خوف تو مجھے اس

لیے محسوس ہوا تھا کہ جاناں کی یہ آواز اس کھڑکی سے اندر تک بھی پہنچ گئی ہوگی جو کھڑکی ایک جانب سے اسی برائے نام لان میں اور دوسری جانب کچن میں کھلتی ہے اور جہاں میری بیوی آٹے میں دونوں ہاتھ گھمائے پرات میں مکے مار رہی ہوگی۔ ڈھیر سارا ساگ اطراف میں پھیلائے زمین پہ پھسکڑا مارے ڈنڈیاں توڑ رہی ہوگی۔ کریلوں کو نمک مل مل کے خوب رگڑ رہی ہوگی۔ یا پھر ایسی ہی کسی نامعقول مصروفیت میں مگن ہوگی لیکن میرے جاگنے کی اطلاع سن کر وہ پہلی فرصت میں ہاتھ اپنے بدرنگ سوٹ سے پونچھے گی۔ منہ پہ گری لٹوں کو ان ہی ہاتھوں سے دوبارہ اپنی اجڑی ہوئی چوٹی میں اڑسنے گی اور بچا کھچا آٹا ، ساگ کے پتے یا کریلے کی کڑوی جھاگ اپنی زلفوں میں سجائے سیڑھیاں دھڑا دھڑ چڑھنا شروع ہوجائے گی، ایک دھماکے کے ساتھ میرے کمرے کا دروازہ کھولے گی اور اپنی بلغ جیسی کرخت آواز میں خوانخواہ کی شیرینی گھولنے کی سراسر ناکام کوشش کرتے ہوئے کہے گی۔

''اجی سنتے ہو!''

''اور میں ...... ریحان علی فلک ...... رومانوی شاعر، فکر انگیز کالم نویس، مایہ ناز دانشور، ایک سنجیدہ افسانہ نگار ...... ہرگز نہ سننا چاہتا تھا، کبھی بھی نہیں، ان پندرہ سالوں میں ایک بار بھی نہیں ...... لیکن وہ میری بیوی ...... ایک رومانوی شاعر، حساس ادیب، ملک کی نامور ادبی شخصیت کی بیوی مجھ سے اجازت طلب نہیں کرتی تھی بلکہ مجھے خبردار کرتی تھی یہ کہہ کر۔

''اجی سنتے ہو!''

اسے اس بات سے قطعاً سروکار نہ تھا کہ اس کا ''اجی'' سننے پہ رضامند ہے یا نہیں۔ وہ سننے کی تاب بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ اسے صرف اپنی سنانے سے غرض ہوتی تھی۔ سیڑھیوں پر اس کے چڑھنے کی دھمک گونج رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ حملہ آور ہو، اپنی بے سروپا گفتگو کے ساتھ۔ میں واش روم میں پناہ لے لیتا ہوں۔

''دھڑام ...... ٹھاہ ......''

یہ دھڑام کی آواز میرے واش روم کا دروازہ بند ہونے کی تھا اور ٹھاہ کی زوردار آواز کے ساتھ میری بیوی نے دروازہ کھولا تھا۔

''اجی سنتے ہو!''

اس کی ریل گاڑی کی نصف صدی پرانی وسل جیسی آواز خالی کمرے میں گونج کے

رہ گئی۔ اچانک میری رائٹنگ چیئر کے کراہنے کی آواز آئی اور پھر مسلسل آہ و بکا کی صورت مجھ تک پہنچتی رہی۔ یقیناً وہ اس پہ بیٹھی گول گول چکر گھماتی جھولا جھول رہی ہوگی۔ میں نے غصے سے دانت کچکچائے مگر نتیجتاً ٹوتھ برش کا بیڑہ غرق ہوگیا جو دونوں داڑھوں کے درمیان کچلا گیا تھا۔ یہ اس مہینے کا چوتھا ٹوتھ برش تھا۔ پتہ نہیں دانت کچکچانے سے پہلے میں یہ برش احتیاط سے نکال کیوں نہیں لیتا اور پتا نہیں' میں دانت آخر کچکچاتا ہی کیوں ہوں اور پتا نہیں اس ٹوتھ برش کے بجائے میری بیوی سالم کی سالم کیوں نہیں' میرے دانتوں کی زد میں آ کر کچلی جاتی۔

اوہو' یہ میں کیا اول جلول سوچ رہا ہوں۔ سراسر غیر شاعرانہ باتیں ...... نہیں' مجھ جیسے نفیس طبع رومانوی شاعر کو ایسے غیر رومانوی خیالات زیب نہیں دیتے۔

میں نے سر جھٹکا۔ واش روم میں اس سے زیادہ وقت نہیں گزارا جاسکتا تھا اور وہ بھی اس گرمی میں۔ میں نے چھت کا جائزہ لیا' مختصر سی کھڑکی میں ایگزاسٹ فین تو لگا ہی ہوا تھا۔ میں سنجیدگی سے سیلنگ فین لگوانے کے امکانات کے بارے میں غور کرنے لگا۔

''چلو اب آ بھی جاؤ۔ میں کوئی ''ویلی'' تو نہیں بیٹھی۔ روٹی پکا رہی ہوں' ہانڈی سڑ نہ جائے۔''

اس کی دُہائی پہ میں باہر نکلا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری باتیں وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دینے کی عادی ہے' میں ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہانڈی نہیں' ہنڈیا کہتے ہیں اور یہ ''سڑتی'' نہیں ''جل جاتی'' ہے۔ ابھی تو میں اسے یہ بھی بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ۔ ''کھانا پکانے'' کے بجائے ''روٹی پکانا'' کیوں کہتی ہے کہ اس نے اپنے اصل منہ سے بھی زیادہ برا منہ بنایا۔

''سڑے ...... یا جلے ...... ایک ہی بات ہے۔ ناس تو ہوجاتی ہے۔''

''ناس کیا ہوتا ہے' ضائع ہوجاتی ہے یا برباد ہوجاتی ہے۔'' میں اردو کی اس مرمت پہ رہ نہ پاتا تھا۔

ناس ہو، برباد ہو، ضائع ہو، تباہ ہو ایک ہی بات ہے۔ سیاپا تو میری جان کو ہے' مجھے ہی دوبارہ وخت پڑے گا۔''

اس سے پہلے کہ میں ''سیاپا'' اور ''وخت'' کے متبادل کوئی مہذب اور بھلے الفاظ اسے بتاتا کہ وہ شروع ہوگئی۔

''اجی سنتے ہو! آپا صغرا کی پوتری (پوتی) کی کڑمائی ہوگئی ہے۔''

"کیا ...... ہوگئی ہے۔" جہاں تک میرے علم میں تھا' میری اس رشتے کی خالہ جو خاندان میں آپا کے نام سے مشہور تھیں کی کسی پوتی کی اب تک شادی نہ ہوئی تھی پھران کی "کڑی" کیسے ہوگئی۔

"کس کے گھر بیٹی پیدا ہوئی ہے؟"

"ہا...... ہائے۔ اجی' ہوش کرو' ابھی تک سوئے ہوئے ہو۔ میں نے بیٹی کا نام کب لیا۔ آپا کی سب سے سیانی پوتری کی کڑمائی ہوگئی ہے۔ یعنی بات پکی ہوگئی ہے۔"

"اوہ...... اچھا اچھا...... مبارک ہو۔"

"مجھے کس بات کی مبارک باد۔ لو بھلا' تو کون میں خواہ مخواہ۔" وہ بلاوجہ ناراض ہوگئی۔ میں نے کھڑکی سے آواز دے کر جاناں کو اخبار لانے کے لیے کہا۔

"بڑی آپا بنی پھرتی ہیں آپ کو بڑا شوق ہے اپنے گھر کے ہر معاملے میں اپنی خالہ کو آگے کرنے کا۔ بزرگ ہیں ہماری' بزرگ ہیں ہماری۔" اس نے ٹیڑھا منہ کر کے میری نقل اتاری۔ میں غصے کا گھونٹ بھر کے رہ گیا۔ بے شک یہ الفاظ میں نے ضرور ادا کیے ہوں گے مگر ایسے منحوس تاثرات کے ساتھ نہیں جیسے وہ کہہ رہی تھی۔

"انہیں شرم نہ آئی' اتنا بڑا فیصلہ آپوں آپ کرتے ہوئے۔ آپ سے صلاح نہیں لے سکتے تھے۔ سارے معاملے طے کر کے یہ چار لڈو پکڑا گئے ہیں۔ اس نے موتی چور کے لڈو سامنے کیے۔" میں نے اخبار کے استقبال کی خاطر عینک چڑھالی۔

لڈو کے ساتھ چائے بھی لے آتیں، میں نے احساس دلایا کہ ساڑھے نو بج رہے ہیں اور میں تاحال صبح کی اس عیاشی سے محروم ہوں۔

"پاپا' چائے اور یہ اخبار۔" جاناں نے گرم گرم چائے کا کپ آگے کیا تو میں سمجھ گیا کہ اسے اخبار لانے میں تاخیر کیوں ہوئی' ورنہ وہ میری ایک آواز پہ لپک کے آجایا کرتی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کپ تھاما اور اس کے ہاتھ کی پشت پہ ایک پیار بھرا بوسہ دیا۔ وہ مجھ سے جڑ کے بیٹھ گئی۔ آرزو کو ہماری محبت کا یہ مظاہرہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ یہ الگ بات کہ اس کی ایک آنکھ بھی مجھے نہ بھاتی تھی۔ (آرزو میری بیوی کا نام ہے اور اس نام پہ میں نے جو دھوکے کھائے ہیں اور میری آرزوؤں کا جو قتل عام ہوا ہے' اس کے دکھڑے میں بعد میں روؤں گا۔ ذرا چائے' لڈو اور اخبار سے نمٹ لوں اور ہاں...... آرزو کی بے تکی باتوں سے بھی۔)

"کتنی بار کہا ہے' بیٹیوں کے ہاتھ نہیں چومتے۔ ان کے ماتھے پہ پیار کرتے ہیں۔"

اس کے اعتراض کی وجہ آج ہر حال میں جاننے کی ٹھانتے ہوئے میں نے "کیوں" کا نعرہ بلند کیا۔

"سیانے کہتے ہیں۔ بیٹی کے ماتھے پہ پیار کرو تو اسکے نصیب اچھے ہوتے ہیں۔ ہاتھ پہ پیار کرو تو ہاتھ میں ذائقہ نہیں رہتا۔" اس نے اپنی علمیت جھاڑی۔ ایسے میں اس کے ہونق چہرے پہ جو خود ساختہ "سیانا پن" ہوتا تھا' وہ دوسروں کے قہقہے بلند کرنے میں خاصا معاون ثابت ہوتا۔

"اس سیانے نے یہ مشورہ تمہارے ابا جی کو کیوں نہ دیا۔ وہ بھی ضرور تمہارے ہاتھ چومتے رہے ہوں گے۔" میرے طنز کی تہہ میں اترے بغیر اس نے جواب دیا۔ "میرے ابا جی آپ بڑے سیانے تھے' وہ خود یہ بات کہتے تھے۔"

"اچھا...... اچھا...... یعنی یہ ان کا تجربہ بول رہا تھا۔" وہ اب بھی نہ سمجھی مگر میری دبی دبی مسکراہٹ اور جاناں کی کھی کھی سے ذرا مشکوک ہوئی۔

"چلو چھڈو۔ اجی سنتے ہو! میں نے کہا۔ آپاں صغراں کو مبارک باد دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ فون کرنا ہے' نہ گھر جانا ہے۔ ذرا آگ لگنے دو ان کو بھی' جب پوچھیں گی تو جتائیں گے کہ ہم اس بچی کے کوئی نہیں لگتے جو کسی صلاح مشورے میں شامل نہیں کیا۔"

میں نے اس کے مشورے پہ فوراً سر ہلا دیا، میں یکسوئی سے اخبار پڑھنا چاہتا تھا، اس لیے اس کے جانے کا منتظر تھا۔

"آج کیا پکاؤں؟"

جس سوال سے میں بچنا چاہ رہا تھا' وہی اس نے سامنے لا رکھا۔ اب ہر روز کی طرح ایک بحث شروع ہونے والی تھی جس کے سارے مندرجات سے میں آگاہ تھا۔ اپنے پیش کیے گئے نکات سے بھی اور اس کے اعتراضات سے بھی۔ اس بحث کا منطقی انجام کیا ہوگا۔ یہ بھی جانتا تھا لیکن اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھا کہ اس بحث سے فرار ممکن نہیں۔ میں نے ایک بے بس سی آہ بھری۔

"جو مرضی پکالو۔" روز یہ جملے دہرا دہرا کے اب میں خود ہی تنگ آ گیا تھا۔

"میری مرضی کا آپ نے کوئی کھانا ہے۔ ویسے بھی چھٹی کا دن ہے' کھانا آپ کی پسند کا پکنا چاہیے۔" وہ البتہ یہی فقرے ہر بار بڑی رغبت سے ادا کرتی تھی۔

"بچوں سے پوچھ لو۔" وہی میرا جان چھڑانا۔

"بچوں سے کیا پوچھوں۔ جاناں کہے گی۔ ماما! میں نے ابھی اتنا بڑا پراٹھا کھایا ہے'

میں تو رات تک کچھ کھانے والی نہیں۔ جنید کہے گا۔ میرے لیے برگر یا پیزا منگوا دیں۔'' وہی' اس کا جان نہ بخشنا۔

''گوشت میں کوئی سی بھی سبزی ڈال لو۔'' میں نے اخبار پلٹا۔

مگر کون سی کوئی ایک سبزی ہے۔

''کدو ڈال لو یا بھنڈی۔''

''گوشت اتنا مہنگا ہو گیا ہے' دو سو روپے کلو۔ ناس مارنا ہے اتنے مہنگے گوشت کا۔''

وہ غضب ناک ہوئی۔ ''بھنڈی تو بندہ ویسے ہی مسالہ ڈال کے بھون لے۔ گوشت میں تو ساری لیس چھوڑ دیتی ہے اور کدو تو ابھی کل ڈالے تھے۔''

''آلو ڈال لو' کچنار ڈال لو یا پھر ایسے ہی بھون لو۔''

''دماغ خراب ہے میرا جو اتنا مہنگا گوشت خالی بھون لوں۔ ایک ڈونگا بھی نہیں بنے گا۔ سبزی سے دو وقت کا سالن بن جائے گا۔ آلو آج کل میٹھے آ رہے ہیں اور کچنار کا اب موسم کہاں رہا ہے۔ جب موسم تھا تو آپ نے پکانے نہیں دی کہ پکانے کے لیے سبزیاں کم تو نہیں جو کچی کلیاں نوچ کر پکا رہی ہو' کم از کم پھولوں کو تو بخش دو۔''

''ہاں تو کیا غلط کہا تھا۔ اتنی نرم و نازک کونپلوں کو گھی میں گرم مسالے اور دہی کے ساتھ پکتے دیکھ کر مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔''

''اور کیا مجھے تکلیف نہیں ہوتی تھی جب ٹوکریاں بھر بھر کچنار اپنے درخت سے اتارتی تھی اور محلے والے چٹخارے لے لے کر کھاتے تھے۔ چالیس روپے کلو ملتی ہے بازار میں اور ہم مفت کی بھی نہیں کھا سکتے۔ ہا...... ہائے' آج تو آپ کا دوست بھی کھانے پہ آ رہا ہے۔ جلدی بتائیں۔ کیا پکانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے' ابھی مجھے اتوار بازار بھی جانا ہے۔ سیل سے لان کے ''ٹوٹے'' (پیس) بھی چھانٹنے ہیں۔''

''مرغی سستی ہے' وہ بھون لو۔ ساتھ میں مسالے والی بھنڈی۔''

''آپ کا دوست کیا کہے گا' فون کر کے روٹی پہ بلایا اور یہ پکا کر رکھ دیا۔''

''پھر مرغی کی بریانی یا پلاؤ پکا لو۔ ساتھ میں شامی کباب' ایک سالن بنا ڈالو۔''

''ہاں' بڑا لاٹ صاحب آ رہا ہے۔ میں ہزار روپے کی روٹی پکا ڈالوں۔'' اس نے ہاتھ نچایا۔ زچ ہو کر میں نے اخبار پٹخ دیا

''تم کچھ مت پکاؤ' کم از کم میرے یا میرے دوست کے لیے تو ہرگز نہیں۔ میں اسے باہر کھانا کھلا دوں گا۔'' خیری صلاً' گھر کے ہوتے ہوئے ہوٹل میں کس لیے جانا ہے

اور اگر زیادہ نوٹ ابل رہے ہوں یاروں پہ لٹانے کے لیے تو ایک چکن کا جوڑا مجھے بھی لے دو۔''

''تم کھانا بعد میں پکانا' پہلے چکن کا جوڑا لے آؤ۔''

اس سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لیے اگر پانچ سو یا ہزار کے نوٹ کی قربانی دینا پڑتی تو مجھے منظور تھی۔

''پہلے آپ اٹھو' پوستی بن کے لیٹے رہتے ہو۔''

اس نے کمال جرأت سے ملک کے ایک عظیم مفکر اور دانشور کو ''پوستی'' کا خطاب دے دیا۔ میں تڑپ کے اٹھ بیٹھا

''چکن کا جوڑا میں آپے خرید لوں گی۔ آپ پہلے کلو چکن خرید کے لاؤ۔ کیا یاد کرو گے' آج آپ کی بات مان لیتے ہیں۔ چکن پلاؤ بنا لیتی ہوں' ورنہ میرا دل کڑھی کھانے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے بیسن بھی گھول رکھا تھا۔ حیرت کی شدت سے میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا' ورنہ وہ ساری تیاریاں کرنے کے بعد رسماً مجھ سے پوچھنے آیا کرتی اور ایک لایعنی بحث کے بعد آخر وہی پکاتی جو اس نے طے کر رکھا ہوتا تھا۔ اگر چہ دکانوں پہ سبزی یا گوشت خریدنا میرے شایانِ شان نہ تھا اور میں حتی الامکان اس سے گریز کیا کرتا تھا لیکن آج میں اس پہ بھی تیار ہو گیا۔ ویسے بھی اس متوسط علاقے میں رہنے کا فائدہ یہ تھا کہ مجھ سے نامور ادیب کو نام سے تو بہت سے لوگ پہچانتے تھے مگر صورت سے کم ہی ...... پھر بھی ریڑھی والے سے ٹماٹروں کے بھاؤ پر بحث کرتے ہوئے میں کن انکھیوں سے دیکھتا رہتا کہ کہیں میرا کوئی نوجوان مداح مجھے اس ''مذموم حرکت'' میں ملوث پاتا نہ دیکھ لے۔ یہ بھی شکر تھا کہ کتابوں کی پشت پہ چھپنے والی میری تصویر کوئی اٹھارہ سال پرانی تھی۔

''اور ہاں' میں مذاق نہیں کر رہی۔ شام کو مجھے واقعی اتوار بازار جانا ہے۔ اپنے اور جاناں کے لیے لان کے ''ٹوٹے'' دیکھنے ہیں۔ ساتھ میں ایک نظر دوسری دکانوں پہ بھی مار لوں گی۔ آپاں صغراں کی پوتری کی شادی ہو گی۔ ظاہر ہے بڑھیا سا کامدار جوڑا اور ساتھ جہیز کے لیے تحفہ بھی دینا ہو گا۔ ابھی سے سوچ کے رکھ لوں' کیا لینا ہے اور کتنے میں آئے گا۔''

میں حیرت سے اپنی زوجہ محترمہ کو تکنے لگا جو کسی کرپٹ سیاستدان کی طرح منٹ منٹ میں بیان بدل رہی تھی۔

''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ انہیں مبارک باد تک نہیں دینی۔'' میں اس پینترے بازی کی وجہ دریافت کرر ہا تھا۔

''وہ الگ مسئلہ ہے مگر دھی تو سانجھی ہوتی ہے۔''

وہ پھر سے ''سیانا پن'' جھاڑتے ہوئے باہر نکل گئی۔

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھ سے تھاما۔ عرصے سے اسی دماغ کی بدولت کھا رہا تھا۔ دماغی محنت کرر ہا تھا۔ گھنٹوں لکھنے' طویل مقالے پڑھنے' عرق ریزی کرنے کے باوجود ذہنی حالت اتنی مخدوش نہ ہوتی تھی جتنی اس عورت کے ساتھ آدھ گھنٹے کی بحث میں ہوجاتی تھی۔

شاید دماغ کی گرمی تھی جو اچھا بھلا خوشگوار موسم بھی لو برساتا محسوس ہو رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ڈیڑھ کلو مرغی کا گوشت' تازہ کھیرے' پودینے کی گٹھی اور کلو دہی لے کر میں لوٹا۔ وہ صفائی والی ماسی پہ اپنی علمیت جھاڑ رہی تھی۔

''تاجی' تجھے نہیں پتا' زمانہ کدھر جا رہا ہے۔ لوگوں کے اندر سے خوفِ خدا ختم ہوگیا ہے۔ دنیا تباہ ہو رہی ہے' سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔''

''ہیں باجی! تسی سچ آکھدے او؟'' آخر کار وہ اس غریب مسکین عورت کو خوف زدہ کرنے میں بھی کامیاب ہوگئی۔ (زور کس پہ ہوا ''بھی'' پر۔)

''تو اور کیا۔ تجھے بھلا ان باتوں کا کیا پتا۔ تو ٹھہری سارا دن گھر گھر کام کرنے والی سیدھی سادی گنوار عورت۔ تجھے تو اخبار بھی پڑھنا نہیں آتا۔''

''تو باجی! آپ کو اخبار سے ساری باتیں پتا چلتی ہیں؟ یہ قیامت والی بھی۔'' اس کے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''نہیں تاجی! یہ اخبار وں والے ...... ہونہہ! انہیں ''ککھ'' پتا نہیں۔'' اس نے ٹیڑھی نظر سے مجھے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر کہا۔ مجھے تاؤ آ گیا۔

''تاجی! یہ سیڑھیوں کی صفائی کیوں نہیں کی اب تک۔ بارہ بج رہے ہیں اور تمہاری گپ شپ ہی ختم نہیں ہو رہی۔''

''بس صاحب جی! کرنے لگی تھی۔ ذرا باجی سے بات کرنے لگ گئی۔''

''تمہاری باجی کو تو اللہ موقع دے باتوں کا۔ تم کیوں اس کی باتوں میں آکر اپنے کام میں کوتاہی کرتی ہو۔''

''لو صاحب جی! باجی تو اتنی سیانی باتیں کرتی ہے۔ بندہ پاس بیٹھتا ہے تو کُچ سیکھتا

ہی ہے۔ مجھے کیا خبر' دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ باجی کا اللہ بھلا کرے' مجھے ہر روز نئی بات بتا دیتی ہیں۔ مجھ جاہل کو بھی اب زمانے کی خبر ہوگئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں صاحب جی! آپ بھی اپنی بیگم کے پاس بیٹھ کر چار باتیں علم والی سیکھ لیا کرو۔''

اس مشورے پہ مجھے جتنا غصہ آتا کم تھا۔ میں ......یعنی کہ میں ...... ریحان علی فلک...... ملک کا مشہور دانشور' کامیاب صحافی' ہر دل عزیز شاعر اور جانا مانا افسانہ نگار...... اس دو من کی عورت سے علم حاصل کروں جس کا علم لان کے ''ٹوٹوں'' اور دیسی گھی کے ''تڑکے'' تک محدود تھا۔ میں نے ٹھوکر سے سیڑھی پہ رکھا پام کے پودے کا گملا گرا دیا۔

''ہائے توبہ...... باجی! تیرا بندہ تو بڑا ''ڈاڈا'' (سخت) ہے۔'' تاجی نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ میں دیکھے بغیر بھی بتا سکتا تھا کہ میری بیوی نے اپنے بارہ بیگھے کے چہرے کے تمام طول و عرض میں کمال درجے کی مظلومیت اور لاچاری بھر لی ہوگی۔ شاید اپنے جارجٹ کے پرانے دوپٹے کے اکڑے ہوئے پلو سے رگڑ رگڑ کر اپنے ڈیلے سے چند آنسو بھی ٹپکا لیے ہوں۔ (اوہو' میرا مطلب ہے آنکھ سے ...... لاحول ولا ......ڈیلا...... یہ عورت میری زبان و بیان پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے)

''کیا کروں بہن۔'' اس نے ہمدردی پا کر جھٹ اسے بہن بنا ڈالا۔ ''مرد ذات ہے' سارا کچھ جائز ہے بھئی' ہائے بیچاری عورت۔''

اب اپنی قابل رشک یادداشت میں سے وہ عورت کی مظلومیت اور مرد کی حاکمیت کے ایسے ایسے دل خراش اور عبرت ناک قصے سنانے والی تھی کہ تاجی تو بلکنے لگ ہی جاتی۔ شاید میں بھی دھاڑیں مارنے لگ جاتا' اس لیے میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور غسل فرمانے تشریف لے گیا۔

ایک پبلشر جو میرا پرانا واقف کار تھا۔ میرے روزانہ چھپنے والے کالموں کے انتخاب کو کتابی شکل دینا چاہتا تھا۔ اسی سلسلے میں' میں نے اسے گھر مدعو کیا تھا۔ اس کے آنے کے بعد میں نیچے اترا اور دو گھنٹے تک ڈرائنگ روم میں مذاکرات ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ کھانا لگنے کی اطلاع مل گئی۔

ٹیبل پہ پہنچ کر نئے سرے سے میرا خون کھول اٹھا۔ آج اس نے پلاؤ پہ عمل درآمد تو کر لیا تھا مگر اپنی پسند یعنی کڑھی سے بھی دستبردار نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت خوش رنگ خوشبو دار پلاؤ کے ساتھ کالے زیرے کے بگھار والی پیلی پیلی گاڑھی کڑھی کا لبالب بھرا ڈونگا بھی پوری شان اور طمطراق کے ساتھ براجمان تھا۔ اسی پہ بس نہ کرتے ہوئے اس نے

بڑے ہی فخریہ انداز میں مٹی کی چھوٹی سی ہانڈی بھی لاکر درمیان میں رکھ دی جس میں دیسی گھی کے تڑکے والا بینگن کا بھرتا بہاریں دکھا رہا تھا۔

اس عجیب وغریب مینیو والے لنچ کی وجہ سے میں نے اپنے معزز مہمان کے سامنے سخت شرمندگی محسوس کی۔ اس میں شک نہیں کہ آرزو کھانا ٹھیک ٹھاک بنا لیتی ہے اور یقیناً اس وقت ٹیبل پہ موجود تینوں پکوان ذائقے کے لحاظ سے اپنی اپنی جگہ لاجواب ہوں گے مگر اچھا پکا لینا ایک الگ بات ہے اور اچھی طرح پیش کرنا ایک سراسر الگ بات۔ اتنے سالوں میں کچن کو مورچہ بنا کر وہ مسالوں کے صحیح تناسب اور ذائقے کے بارے میں بے شک جان چکی ہے مگر اتنے عرصے سے جو میں اسے سکھانے کی کوشش کر رہا ہوں' وہ سیکھنے پہ راضی نہیں۔ کیا چیز پکانی چاہئے' کس ڈش کے ساتھ کون سے ڈش پیش کرنی چاہئے۔ کس مہمان کے لیے کیسا کھانا پکانا چاہئے۔

اب آپ ہی بتایئے۔ کوئی شریف انسان مرغ پلاؤ پہ کڑھی انڈیل کر یا بھرتہ ڈال کر کھا سکتا ہے۔"

میں شاعر اس لیے نہیں بنا کہ مجھے شاعری کرنا آتی تھی بلکہ اس لیے کہ میں سوائے شاعر کے اور کچھ بن ہی نہیں سکتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ میں شاعر بنا نہیں بلکہ بنا بنایا اس دنیا میں آیا۔

مجھے حسن' نزاکت اور نفاست ہمیشہ سے اپنی جانب کھینچتے تھے۔ چاہے وہ حسن کسی دلکش چہرے کا ہو یا کسی حساس دل کا ...... چاہے وہ نزاکت کسی دلربا کی اداؤں میں ہو یا کسی خوبصورت خیال میں ...... چاہے وہ نفاست کسی کی عادتوں میں موجود ہو یا میرے ارد گرد کے ماحول میں...... میری یہ حسن پرستی اور نفاست پسندی مجھے تنہا کرتی گئی۔

میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ تین بھائیوں اور دو بہنوں کے بالکل درمیان میں۔ میرے والد ایک سیدھے سادے دکاندار ٹائپ آدمی تھے۔ تعلیم اس حد تک تھی کہ دکان کا سودا اور ادھار والوں کا حساب کتاب لکھ لیتے تھے۔ تینوں بھائیوں میں سے کوئی میٹرک سے آگے نہ بڑھا کیونکہ آگے بڑھنے کے لیے میٹرک پاس کرنا ضروری ہوتا ہے اور وہ ان تینوں میں سے کوئی نہ کر سکا۔

والدہ بچپن میں ہی گزر گئیں۔ (میرا مطلب ہے' میرے بچپن میں' تین میں سے دو بھائیوں نے ابا کی زندگی میں ہی اپنا اپنا حصہ لے کر الگ بزنس شروع کر دیا۔ (دکانداری ان کے نزدیک بزنس ہی تھی) ایک نے جوتوں کی دکان ڈالی۔ دوسرے نے ابا کی دیکھا

دیکھی جنرل اسٹور کھولا۔ دونوں شادی بھی کر چکے تھے۔ خیر سے دونوں کی بیویاں جہالت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ تیسرے بھائی نے دبئی کا ٹکٹ کٹایا اور پھر ہو گیا۔ تینوں جلد ہی اپنی زندگی میں سیٹ ہو گئے۔ بڑے کی جوتیاں خوب چلنے لگیں اور جوتی کے زور پہ ہی اس نے اپنا مکان بھی خرید لیا۔ اب وہ ہفتے کے ہفتے آتا اور اس کی گہری سانولی بیوی پیلے پیلے سونے کے وضع موٹے کڑے لہراتے ہوئے نئی نئی سیکھی اردو بولنے کی کوشش کرتی۔

دوسرے کو غیرت آئی۔ اس نے بھی ملاوٹ' ذخیرہ اندوزی اور دو نمبر مال کے سہارے اپنا جنرل اسٹور وسیع کر لیا۔ اب اس میں آئس کریم والی مشین' فوٹو اسٹیٹ مشین اور پی سی او کا اضافہ بھی تھا۔ اس کی بیوی کی رنگت بے حد سفید تھی۔ وہ کشمیرن کیوں پیچھے رہتی سونے کی نمائش سے۔ سو اس کے موٹے موٹے بازوؤں کی چربی بھی سونے کی چوڑیوں میں پھنس یا دھنس گئی۔

دبئی والے نے وہاں ایک پاکستانی فیملی کی بیوہ سے شادی کر لی اور دونوں بڑے بھائیوں کی ترقی کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اسکے ڈرافٹ دونوں بہنوں کو شان سے بیاہ گئے۔ ابا جی سکون سے وفات پا گئے۔

صرف میں رہ گیا جو "اپ سیٹ" تھا۔ دراصل نہ میری تعلیم مکمل ہوئی' نہ شادی اب تک ہو سکی تھی' نہ ہی میری جوتوں یا نمک' مرچ' دالوں کی دکان زوروں پہ تھی۔ نتیجتاً میں ان کی نظروں میں ابھی تک سیٹ نہ ہو سکا تھا۔ بھابیاں اپنی بہنیں میرے سر منڈھنے لگیں۔ بڑی بھابھی کی ان سے بھی کالی بہن' چھوٹی بھابھی کی ان سے بھی موٹی بہن ......شکر ہے دبئی والی بھابھی کی کوئی بہن نہ تھی' ورنہ وہ ان سے بھی زیادہ بیوہ......لاحول ولا ...... میں بھی کس بے مقصد تمہید میں الجھ بیٹھا۔ سب اس عورت کی پندرہ سالہ رفاقت کا نتیجہ ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا' دونوں بھابھیوں کی بہنوں سے بمشکل اپنا بچاؤ کرتے ہوئے میں ان دنوں دو دو محاذوں پہ بیک وقت ڈٹا ہوا تھا۔ ایک محاذ تو اردو ایم اے کا تھا' دوسرا عشق کا۔ مجھے ڈگری یافتہ کہلانے کا شوق تھا لیکن یہ شوق صرف ایم اے اردو کی ڈگری لے کر ہی پورا ہو سکتا تھا جس کی ہمارے معاشرے میں گئی گزری سی حیثیت ہے اور یہ ڈگری اگر کسی ایسے "مرد" کے ہاتھ میں ہو جو اس کے بل بوتے۔ یہ ملازمت حاصل کرنے کا خواہش مند ہو تو یہ حیثیت گئی گزری بھی نہیں ہوتی۔

یہی وجہ تھی کہ پنجاب یونیورسٹی کے اردو ڈپارٹمنٹ میں میرے علاوہ بس دو ہی اور

لڑکے تھے اور ہم تینوں ڈیڑھ درجن لڑکیوں کے جھرمٹ میں جھینپے جھینپے ذرا حواس باختہ رہے۔ (ویسے آپ اس ''جھرمٹ'' لفظ کو ''نرغے'' میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔)

اور ان میں سے ایک لڑکی ایسی بھی تھی جسے سامنے پاکے میں معمول سے زیادہ جھینپا اور حواس باختہ لگا کرتا۔ وہ لڑکی تھی غزالہ درخشاں غزل...... غزل اس کا تخلص تھا۔ اپنے ڈپارٹمنٹ کے ادبی مجلّہ میں اس کی غزلیں چھپتی رہتی تھیں جو سراسر میری مہربانی تھی کیونکہ میں اس زمانے میں اس مجلّہ کا ایڈیٹر تھا اور شاعری کے افق پہ میرا نام دھیرے دھیرے نمایاں ہورہا تھا۔ میں کئی مشاعروں میں شرکت کیا کرتا تھا۔ کالج کے بعد اب یہاں بھی لوگ مجھے ایک شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ پہلے پہل وہ بھی اپنی ایک غزل کی تصحیح کے لیے میرے پاس آئی تھی اور میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی اس کو کن اکھیوں سے کئی بار دیکھ چکا تھا مگر اتنے قریب سے اس کی جلوہ آرائی سے میرا عاشق مزاج اور حسن پرست دل حد درجہ متاثر ہورہا تھا۔ وہ اسم بامسمٰی تھی...... سراپا غزل تھی۔

اس کی بڑی بڑی حیران اور روشن آنکھیں' ان پہ سایہ فگن گھنیری خم دار پلکیں۔ سونے کی سی چمک لیے صاف گندمی رنگت جو صحت مندی کا گلال رخساروں اور نازک سے لبوں پہ لیے ہوئے تھی۔ اسکی آواز بھی بے حد کومل اور سریلی تھی۔۔ جب وہ اپنی نوآموز غزل کے کچے پکے شعر اس سحرانگیز آواز میں سناتی تو سننے والے کا دھیان قافیہ اور ردیف کی کمزوریوں کی طرف جاتا ہی نہیں تھا۔ دھیان میں رکھنے کے لیے اور بہت کچھ تھا۔ اس کے نرم و نازک مصورانہ سے ہاتھ' مخروطی انگلیاں' پاکیزہ کی مینا کماری سے بھی زیادہ حسین پاؤں۔ صراحی دار گردن' گھنگھریالے شانوں سے بس ذرا سا نیچے آتے گہرے بھورے بال جو ریشم کے سنہری گچھوں کی صورت بکھرے رہتے۔ اس کی زلفوں کا پریشان رہنا اسے ایک مکمل شاعرہ کے طور پہ پیش کرتا تھا۔

اس کی باتیں بھی شاعرانہ ہی ہوتیں' دیگر لڑکیوں کی طرح اس کی گفتگو فیشن' شاپنگ اور ٹی وی پروگرامز تک ہی محدود نہیں رہتی تھی بلکہ وہ نامور مصنفین کی عالمانہ کتابوں پہ سیر حاصل تبصرے کیا کرتی۔ موسم کی رنگینی اور لطافت کے قصیدے انتہائی دلفریب انداز میں پڑھا کرتی۔ بے حد حساس شاعری اپنے مفرد لوچ دار لب و لہجہ میں یوں سنایا کرتی کہ جن شعراء کا وہ کلام ہوتا وہ اگر سن لیتے تو غزالہ کے نام منسوب کردیتے۔

نہ صرف ادب اور گفتگو بلکہ لباس کے معاملے میں بھی اس کا ذوق قابل تحسین تھا۔

وہ موسم کی مناسبت سے رنگوں اور فیشن کے لحاظ سے اسٹائل کا انتخاب کیا کرتی۔ ہر رنگ اس پہ کھل اٹھتا تھا۔ ہماری دوستی جلد ہی محبت کے مرحلے طے کرنے لگی۔ ہم دونوں کی شاعری میں ہی درد اور بھی زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ شاید یہ ہمارے عشق کا اعجاز تھا۔ ادھر ہمارے ایگزامز ہونے والے تھے۔ ادھر میرے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت آخری مراحل میں تھی کہ اچانک غزالہ نے اپنی غزالی آنکھوں میں آنسو بھر کے' اپنی کھنکتی آواز میں سوز بھر کے مجھے یہ منحوس خبر دی کہ اس کا رشتہ اس کے فرسٹ کزن سے طے ہوگیا ہے جو ناروے میں جاب کرتا ہے۔ یہ خبر مجھ پہ بجلی بن کر گری' میں اس کے آگے گڑگڑا اٹھا۔

''تم کو میری محبت کا واسطہ' بغاوت کر ڈالو' ہار مت مانو ظالم سماج کے سامنے۔ مجھے یہ جدائی ہرگز منظور نہیں۔ نہیں...... نہیں...... نہیں۔'' میں نے اپنے تازہ ترین افسانے کے ڈائیلاگ سر پٹخ پٹخ کے دہرائے۔

''اور مجھے اپنی پاکیزہ محبت کی یہ رسوائی ہرگز منظور نہیں۔ نہیں...... نہیں...... نہیں۔'' اس نے شبنم کی تازہ ترین فلم سے متاثر ہوکر عالمِ نزع والی ہچکیاں لیں۔

''میں ایک مشرقی لڑکی ہوں ریحان!'' دوپٹے کا پلو مروڑتے ہوئے خوابناک لہجے میں کہتی اب وہ شمیم آرا بنی ہوئی تھی۔

''میں اپنے والدین کے سامنے تمہارا نام کیسے لے سکتی ہوں۔ مجھے ان کی عزت بھی عزیز ہے۔ میں اپنا پیار قربان کرسکتی ہوں مگر ان کی عزت پہ حرف نہ آنے دوں گی۔'' اس نے بابرہ شریف کی طرح پرعزم لہجے میں کہا۔

(ان دنوں یہی مقبول اداکارائیں تھیں' کاش ہماری محبت آج کے دور میں پروان چڑھی ہوتی اور وہ ریما کی طرح گرج کے اعلان کرتی،

تیری آن...... لیپٹا پالے...... تیری آن......''

یا صائمہ کی طرح گنڈاسہ اٹھالیتی۔

''رب دی سوں' کڑی پنجابن تیری اے دلدارا۔''

ایسا کیسے ہوسکتا تھا' وہ اسّی کی دہائی کے آخری سال تھے۔ محبت میں تڑپ ضرور تھی مگر عشق ابھی اندھا نہ ہوا تھا۔ اسے ماں کے جوتے اور باپ کے ڈنڈے بند آنکھوں سے بھی بخوبی نظر آجاتے تھے۔

''میں تم پہ الزام نہ آنے دوں گا۔ اپنی بھابھیوں کو رشتہ لینے تمہارے گھر بھیجتا ہوں۔'' میں نے ایک اور شریفانہ کوشش کی۔

''مجھے صرف اپنے والدین کی ہی نہیں، تمہاری عزت بھی پیاری ہے۔ برا مت ماننا مگر تم کس بل بوتے پہ میرا رشتہ مانگو گے۔ تمہارے پاس نہ تو ملازمت ہے، نہ ہی جائیداد۔ میری خالہ کا بیٹا انجینئر ہے، ناروے میں ایک اعلا فرم میں ملازم ہے۔ میرے گھر والے اس کے مقابلے میں کبھی تمہارا رشتہ قبول نہیں کریں گے۔ وہ تمہاری بے عزتی کریں گے اور یہ میں برداشت نہ کرسکوں گی۔ میں زہر کھالوں گی۔''

''نہیں، تم زہر مت کھانا۔ میں تمہاری منگنی کے لڈو کھالیتا ہوں۔'' میں نے گلوگیر لہجے میں دل کڑا کر کے کہا اور لرزتے ہاتھوں سے اس کی گود میں رکھے ڈبے سے لڈو اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ منہ میں میٹھا میٹھا لڈو...... آنکھوں میں نمکین آنسو...... واہ کیا رومانوی منظر تھا۔ اسی رات میں نے اپنی سب سے مقبول اور زبان زد عام ہوجانے والی نظم کہی۔

غزالہ اس روز کے بعد یونیورسٹی نہیں آئی۔ وہ امتحان بھی نہیں دے رہی تھی۔

''میں یہاں کیسے آسکتی ہوں، جہاں کے چپے چپے سے ہماری محبت کی یادیں وابستہ ہیں۔ ویسے بھی تعلیم تو کیا، اب مجھے زندگی سے بھی دلچسپی نہیں رہی۔ بس جی رہے ہیں۔'' اس نے سرد آہ بھری اور آخری بار بھری۔ خدانخواستہ میرا مطلب یہ نہیں کہ اس آہ کے بعد اس کا دم نکل گیا، بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے نکل گئی۔ میری شاعری کو ہجر کا درد، میرے افسانوں کو جدائی کا غم دے کر۔

اس کے جانے کے تین دن بعد ہی اس کی ایک دوست نے بے حد دل جلے انداز میں مجھ پہ انکشاف کیا۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں، اس کی شادی زبردستی ہورہی ہے۔ وہ ایسی لڑکی نہیں کہ کوئی بھی اس کے ساتھ زبردستی کرسکے۔ اس کے اس کزن کے ساتھ اس کی منگنی آج سے پانچ سال پہلے ہوئی تھی اور اس میں غزالہ کی مکمل پسند اور رضامندی شامل تھی بلکہ کالج کے دنوں میں وہ کلاسز چھوڑ کر اس سے ملنے جایا کرتی تھی۔ وہ تو اس کا منگیتر اپنی جاب کے سلسلے میں بیرون ملک چلا گیا تو بوریت کے مارے...... اور کچھ اپنی شاعری چھپوانے کے شوق میں وہ آپ سے دوستی کربیٹھی۔''

اس نے مجھے استعمال کیا تھا، میری محبت کا مذاق اڑایا تھا اور مجھ سے بے وفائی کی تھی۔ اس بات پہ پہلے تو میں اتنا دکھی ہوا کہ غزالہ کی اس ''بھانڈہ پھوڑ'' قسم کی دوست کے کیڑا لگے دانتوں اور مہاسوں بھرے رخساروں کی تعریف کربیٹھا۔ پھر اتنا شدید غصہ آیا کہ مارے غصے کے اسے ''آئی لو یو'' تک کہہ دیا۔

شکر ہے اور ہزار ہزار...... لاکھ کروڑ دفعہ شکر ہے کہ نہ میں زیادہ دیر تک دکھی رہا، نہ غصہ میں رہا۔ ورنہ نجانے اور کتنی بار اس کی تعریف کرنی پڑتی، کتنی بار اسے ''آئی لو یو'' کہنا پڑتا۔ میں نے آنھیں پھیر لیں۔

میرا رزلٹ آگیا تھا۔ ایم اے کا بھی اور پہلی کتاب کا بھی۔ کامیابی دونوں جانب سے ملی تھی۔ اگلے دو چار سال میں نے ادب کے میدان میں اپنی جگہ بنانے میں گزار دیے۔ ابتدا میں ماہانہ شائع ہونے والے ڈائجسٹوں میں قسط وار لمبے لمبے ناول لکھے پھر ادبی ساکھ والے رسائل میں بھی جگہ ملی۔ ابھی پہلے شعری مجموعے کی گونج ختم نہ ہوئی تھی کہ دوسرا چھپ کر آگیا۔ اور دھڑا دھڑ بکنے لگا۔ اب مجھ پہ سے کم از کم بے کار اور بے روزگار انسان کی چھاپ اتر گئی۔ یعنی ہر زاویے سے میں اب ایک ''لائق بیاہ'' نوجوان تھا مگر بھابھیوں کی بہنیں ٹھکانے لگ چکی تھیں۔ ایسے میں میری رشتے کی خالہ، آپاں صغراں آگے آئیں۔ دو مہینے میں میرے لیے آٹھ رشتے لائیں۔ بھابیاں تو پہلے پہ ہی راضی تھیں۔ مجھے ہر کسی میں کوئی نہ کوئی اعتراض مل جاتا۔ کئی ایک بار تو تصویر دیکھنے کی نوبت تک نہ آتی۔ مجھے لڑکی کا نام یا اس کے والد محترم کا پیشہ ہی پسند نہ آتا۔

''اب میری یہ اوقات رہ گئی ہے کہ میں ملک کا ابھرتا ہوا نامور شاعر، ایک نوجوان، باصلاحیت افسانہ نگار ریحان علی فلک کسی قصائی کی دختر نیک اختر سے بیاہ رچالوں جو میرے ہر شعر کو اپنے باپ کی طرح ''ٹوکے'' کے وار سے ذبح کردیا کرے گی اور یہ دوسری والی...... لاحول ولا...... کیا غیر شاعرانہ نام ہے اختر صابری۔ لگتا ہے کسی قوال سے شادی کررہا ہوں۔''

نواں رشتہ لے کر آپاں آئیں تو میں نے صاف صاف کہہ دیا۔

''آپاں! میرے لیے ان مڈل پاس اور میٹرک فیل لڑکیوں کے رشتے مت لایا کریں۔ لڑکی بے شک متوسط طبقے کی ہو، بھلے غریب گھر کی ہو مگر گھرانہ سلجھا ہوا ہونا چاہئے۔ باپ چاہے سرکاری اسکول کا غریب ماسٹر ہی کیوں نہ ہو۔ لڑکی تعلیم یافتہ ہو، نرم مزاج، خوش ذوق، خوش گفتار اور مناسب حد تک خوش شکل بھی ہو۔'' اب پتا نہیں میری شرائط آپاں کی سمجھ میں آئیں یا نہیں۔ بہرحال انہوں نے کہا۔

''لڑکی پڑھی لکھی ہے چودھویں جماعت کا امتحان دیا ہے۔''

''بی اے کا، اچھا اور گھرانہ؟'' میں نے کچھ کچھ دلچسپی لی۔

''پیو تو ہے نہیں، ماں البتہ چٹی ان پڑھ ہے۔ ویسے نماز، قرآن پڑھا ہوا ہے۔ بڑی

عبادتن ہے۔''

مجھے لڑکی کی ماں کے اوصاف سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ چاہے وہ ''عبادتن'' ہوتی یا ''شوقن۔''

''دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔ وڈا بھائی پولیس میں کانٹیبل ہے، دوسرا ایک ڈاکٹر کا وہ ہے...... وہ نہیں ہوتا جو پڑیوں میں دوائیاں لپیٹ کر دیتا ہے۔''

''اچھا اچھا...... کمپاؤنڈر۔'' مجھے کوائف کسی حد تک تسلی بخش لگے، ورنہ اس سے پہلے جو رشتے آتے، ان لڑکیوں کے والد حضرات یا قصائی ہوتے یا درزی۔ بھائی صاحبان بھی رکشہ ڈرائیور، سبزی فروش ہوتے تھے۔ مجھے ان کے پیشوں پہ اعتراض نہ تھا، نہ ہی ان کے اس روزگار کو برا سمجھتا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ میری خواہش تھی میری بیوی نہ صرف خود تعلیم یافتہ ہو بلکہ تعلیم یافتہ ماحول سے آئی ہو۔ چاہے اس کے بھائی یا باپ سرکاری افسر یا پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر نہ ہوں۔ معمولی پڑھے ہوں، سفید پوش ہوں۔

''نام آرزو ہے، گوری چٹی، اونچی لمبی، کالے سیاہ، لمبے بال، پاء پاء کی اکھ۔''

آپاں نے مزید کوائف گنوائے۔ لڑکی کا نام آرزو مجھے اس قدر پسند آیا کہ اس کی آنکھ پاء پاء کے بجائے رتی، تولہ یا ماشہ برابر بھی ہوتی تو منظور تھا۔ بعد میں میرے پوچھنے پہ آپاں یہ خبر بھی لائیں کہ بی اے میں اس کے مضامین کیا تھے۔

ایک تو اسلامیات، دوسرا...... کی کہتے ہیں...... ہاں...... لٹچر۔'' وہ ذہن پہ زور ڈال کر بولیں۔

''لٹچر......'' وہ ذہن پہ زور ڈال کر بولیں۔

''لٹچر...... یہ کونسا...... اوہ...... لٹریچر۔'' میں مسرور ہوا۔ (ضرور اردو یا انگلش لٹریچر پڑھتی ہوگی۔ واہ...... دینی تعلیم بھی اور ادبی تعلیم بھی۔ میرا گھر سنور جائے گا۔)

میں نے کرائے پہ فلیٹ حاصل کیا۔ قلم کی بدولت اتنا مل جاتا تھا کہ گزارا ہو جاتا تھا۔ مہنگائی ابھی اتنی نہیں بڑھی تھی پھر بھی میں نہیں چاہتا تھا کہ میں بھائیوں کے ساتھ رہوں اور ان کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر میری بیوی کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو۔ اپنا چھوٹا سا گھر میں نے اپنی محنت کی کمائی اور آرزو کے سادہ سے جہیز سے سجالیا۔ مجھے آج بھی اپنی اور آرزو کی پہلی ملاقات یاد ہے۔ (ضروری نہیں کہ صرف خوشگوار یادیں ہی حافظے پہ قابض رہیں۔ کبھی کبھی......)

وہ ہماری سہاگ رات تھی، عام سہاگ راتوں سے بے حد مختلف کیونکہ یہ ایک

رومانوی شاعر کی سہاگ رات تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ آرزو اپنے جہیز کے بیڈ پہ لال جوڑے میں لمبا سا گھونگھٹ نکالے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے بادامی رنگ کی شیروانی کی جیب تھپتھپائے انگوٹھی کی موجودگی کا اطمینان کیا جو میں نے اسے منہ دکھائی کے تحفے کے طور پر دینے کے لیے خریدی تھی۔ اگرچہ منہ تو میں دیکھ ہی چکا تھا تصویر میں۔ تصویر کا قصہ بھی عجیب ہے۔ میں نے آپاں سے اپنی متوقع زوجہ کی ایک عدد تصویر کی فرمائش کی۔ کچھ پس و پیش کے بعد وہ لانے پہ راضی ہوگئیں۔ تصویر آئی تو میں آنکھیں سکوڑ سکوڑ کر اس گروپ فوٹو کو دیکھنے لگا، جس میں کھڑی آٹھ نو لڑکیوں میں سے مجھے یہ دریافت کرنا تھا کہ ان میں آرزو کون سی ہے۔ آپاں کے انگلی رکھ کے بتانے پہ میں نے سکوڑی ہوئی آنکھوں کو مزید نچوڑا۔

''یہ جو پچھلی لائن میں ان دو بڑے منہ والی لڑکیوں کے درمیان کھڑی ہے۔''

اور وہ درمیان میں کھڑی نہیں تھی بلکہ پھنسی ہوئی تھی اور ان دو لڑکیوں کے صرف منہ ہی بڑے نہیں تھے، وہ خود بھی بہت بڑی تھیں۔ اگلی رو میں کھڑی چاروں لڑکیوں کی وجہ سے یہ بالکل پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ان کے شانوں کے اوپر سے گردن اونچی کر کے چہرہ دکھانے کی کوشش کرنے والی آرزو قد و قامت کی کیسی ہے۔ تصویر کے دھندلے رنگ سے اس کے چہرے اور بالوں کی رنگت کا اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ بس انسان کی بچی لگ رہی تھی۔ دوسری بار میں نے تاکید کر کے کلوز اپ میں تصویر بھجوانے کی فرمائش کی۔ اس بار جو تصویر آئی وہ واقعی کلوز اپ تھا مگر اس قدر کلوز سے لیا گیا تھا کہ پورا ماتھا اور آدھے ابرو تک فوکس میں آنے سے رہ گئے تھے۔ تھوڑی اور کان تک کٹے ہوئے تھے۔ آؤٹ آف فوکس ہونے کی وجہ سے اس تصویر میں بھی چہرہ دھندلا سا تھا۔ البتہ مجھے یہ تسلی ہوگئی کہ لڑکی کی رنگت صاف، آنکھیں بڑی بڑی اور کالی ہیں۔ ناک کچھ مشکوک سی لگ رہی تھی۔ پتہ نہیں واقعی اتنی پھیلی ہوئی تھی یا تصویر اوپر چڑھ کے کھینچی گئی تھی، اس لیے وزن کی وجہ سے بیٹھ گئی۔ گھونگھٹ اٹھاتے ہی سب سے پہلے ملے میں نے یہ اطمینان کیا۔ شکر ہے کہ ناک خاصی ستواں تھی۔ ہونٹ بھی نازک سے تھے۔ اب میں نے انگوٹھی اس کی نذر کرتے ہوئے ذرا افسوس نہ محسوس کیا۔

جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو
اے جانِ جہاں، یہ کوئی تم سا ہے کہ تم ہو

اس کا گدرایا ہوا سا نرم نرم ہاتھ تھام کر میں نے بڑے ہی لٹ جانے والے انداز

میں یہ شعر پڑھا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے حوصلہ بڑھایا تو اس کا ہاتھ اپنے سینے پہ رکھ کے میں نے دوسرا شعر سنانے میں کسی تکلف سے کام نہ لیا۔

اس دید کی ساعت میں کئی رنگ ہیں لرزاں
میں ہوں کہ کوئی اور ہے، دنیا ہے کہ تم ہو

''جی یہ میں ہوں، آرزو۔'' اس نے کچھ الجھ کے...... یقین دلانے والے انداز میں وضاحت دی۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ شاعری کے معاملے میں اِس کی کم فہمی پہ بھی اور اس کی کھردری کرخت آواز...... بے لوچ اور قدرے دیہاتی لب و لہجے کو سن کر بھی۔ بمشکل مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے خود کو یہ کہہ کر بہلایا کہ اتنا مکمل تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ آواز سے مار کھاتی ہے تو کیا ہوا، صورت شکل تو لاکھوں میں ایک ہے۔

''میں جانتا ہوں تم آرزو ہو، میری آرزو...... بلکہ میری تمام تر آرزوؤں کی تعبیر ہو۔ یہ تو میں نے تمہارے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اشعار کہے ہیں۔''

''میں بھی آپ کو شعر سناؤں۔''

''زہے نصیب۔'' میں کھل اٹھا۔

''عرض کیا ہے۔

مقدر میں لکھے تھے تم اسی سال
میں اڈی ڈی جاواں ہوا دے نال

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ ہر لحاظ سے سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ میرے منہ کھول کر دیکھتے رہنے کو وہ شاید داد دینے کی کوئی ادا سمجھی۔ اپنا بھاری آنچل درست کرتے ہوئے پھر سے گویا ہوئی۔

تمہیں پاکر میرا ہوا ہے وہ حال
تے بھیگ گئے کنڈلاں والے بال

میں سمجھ گیا کہ آپاں نے ایک گہری سازش کے ذریعے مجھ سے میرے بزرگوں کا کوئی بدلہ لیا ہے۔ سلگتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

''کیا تم نے واقعی بی اے کے پرچے دیے ہیں۔''

''ہاں جی۔'' اس نے مٹکا سا سر ہلایا۔

''کیا تمہیں یقین ہے، وہ بی اے کے پرچے ہی تھے۔'' میں نے دہرایا۔

''ہاں جی! کوئی پہلی دفعہ دیے ہیں جو پتہ نہ چلتا۔ دو سال سے دے رہی ہوں۔''

''کیا؟'' میں بھونچکا گیا۔

''بی اے کے پرچے اور کیا۔''

''اور ایف اے......؟''

''ہائے نہ پوچھیں جی! اس کے مکمل پرچے تو تین سال تک دیے تھے، چوتھے سال کمپارٹ کی وجہ سے انگلش اور مطالعہ پاکستان کے بھی دینے پڑے۔ ہاں دسویں میں نے ''سوکھی'' (آسان) کرلی تھی۔ پہلی بار رہ گئی تھی پانچ پرچوں میں، لیکن دوسری بار صرف انگلش اور حساب کے پرچے دوبارہ دینے پڑے، لیکن میں نے کہہ دیا ہے جی! اب رزلٹ آیا تو چاہے کمپارٹ آئے لیکن میں نے کوئی دوبارہ پرچہ نہیں دینا۔'' وہ چند گھنٹے پرانی دلہن کمال بے تکلفی سے اپنا شاندار تعلیمی ریکارڈ سنانے کے بعد اب کندھے ہلا ہلا کر لاڈ کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''سنا ہے تم نے بی اے میں اسلامیات اور لٹریچر رکھا ہوا تھا انگلش لٹریچر، یا اردو......''

''پنجابی لٹریچر، اس میں، میں بڑی تیز ہوں۔ ایک تو یہ ویسے ہی میٹھی زبان دوسرا میری ماں بولی۔ اور تیسری بات آسان بھی ہے۔ آج تک اس میں فیل بھی نہیں ہوئی۔ ایف اے میں بھی ہر دفعہ پنجابی میں ہی زیادہ نمبر آئے۔'' اب مجھے اس کے لہجے میں جھلک مارتے ملتانی اور سرائیکی انداز کا راز معلوم ہوا۔

اگلے کئی دن اس کی ہمہ صفت شخصیت کے نت نئے پہلو مجھ پر آشکار ہوتے رہے اور میں مایوسی کا شکار ہوتا گیا۔ تعلیم نے اس کا کچھ نہ سنوارا تھا بلکہ وہ تو تین تین سال ایک ہی کلاس میں لگا کر تعلیم کا بہت کچھ بگاڑ چکی تھی۔ بلا کی باتونی تھی۔ اس کا اندازہ پہلی رات کو ہی اس کے بلا تکان بولنے سے ہو گیا تھا۔ جلد ہی یہ بھی پتا چل گیا کہ اسے دوسروں کی سننے سے زیادہ اپنی کہنے سے دلچسپی ہے۔ وہ اتنی گھریلو اور سگھڑ نہیں تھی جتنا کہ ظاہر کرتی تھی۔ تین چار گھنٹے کچن میں نبرد آزمائی کرنے کے بعد وہ کھانا تو ٹرے میں سلیقے سے سجا کر لے آتی جو بلاشبہ لذیذ بھی ہوتا تھا، مگر اتنے میں کچن کا حشر برا ہو چکا ہوتا۔ نمک مرچوں کے ڈبوں کے ڈھکن الگ، پڑے ہوتے، گھی کا ڈبہ کھلا پڑا ہوتا۔ سالن بھی بغیر ڈھکے چھوڑ آتی۔ گندے برتنوں کا ایک ڈھیر سنک میں اور سبزیوں کے چھلکوں کا انبار فرش پر لگا ہوتا۔ انڈے بناتے ہوئے بھی چھلکے وہ بلا تکلف پیچھے کی جانب بغیر دیکھے پھینک دیا کرتی تھی چاہے وہ کسی کی ناک پہ جا لگیں، دودھ کی دیگچی میں جا گریں یا پانی کے بھرے جگ میں

تیرنے لگ جائیں۔خوب دبا کے کھانے کے بعد وہ برتن اٹھا [illegible] سوجانے کی عادی تھی۔کھانے میں شاید نیند یا نشے کی کوئی ایسی دوا شامل ہوتی تھی جو صرف اس پر اثر کرتی تھی۔

سب سے زیادہ جو چیز میرے لیے تکلیف دہ تھی، وہ یہ کہ وہ میرے علم اور میرے فن کا احترام نہیں کرتی تھی۔اسے میری شہرت کی قدر نہ تھی۔میرے لکھنے کے اوقات میں کبھی اس نے مجھے ذہنی یکسوئی یا سکون مہیا کرنے کی کوشش نہ کی۔تب میرا کرائے کا فلیٹ بھی دو کمروں پہ مشتمل تھا۔ایک ہمارا بیڈروم، دوسرا لاؤنج یا ڈرائنگ روم، اس مختصر سے فلیٹ میں، میں اگر اس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو بھی ناکام رہتا۔اگر میں اپنے بیڈ پہ بیٹھ کے لکھتا۔(کہ بیڈروم اس قدر تنگ تھا کہ کرسی میز رکھنے کی جگہ ہی نہ تھی) تو اسے بھی آرام کرنا یاد آجاتا اور وہ اس قدر کروٹیں بدلتی، ٹانگیں جھلائی کہ مجھ سے تحریر کرنا دشوار ہوجاتا۔اگر دوسرے کمرے میں پناہ لیتا تو تب آرزو بیگم کی رگ موسیقی پھڑک جاتی۔وہ آکر ٹی وی یا ٹیپ ریکارڈر آن کردیتی، پورا کمرہ نور جہاں کی آواز کی دہشت سے تھرا اٹھتا۔

میں دل تیرے قدماں وچ رکھیا
تو جاکے دکھاتے سہی
تو پیراتے پاتے سہی

اور میں اس کی دھمکی میں آجاتا، جاکے دکھا نہ پاتا

''سن سن بھابی ڈھول پیا وجدا
نی ڈھول نہ وجے تے میلہ ذرا مئین سجدا

اس کے ڈھول کی ڈھما ڈھم میرے اس افسانے میں بھی اتر آتی، جس میں میں ہیرو ہیروئن کا ملن پیرس کے دریائے سین کے روشنیوں میں ڈوبے ساحل پہ کرارہا ہوتا...... دریائے سین کا پرجوش نیلگوں پانی سرسوں کے پیلے پیلے کھیتوں میں بدل جاتا۔پیانو پہ تھرکتی ہیرو کی انگلیاں ہوا میں پیچ لڑانے لگتیں اور خوبصورت نازک اندام فرانسیسی حسینہ لاچے کرتے میں کڈکڑے لگانے لگتی۔

دوروں دوروں اکھیاں مارے
منڈا پٹواری دا

''خدا کا واسطہ ہے آرزو! اپنے اس بھونپو کو لے کر یہاں سے دفعان ہوجاؤ۔''

[illegible] سرہوتے دیکھ کر بال نوچ ڈالے تھے۔

''ہائے، ہائے چٹا جھاٹا (سفید بال) ہیں، اس طرح تو نہ دونوں ہاتھوں سے پٹو (نوچو) لومیں جارہی ہوں بنیرے پہ۔آپ آرام سے صفحے کالے کرو۔''

جب وہ میرے لکھنے کو صفحے کالے کرنے کا نام دیتی تو میرا خون کھول کے رہ جاتا۔

جب وہ ہماری اچھی بھلی بالکونی کو ''بنیرا'' قرار دیتی، میرا کھولتا ہوا خون...... ظاہر ہے مزید کھولنے کے علاوہ اور کیا کرسکتا تھا۔

مجھے خدشہ تھا کہ علم وفن سے اتنی بے بہرہ، ادب سے اس قدر نا آشنا، بدذوق وبد شوق قسم کی بیوی کی رفاقت میں میرے قلم کو گھن لگ سکتا ہے، لیکن حیرت انگیز طور پہ میری تحریر میں مزید نکھار پیدا ہوا۔شاید یہ دکھ کا اعجاز تھا۔من پسند رفیق میسر نہ آنے کا دکھ۔ایک ہم ذوق ساتھی سے محرومی کا دکھ۔سارے دن کی تلخی میں راتوں کو جاگ جاگ کر صفحے کالے کرکے نکالتا۔

شادی کے پانچ سال میں دوشہرۂ آفاق ناولز، تین شعری مجموعے، ایک بیٹی اور ایک بیٹا میری قابل ذکر تخلیقات تھیں۔اخبار کی جاب نے میرے مستقل روزگار کا بندوبست بھی کردیا۔معاشی حالات بھی سدھر گئے۔اس دو کمروں کے فلیٹ سے نکل کر میں ایک نسبتاً بڑے کرائے کے مکان میں شفٹ ہوگیا۔ایک نئی ہاؤسنگ اسکیم میں نہایت سستا پلاٹ بھی لے لیا۔اگلے کچھ سالوں میں میں نے اس کی تعمیر کا کام بھی شروع کردیا۔اور دو سال پہلے ہی میں اپنے اس گھر میں شفٹ ہوا تو پچھلے بیس سالوں کی تھکان پل بھر میں زائل ہوگئی۔ایسا لگا جیسے آج میں اپنے بچوں کے لیے کچھ کرپایا ہوں۔اللہ نے مجھے بہت ذہین وفطین سلجھے ہوئے خوبصورت بچوں سے نوازا تھا۔خصوصاً میری بیٹی جاناں...... اس کی ذہانت سے بھرپور چمکتی آنکھوں کو دیکھ کر میرا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔اس کم عمری میں اس کی سلجھی ہوئی دانشورانہ گفتگو سن کر میرے حوصلے جوان ہوجاتے تھے۔میری امید بندھنے لگتی تھی کہ وہ ضرور مستقبل میں میرا نام روشن کرے گی۔

آج اپنی جدوجہد کے بیس سال اور شادی کے پندرہ سال بعد اپنی زندگی پہ نظر دوڑاتا تو بظاہر کسی چیز کی کمی نظر نہیں آتی۔زندگی نے لیا کم، دیا زیادہ تھا۔اس کے باوجود ایک تشنگی سی تھی جو نہ دل سے نکلتی تھی نہ روح سے۔ایک ادھورے پن کا احساس تھا جو کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتا ہی جارہا تھا۔اپنے دوستوں کو اپنی اپنی شریک حیات کے ساتھ مگن ومطمئن دیکھتا تھا تو کڑھ کے رہ جاتا تھا۔شادی جیسے اہم اور نازک معاملے

کی ساری ذمہ داری آپاں صغراں جیسی خاتون کے سر ڈال دینے والی اپنی حماقات میں آج تک معاف نہیں کرسکا۔ یہ وہی تھیں جن کی وجہ سے ملک کے ایک عظیم دانشور، نامور مصنف، فکر انگیز کالم نویس، شہرت یافتہ صحافی، حساس اور شاعر اور قابل سقدر ادیب کے نصیب میں آرزو جیسی علم و ادب سے بے بہرہ، حسنِ ذوق سے کوری اور انتہائی بے ڈھب و بے اطوار خاتون آئی۔

***

''سر! یہ ادبی نشست والوں کی جانب سے دعوت نامہ آیا ہے۔ کسی شعری مجموعے کی تقریب رونمائی ہے۔ آپ کو مہمان خصوصی بنانے کی درخواست بھی کی گئی ہے۔''

میرے اسسٹنٹ نے مجھے مطلع کیا۔ مہمان خصوصی بننے کا چسکہ بہت تھا مجھے اور اس چسکے کو پورا کرنے کے لیے مجھے بے کارترین کتابوں پہ بھی دیباچے لکھنے کو کہے جاتے یا مقالے پڑھنے کی درخواست کی جاتی۔ میں وہ بھی قبول کرلیتا۔ اور یہ دعوت نامہ جس ادبی نشست کی جانب سے آیا تھا، اس کا تو خاصا نام تھا انہوں نے کئی ابھرتے ہوئے شاعروں کو متعارف کرایا تھا۔ پچھلے سات سالوں سے میرا کوئی بھی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ البتہ اس دوران میرے دو نئے ناول اور ایک سفر نامہ ضرور چھپ کے مقبول عام ہوچکا تھا۔ دراصل ناول لکھنے کے دوران دل سے زیادہ دماغ متحرک رہتا ہے۔ احساسات سے زیادہ تکنیک، مہارت وغیرہ کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے اور دماغ تو میرا چلا ہوا...... اوہو خدانخواستہ میرا مطلب یہ نہیں کہ میرا دماغ چل گیا ہے...... میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میرا دماغ اب بھی خاصی چالو حالت میں ہے، ناول نگاری کا میرا فن مزید نکھر چکا ہے۔ مگر شاعری سراسر دل کی زبان ہوتی ہے اور میرا دل وہ بھی اب میری طرح عمر کے اڑتالیسویں سال میں داخل ہوچکا ہے۔ سنا ہے شاعروں کے دل ہمیشہ جوان رہتے ہیں۔ مگر میری جوانی کو تو آرزو کھا گئی۔ میرا آخری شعری مجموعہ حسب توقع پذیرائی حاصل نہ کرسکا تو ظاہری بات ہے کہ میرا دل اچاٹ ہوگیا۔ شاعری کی جانب رجحان بھی کم رہا۔ کچھ سالوں سے جو کچھ بھی لکھا ہے، فی الحال شائع کرانے کی ہمت نہیں کہ بطور شاعر میری ساکھ کو نقصان نہ پہنچے۔ میرے ابتدائی شعری مجموعے اب تک نوجوان لڑکے لڑکیاں شوق و ذوق سے خریدتے ہیں اور محبت کی یادگار کے طور پر ایک دوسرے کو تحفے بھی دیتے ہیں۔

مشاعروں میں شرکت بھی اب کم کم ہی ہوتی ہے، خصوصاً بیرون ملک ہونے والے مشاعروں میں مجھے اب مدعو نہیں کیا جاتا۔ اس لیے مذکورہ کتاب، جس کی تقریب رونمائی

کے لیے مجھے عزت بخشی جارہی تھی۔ اس کی شاعرہ میرے لیے قطعی اجنبی ہونی چاہئیں، کیونکہ ان محترمہ کا تعلق اوسلو، ناروے سے تھا اور وہیں ہونے والے اردو مشاعروں میں وہ شرکت کیا کرتی تھیں، لیکن میں شاعرہ کا نام پڑھتے ہی چونک گیا۔

''غزالہ درخشاں غزل۔''

یہ نام میرے لیے قطعاً اجنبی نہ تھا۔ میں نے کتاب کی پشت پہ دیکھا۔ یا تو غزالہ نے کوئی منتر پھونک کے اپنی عمر سن ستاسی پہ روک رکھی تھی یا پھر میری طرح وہ بھی کتابوں پہ اپنی اٹھارہ سال پرانی تصویریں چھپوانے کی شوقین تھی۔ میں نے بے تابی سے اوراق پلٹے، وہی انداز...... وہی فکر...... وہی الہڑ پن...... وہی کھٹے میٹھے جذبات...... میں حیرت زدہ ہوگیا۔ بیشتر غزلیں وہ تھیں جو میں نے اس کے حسن کے قصیدے، یا عشق کی تڑپ میں بے قرار ہوکے لکھی تھیں اور اس نے میرا ہاتھ تھام کے اپنی غزالی نشلی آنکھیں میری ڈبڈبائی آنکھوں میں گاڑ کے اپنی بے حد شیریں مخمور آواز میں یہ فرمائش کی تھی۔

''فلک! آپ کو قسم ہے میری محبت کی، ان اشعار کو زمانے کی ہوا مت لگنے دینا، ورنہ میرا عشق بدنام ہوجائے گا۔ یہ غزلیں صرف میرے دل پہ کندہ ہونے کے لیے ہیں، ان پہ صرف میرا حق ہے۔''

اس کی ایسی باتیں ہی تو مجھ سے رومان پرست شاعر کو لوٹ جاتی تھیں۔ میں نے وعدہ کرلیا تھا، ان غزلوں کو اس کے نام منسوب کرکے اسی کو تحفے میں دے دی تھیں۔ اور اس نے...... اس نے ان غزلوں کو معمولی سے ردوبدل کے ساتھ اپنے نام سے شائع کرالیا تھا۔ یہ تبدیلی بھی بس وہاں کی گئی تھی، جہاں سے پڑھنے والے کو شاعرہ کے بجائے کسی شاعر کا گمان گزرتا۔ مجھے ہلکا سا گلہ ہوا۔ مگر اگلے ہی لمحے انتساب پڑھتے ہوئے یہ گلہ بھی دور ہوگیا۔ اس نے لکھا تھا۔

''اس کے نام، جس نے مجھے غزل کہنے کا ہنر سکھایا جس نے میرے فن کو نکھار دیا۔''

''ظاہر ہے، یہ عظیم ہستی سوائے میرے اور کون ہوسکتی تھی۔ میں اس کی اس حرکت کو بھی حسن کی اک ادا جان کے درگزر کرگیا۔ میں نے اس محفل میں جانے کا عندیہ ظاہر کرکے اپنے اسسٹنٹ کو بتا دیا۔

***

''اجی سنتے ہو؟''

اپنے بچے کھچے بالوں میں انتہائی احتیاط سے کنگھا چلاتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ

کے رہ گیا۔ اپنے کمرے کی تنہائی میں، میں اپنے ہی خیالوں میں مگن رہتا تھا۔ یہاں میری الگ دنیا بسا کرتی۔ اوپر کے پورشن میں بیڈ روم بنانے کا فیصلہ بھی درحقیقت ایک گہری سازش تھی۔ آرزو کو ہمسائیوں سے قابل رشک تعلقات بنانے کا مراق تھا، کچن سے بھی اس کی گہری یاری تھی۔ یہ یارانے اوپر والے پورشن میں بیٹھ کر نہیں نبھائے جاسکتے تھے۔ سو وہ دن کا بیشتر حصہ نیچے گزارا کرتی۔ ہاں کبھی کبھی اچانک دھاوا ضرور بول دیا کرتی جیسے کہ اس وقت اس نے کیا۔ میں نک سک سے تیار، خوشبوؤں میں نہایا، گنگناتے ہوئے اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے رہا تھا۔ جب اس نے صورِ اسرافیل عین میرے کانوں میں پھونکا۔

''اجی! سنتے ہو؟''

میرا ہاتھ کانپا اور کنگھے کا ایک سرا میری آنکھ میں زور سے لگ گیا۔ میں نے اپنی ساری جھنجلاہٹ اسی پہ نکال دی۔

''تمہیں ساری عمر تمیز نہیں آئے گی۔ کتنی بار کہا ہے کہ یوں چھاپہ مارنے کے انداز میں کمرے میں داخل مت ہوا کرو۔ آنے سے پہلے دستک دیا کرو۔''

''کیوں جی، آپ کیا کپڑے بدل رہے تھے جو میں دروازے بجا کے آتی۔ ویسے بھی دروازے تو مہمان بجایا کرتے ہیں۔ میں کیا اپنے ہی کمرے میں مہمان ہوں؟'' اس نے میری آنکھ پہ اپنے دوپٹے کا گولا سا بنا کے رکھتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹانے والی ہدایت پر اعتراض پیش کیا۔ میں پہلے ہی آنکھ کے درد سے بے حال تھا۔ اس نئی افتاد پہ بوکھلا گیا۔ لان کے دوپٹے سے گرم مسالوں اور لہسن کی بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

''بیگم! یہ میری آنکھ ہے، بریانی کا دیگچہ نہیں جسے تم دم دے رہی ہو۔'' اس نے میری آنکھ پہ رکھے دوپٹے کے گولے پہ منہ لگا کر زور زور سے پھونکیں مارنا شروع کیں تو میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''ابھی آرام آجاتا ہے، ذرا اپنا شوخا پن کنٹرول میں رکھو جی کچھ دیر۔''

میری حس مزاح کو وہ ہمیشہ شوخا پن قرار دیتی تھی۔ اگرچہ اس وقت میں نے ہرگز کوئی لطیف مذاق نہیں فرمایا تھا۔ بلکہ آنکھ کے پپوٹے کو جس طرح زور سے بند کر کے وہ دوپٹے کی مدد سے گرم گرم بھاپ، مسالوں کی خوشبو میں لپیٹ کر مجھ تک پہنچا رہی تھی، مجھے خود پہ بریانی کی دیگ کا ہی گمان ہو رہا تھا۔

''یہ دیکھو جی، آگیا آرام......''

اس نے میرا چہرہ ٹھوڑی سے تھام کر آئینے کے سامنے اس انداز میں کیا جیسے کوئی

ماہر بیوٹیشن کسی گئی گزری صورت کو اپنے ہنر کی بدولت اپسرا کا روپ دینے کے بعد فخریہ انداز میں آئینے کے روبرو کر کے داد طلب ہوتی ہے۔ میری دائیں آنکھ میں ابھی تک ہلکی سرخی باقی تھی۔ البتہ درد کو آرام آگیا تھا۔ میں نے اپنا چشمہ درست کیا۔

''لو، یہ تو بھول ہی گئی کہ بات کیا کرنی تھی۔'' اس نے وہ حرکت کی جو کرنے کی میری ہمیشہ حسرت ہی رہی، یعنی کہ ایک زوردار ہاتھ اپنے ہی سر پہ رسید کیا۔

''شکر ہے اللہ کا......'' میں زیرلب بڑبڑا کے اپنے موبائل اور والٹ وغیرہ کوٹ کی جیب میں ڈالنے لگا، آج عرصے بعد میں نے ٹوپیس پہنا تھا اور وہ بھی ڈرائی کلین کروا کے...... ورنہ شلوار قمیص پہن پہن کر میرا سراپا ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ پینٹ میں یہ آسانی ہے کہ توند کنٹرول میں رہتی ہے۔ ذرا بیلٹ باندھنے میں دقت ہوئی یا پتلون ٹائٹ محسوس ہو۔ تو انسان خود بخود اپنے کھانے پینے پہ کنٹرول کر لیتا ہے، یا وزن کو دوبارہ پہلے والی حالت میں لانے کے لیے جاگنگ وغیرہ شروع کر دیتا ہے۔ جب کہ گھیر دار شلوار قمیص میں یہ وارننگ والی سہولت موجود نہیں۔ دو گز لمبا ازار بند ہر سائز کی توند کے مطابق ایڈجسٹ ہو جاتا ہے۔ آج سالوں بعد اسے پہننے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میرا وزن بھی خاصا بڑھ گیا ہے۔ ایک نوزائیدہ سی توند ''جھا'' کر رہی تھی۔ میں نے کوٹ کے نچلے سبھی بٹن بند کر کے اس توند کی پردہ پوشی کی۔ بال بھی اس طریقے سے بنا کر اسپرے کیا کہ میرا وسیع ہوتا ماتھا ڈھک گیا۔ عینک اتارنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ظاہر ہے وہاں تقریر بھی کرنا تھی۔ ویسے بھی سلور فریم والا یہ چشمہ مجھے سوبر اور حقیقی دانشور ظاہر کرتا تھا۔ خوب رگڑ کے شیو تو میں کر چکا تھا اور کل ایک مہنگے ہیئر سیلون سے بال بھی اس انداز میں ڈائی کروا چکا تھا کہ پہلی نظر میں یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ ان بالوں کی سفیدی ڈھکنے کے لیے اوپر رنگ سازی کی گئی ہے۔

''ہا...... ہائے، یہ آپ کے بالوں کے ساتھ کیا ہو گیا جی؟'' نظر پڑتے ہی اس نے تاسف سے ہاتھ ملنا شروع کر دیئے۔

''کیا ہوا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں......'' میں پہلو بچا کے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ دروازے کے عین درمیان میں ڈٹ گئی۔

''لگتا ہے تیل کے بجائے فینائل یا باتھ روم دھونے والی بلیچ لگا لی ہے۔ عینک کے بغیر آپ کو نظر بھی تو ''ککھ'' نہیں آتا۔ ہائے...... ہائے...... پہلے ہی چار بال رہ گئے تھے، ان کا بھی ناس ہو گیا۔ دیکھو ذرا کیسے نسوار کی رنگت کے ہو گئے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں

آنسو تک آ گئے۔

"تم نے نسوار کبھی دیکھی بھی ہے؟" میں بھنا گیا۔

"دیکھ تو رہی ہوں، آپ کے سر پہ گری ہوئی۔"

"احمق عورت! میں نے بال ڈائی کیے ہیں۔" میں نے اسے ہاتھ سے پیچھے کر کے راستہ لینا چاہا۔

"تو مجھے کہنا تھا، میرے پاس ہر وقت کالی مہندی کی پڑیاں پڑی رہتی ہیں، یہ عجیب سا رنگ کیوں کرا لیا ہے، نہ کالا، نہ چٹا، نہ لال، نہ براؤن......"

"تم میرے بالوں کا تجزیہ کرنے کے بجائے وہ کرو، جو تمہیں کرنا چاہیے، یعنی کدو، ٹینڈے اور بینگن پہ نئے نئے تجربات۔"

"ہاں، یاد آیا۔ میں یہی تو پوچھنے آئی تھی کہ آج رات کیا پکاؤں۔ مسالہ بھری بھنڈی، بینگن کا بھرتہ یا پائے کا شوربا......"

"میرا آج رات کا کھانا باہر ہے۔" یہ اطلاع دیتے ہوئے میں بے حد مسرور نظر آیا۔ متوقع پر تکلف ڈنر کے تصور سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ آج میں اس کے سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں۔

"تمہارا جو جی چاہتا ہے پکالو، چاہے بھنڈی کا بھرتہ ہو یا مسالہ بھرے پائے...... یا پھر بینگن کا شوربہ۔" یہ کہنے کے بعد میں رکا نہیں، البتہ تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے اپنی پشت پہ اس کی آواز ضرور سنی۔ اپنے پسندیدہ پکوانوں کی ترتیب میں یہ معمولی سا ردوبدل اس کے مزاج پہ گراں گزرا تھا اور وہ نہایت دل سوزی سے کہہ رہی تھی۔

"ہائے...... ریحان صاحب تو سٹھیا گئے۔ اچھی بھلی کھڑی کھڑی بھنڈیوں کا کچومر نکال کر بھرتہ بنا دیا اور بینگن کے بھرتے میں پانی ڈال دیا۔"

٭٭٭

اسے پہلی نظر میں دیکھتے ہی یہ تو ثابت ہو گیا کہ کتاب پہ چھپنے والی اس کی تصویر وہی پرانی والی تھی، لیکن اس بات کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہوگی کہ اب بھی اس کے حسن و جمال میں کوئی کمی نہ آئی تھی، لیکن شاید ہر عورت کو اپنے اس روپ سے عشق ہوتا ہے، وہ روپ جو سولہ سال کی عمر سے انیس سال کی عمر تک اس پہ چڑھتا ہے، اسی لیے وہ اپنی حالیہ تصویر کے بجائے وہی سولہ سال پرانی تصویر چھپواتی تھی، جس میں اٹھارہ انیس سال کی نوخیز غزالہ اپنے نوعمر حسن کی ساری دلکشی اور رعنائی سمیٹے ہوئے تھی اور اس وقت جو غزالہ

درخشاں غزل میرے سامنے تھی، وہ پینتیس سالہ عورت تھی، ایک بھرپور عورت......

اس کے لانبے اور گھنے گھنگھریالے گہرے بھورے بال بھی اب نہ اتنے گھنے رہے تھے، نہ لانبے اور گھنگھریالے تو بالکل نہ رہے تھے۔ بمشکل شانوں تک پہنچتے، بالکل سیدھے ہلکے سنہری بال اسے بڑی ماڈ سی شکل دے رہے تھے اور جنہیں وہ بڑی دلبرانہ سی نزاکت کے ساتھ بار بار پیچھے کی طرف جھٹکتی تھی تو ان کا مصنوعی سنہرا پن اس کی بے حد گوری رنگت پہ بکھر بکھر جاتا تھا۔ صرف بالوں کی حد تک ہی نہیں بلکہ اس کے چہرے پہ بھی کچھ مصنوعی چیزوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ آنکھوں پہ نیلگوں مائل سبز رنگ کے لینس لگے تھے جو اس کی سنہری رنگت اور نئے ڈائی شدہ بلونڈ بالوں کے ساتھ بلاشبہ بڑے جچ رہے تھے۔ سلک کی گہرے نیلے رنگ کی ساڑھی کے پھسلتے پلو پہ سبز دھاگے کے کام نے اسے کسی مورنی کا سا پیراہن اوڑھا رکھا تھا۔ ساڑھی اس کے متناسب سراپے پہ کتنی بھلی لگ رہی تھی۔

پہلے کی نسبت وہ قدرے گداز ضرور لگ رہی تھی مگر فربہ نہیں۔ مجھے پہچاننے میں اسے وقت نہ لگا۔ حالانکہ اٹھارہ سال کے ریحان علی فلک اور آج کے اس ادھیڑ عمر خبطی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مسکراہٹیں تو غالباً اس وقت بھی میرے ہونٹوں پہ مستقل مکین نہ تھیں، لیکن سے سامنے پا کر کچھ دیر کی مہمان ضرور ہو جایا کرتی تھیں اور اب......اب تو وہ کچھ عرصے سے ایسے غائب تھیں جیسے کوئی نادہندہ لاکھوں کروڑوں کا غبن کر کے فرار ہو جائے، عمر بھر ہاتھ نہ آنے کے لیے روپوش ہو جائے۔ بال اس زمانے میں بھی پت جھڑ کا شکار تھے اور اب تو مکمل خزاں کا موسم تھا۔ وسیع و عریض ماتھے پہ شکنیں جم کے براجمان ہو گئی تھیں۔ عینک کا نمبر میری عمر کے سائز کی طرح بڑھ گیا تھا۔ گندمی رنگت خون جلا جلا کے سانولی پڑ گئی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ مجھے پہچان کے میری طرف لپکی تو میں نے ڈیڑھ سو مہمانوں کے سامنے خود کو کئی فٹ اونچا محسوس کرتے ہوئے خود بخود اپنی گردن اکڑا لی۔

"اوہ فلک جی! مجھے یقین تھا، آپ ضرور آئیں گے۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ دبوچتے ہوئے نرمی سے دبا کر کہا۔ اس کی ہیرے جڑی پلاٹینم کی آدھ درجن انگوٹھیاں میرے ہاتھ میں کھب سی گئیں۔ اس کے باوجود میں نے اپنے اڑتالیس سالہ جسم میں ایک لطیف سی سنسناہٹ پھیلتی محسوس کی۔

"غزالہ! تم...... آپ...... میرا مطلب ہے، کب......" میں، جس کا قلم کسی مجاہد کی تلوار کی طرح چلتا ہی جاتا تھا، اب کھڑاتے لہجے میں بے ربط الفاظ کہنے کی کوشش کر رہا

تھا۔ اچانک میرے اور نزدیک ہو کے اس نے میرے رہے سہے حواس بھی رفو چکر کر دیے۔ اس کا نیم عریاں شانہ میرے کوٹ سے مس ہو رہا تھا۔

میرا ہاتھ اب بھی اس کے بائیں ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے میری کہنی تھامی اور اپنی دلفریب مسکراہٹ کو دائیں بائیں اطراف میں کچھ اور شدت سے پھیلایا۔ میں نے ہونق پن سے منہ کھول کے اس کے اس فلمی پوز کو دیکھا اور اس کی مسکراتی نگاہوں کے تعاقب میں سامنے نظر اٹھائی تو دو تین پریس فوٹو گرافرز ہمیں کیمرے کی زد میں لینے کو تیار کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی اڑی ہوئی ہوائیوں کو ٹھکانے پہ لاتا، ہمارا یہ پوز کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ بڑی نزاکت کے ساتھ مجھ سے ذرا سی دور ہٹی۔ البتہ میرا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ مجھے تقریباً کھینچتی ہوئی آگے لے گئی۔

''آیئے فلک! میں آپ کا تعارف اپنے مہمانوں سے کراؤں۔ آپ تو خیر کسی تعارف یا تعریف کے محتاج نہیں...... کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔'' اس نے کمان سے ابرو کمال دلبربائی سے اچکائے۔

''لیکن آپ سے اپنے چند عزیزوں کا تعارف ضرور کراؤں گی کہ یہ ان کی بھی خوش نصیبی ہوگی۔ بہت سے لوگ تو اس محفل میں صرف آپ سے ملنے کے اشتیاق میں چلے آئے ہیں۔''

میری پہلے سے اچک اچک کر نکلتی گردن مزید باہر نکل آئی۔ مجھے خود پہ کسی ذرافے کا گمان ہو رہا تھا جو بونوں کی بستی میں آ نکلا ہو۔ مجھے ڈائس پہ بلایا گیا تو میں اس سے کہیں زیادہ بول گیا۔ غزالہ کی مدح سرائی میں جو کچھ میں گھر سے لکھ کر لایا تھا، وہ سامنے بیٹھی اپنی مدھر مسکراہٹ کے ساتھ مجھے مزید بولنے پہ اکساتی رہی۔

''غزالہ...... غزل درخشاں...... جس کا نام ہی غزلوں کا ردھم اور نغمگی سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا فن شاعری کی حبس زدہ فضا میں ایک خوشگوار ہوا کا جھونکا ہے۔ بہار کی جانب کھلنے والا دریچہ ہے۔ اس کی شاعری میں رنگ ہیں، خوشبو ہے، راتوں کی گھمبیر خاموشی ہے، شاموں کے سرمئی سائے ہیں، صبحوں کے اجالے ہیں، ستاروں کی جگمگاہٹ ہے، چاند کی نرماہٹ اور سورج کی گرماہٹ ہے، پھولوں کی سی لطافت اور جھرنوں کی روانی ہے۔''

میری اس پرجوش تقریر کے جواب میں وہ شرمائی شرمائی سی تالیاں بجاتی اردگرد بیٹھے لوگوں کے توصیفی کلمات کو سر ہلا ہلا کے قبول کرتی رہی۔ میرے بعد اس کی باری تھی۔

''ریحان علی فلک ہمارے ملک کے گراں قدر ادیب، ہمارے بے حد قابلِ احترام صحافی اور بے حد خوبصورت لب و لہجے کے شاعر، میری بے حد خوش نصیبی ہے کہ وہ مجھ جیسی نو آموز شاعرہ کے بلانے پہ نہ صرف اس محفل کی رونق بڑھانے آئے بلکہ ایک ابھرتی ہوئی شاعرہ کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ ان کا میرے کلام کو پسندیدگی کی سند عطا کرنا میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ وہ شاعر، جس کی کتابیں میرے سرہانے کے نیچے موجود رہتی تھیں اور جس کے افسانے مجھ جیسی کچی عمر کی لڑکی کو ایک نئے جہانوں میں لے جاتے تھے، اس کا میری کتاب کے بارے میں ایسے کلمات کہنا میرے لیے کسی سرمائے سے کم نہیں۔''

میں ٹھٹک سا گیا۔ اگرچہ اس کی غیر معمولی پذیرائی اور اب یہ توصیفی کلمات مجھے مغرور کر دینے کے لیے کافی تھے۔ لیکن میں توقع کر رہا تھا، وہ اپنی تقریر میں ہماری وابستگی کا نہ سہی، دوستی کا حوالہ ضرور دے گی۔ ہمارے ایک ساتھ تعلیمی مدارج طے کرنے کا تذکرہ بھی کرے گی مگر وہ تو خود کو میری ایک ٹین ایج فین ثابت کرنے پہ تلی ہوئی تھی، جیسے میری کتابیں پڑھ پڑھ کے جوان ہوئی ہو۔ اس کا ہلکا سا گلہ میں نے چائے کے لوازمات پہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے کیا۔

''اوہ فلک جی! سمجھا کریں نا، میں نہیں چاہتی کہ لوگ ہماری دوستی کو کسی اور تناظر میں دیکھیں۔ آپ سے تعلق میرے لیے قابل فخر ہے۔ بلیومی۔ کہنے ہی والی تھی مگر اس سے پہلے آپ نے بے تکلفانہ میری اور میری شاعری کی جو تعریفیں کیں، ان کے بعد مجھے لگا کہ اب میں نے یہ بات ظاہر کی تو لوگ سمجھیں گے آپ نے یہ سب کچھ دوستی کے ناتے کیا اور میں دوستی کی وجہ سے آپ کی شہرت اور ساکھ کو استعمال کر رہی ہوں۔'' اس کی وضاحت مجھے بے حد بھائی اور میں زیادہ رغبت سے چکن پیٹیز کھانے لگا۔ وہ بڑی نفاست سے پچھلے پندرہ منٹ سے اپنی پلیٹ میں رکھی ایک چاکلیٹ پیسٹری کو کتر رہی تھی۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہارے کزن، میرا مطلب ہے شوہر کا نام اخلاق تھا اور تم نے بڑے ذوق و شوق سے یہ نام اپنے نام کے آگے لگانا بھی منظور کر لیا تھا۔ یعنی غزالہ اخلاق...... تو کیا اب اپنے شوہر کا نام استعمال کرنا ترک کر دیا ہے تم نے؟''

''نہیں۔'' اس نے یکا یک ساری پیسٹری اٹھا کے منہ میں رکھ لی۔ ''میں نے شوہر ترک کر دیا ہے۔''

''کیا......؟ کیا مطلب؟'' مطلب واضح تھا، اس کے باوجود میں پوچھ رہا تھا۔

''ایسی کیا بات ہوگئی، وہ تو تمہارا فرسٹ کزن تھا۔ بڑا کامیاب انجینئر تھا، معقول

لازمت......"

"مگر وہ خود خاصا نامعقول ثابت ہوا۔" اس نے بیزاری سے میری بات کاٹی۔

"اخلاق کا اخلاق دن بدن گرتا جا رہا تھا۔ وہ ہر وہ حرکت کرتا تھا جس سے میں چڑتی تھی۔ ہر اس کام میں دلچسپی ظاہر کرتا تھا جسے میں ناپسند کرتی ہر وہ چیز پسند کرتا جس سے مجھے نفرت تھی۔ وہ نفسیاتی مریض تھا فلک جی! مجھے تڑپا کے اسے تسکین ملتی تھی مگر میں بھی کوئی پچھلی صدی کی گونگی بہری پتھر کی عورت نہ تھی جو چپ چاپ برداشت کرتی رہتی۔ ڈیڑھ سال...... پورے ڈیڑھ سال میں نے گزارا کیا۔" اس نے دادطلب انداز میں اپنے صبر و برداشت کا "طویل دورانیہ" بیان کیا۔ میں سچ مچ متاثر ہو گیا۔

"میں نے اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ حق مہر تک کی پروا نہ کی۔ الٹا وکیلوں پہ میری کتنی ہی رقم خرچ ہوئی۔ اتنا خرچا تو میرے ماں باپ نے میری رخصتی پہ نہ کیا ہو گا جتنا خرچا اس سے چھٹکارا حاصل کرنے میں لگ گیا۔ خیر...... مجھے خرچے کی پروا نہ تھی اور نہ ہی اس کی مجھے کمی تھی، سارے اخراجات تو......"

"تو تم زندگی کے اس سفر میں ایک طویل مدت سے تنہا ہو۔" میں نے بے تابی سے اس کی بات کاٹی۔ اس وقت وہ مجھے ایسا کارنر پلاٹ لگ رہی تھی جس کا کوئی دعویدار نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں حقِ ملکیت کے بارے میں اسٹامپ پیپر تیار کروانے کا سوچتا، وہ کہہ اٹھی۔

"فلک جی...... یہ نہ تھی ہماری قسمت۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"زندگی کے سفر میں تنہا ہونا بھی بذات خود ایک بہت بڑی عیاشی ہے جس سے میں ہنوز محروم ہوں۔ یہ سیٹھ باٹلی والا ہی تو تھا جس کے آسرے پہ میں نے اخلاق سے طلاق لینے کا قدم اٹھایا تھا، ورنہ ایک انجان ملک میں، میں ایک اکیلی، بے سہارا، مظلوم عورت کیسے زندگی گزار سکتی تھی۔ وطن واپس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اماں، ابا میری ایک نہ سنتے۔ اس اخلاق نے نجانے میری خودسری اور من مانی کے کیسے کیسے من گھڑت قصے یہاں سنا رکھے تھے۔ ایسے میں سیٹھ باٹلی والا کا دم غنیمت تھا۔ وہ ایک انڈین نژاد مسلمان تھا۔ آگرے کا مشہور ساڑھیوں کا بیوپاری۔ طلاق کے مقدمے کے بیشتر اخراجات بھی اسی نے اٹھائے۔ مجھے اس سے محبت نہ تھی۔ مگر جینے کا کوئی سہارا تو ہونا چاہیے تھا سو......" اس نے شانے اچکائے اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس پلاٹ پہ کسی نے ناجائز قبضہ جما لیا ہو۔

"اور آپ سنایئے فلک جی! کیسی گزر رہی ہے۔" وہ مسکرائی تو مجھے لگا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہی ہو، جیسے وہ سب جانتی ہو۔ مجھے آرزو کے مقابلے میں خود اس کا شوہر سیٹھ باٹلی والا یاد آیا اور میں کچھ ریلیکس ہوا۔ صرف میں ہی نہیں، وہ بھی ایک کورے ذوق والے "بے ادب" شخص کی سنگت میں جیون گزارنے پہ مجبور تھی۔

"آ...... کسی روز کسی دکھ پہ اکٹھے روئیں......" میں گنگنایا مگر وہ اب کسی اور جانب متوجہ تھی۔

اس شام گھر واپسی پہ میں متضاد کیفیات کا شکار تھا۔ ایک طرف عرصے بعد غزالہ جیسی دلکش و باذوق عورت کی صحبت کی خماری تھی۔ دوسری طرف رہ رہ کر اپنی بدنصیبی کا خیال آتا تھا کہ وقت کی بے رحمی کے ہاتھوں میں کیسا انمول گوہر گنوا چکا تھا۔ آج میرے پاس سب کچھ ہے۔ معاشرے میں مقام، معقول مالی حیثیت...... مگر ایک من پسند اور ہم مزاج ساتھی نہیں اور جب اس ساتھ کا امکان تھا، تب میرے پاس اور ایسا کچھ نہ تھا جس کے بل بوتے پہ میں اسے فتح کر سکتا۔ مجھے آج اپنی شہرت، دولت، حیثیت...... سب بے معنی اور بے مقصد لگ رہے تھے کیونکہ اب یہ میرے کسی کام نہ آ سکتے تھے۔ میری حیثیت میرے لیے بے مصرف تھی، میرے لیے بھی اور میری بیوی کے لیے بھی...... کیونکہ اسے قطعی یہ احساس نہ تھا کہ وہ کس عظیم دانشور، مشہور افسانہ نگار، مقبول شاعر اور نامور صحافی کی اہلیہ ہے۔ اکثر ہی وہ بڑی یاسیت سے کہتی۔

"سب عورتیں پوچھتی ہیں، تمہارا بندہ کیا کرتا ہے۔ بتاؤ، میں کیا جواب دوں انہیں۔ کسی کا ڈاکٹر ہے، کسی کا وکالت کرتا ہے، کسی کا دکانداری کرتا ہے تو کسی کا جائیدادوں کے سودے کرتا ہے۔ اب میں کیا بتاؤں کہ میرا بندہ عینک چڑھائے اپنے کمرے میں بیٹھا صفحے کالے کرتا رہتا ہے۔"

"کاش، مجھے غزالہ جیسی قدر دان بیوی ملی ہوتی۔" اس کی تقریر میں اپنے بارے میں سنے توصیفی کلمات یاد کر کے میرے دل نے یہ خواہش کی۔

لاؤنج میں کارپٹ پہ پھسکڑا مار کر بیٹھی آرزو خربوزے کی ٹرے سامنے رکھے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ٹی وی پہ جواد احمد بازوؤں کے چپو چلا چلا کر اعلان کر رہا تھا۔

"او کہندی اے سیاں میں تیری آں......"

"آ گئے تسی، خربوزہ کھاؤ گے؟" وہ چھلکے سمیٹتی اٹھنے لگی۔

"ایک کپ چائے بنا دو۔"

"بڑے میٹھے ہیں اور ٹھنڈے ٹھار بھی۔ ریڑھی والے سے لڑلڑ کے بیس روپے کلو لیے تھے، ورنہ وہ تو تیس روپے سے......"

"چائے ذرا اسٹرانگ بنانا۔"

"بیج بھی وڈے وڈے نکلے ہیں۔ دھو کے سکھانے کے لیے رکھ دیتی ہوں۔ آپ کے دماغ کے لیے بڑے اچھے رہیں گے۔"

"آرزو...... چائے......" میں نے زور دے کر کہا۔ وہ شاید خربوزوں سے زیادہ ہی متاثر نظر آ رہی تھی۔

"ہائے ہائے، ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہو۔"

"میں...... میں پیچھے پڑ جاتا ہوں اور تم جو گھنٹے بھر سے اس خربوزے پہ مقالہ پڑھ رہی ہو۔"

"چلو چھڈو، پارٹی کیسی رہی؟"

"بہت عمدہ۔" میرا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ "کیا نفیس حضرات مدعو تھے۔ کیا خوبصورت گفتگو ہوئی۔"

"کھانے میں کیا تھا؟"

"تمہارا سر۔"

"ہا...... ہائے...... گھر پہ بھی میرا ہی سر کھاتے ہو اور باہر بھی۔" وہ بھونڈا سا مذاق کر کے اور خود ہی اس پہ لطف اندوز ہوتی کچن میں گئی تو میں پھر سے غزالہ کے تصور میں کھو گیا۔

وہ بولتی تھی تو لفظ مہک اٹھتے تھے۔

وہ مسکراتی تھی تو کلیاں چٹک جاتی تھیں۔

وہ ہنس دیتی تو نقرئی گھنٹیاں بج اٹھتیں۔

وہ چلتی تو جیسے کوئی تالاب پہ بچھے کنول کے پھولوں پہ سہج سہج قدم رکھ رہا ہو۔

وہ نظر بھی اٹھاتی تو لگتا، کچھ کہہ گئی ہے۔

اور کہہ اٹھتی تو غضب ہو جاتا۔ دلکش مدھر آواز میں وہ خوبصورت الفاظ کا سلیقے سے چناؤ...... وہ کمال درجے کی نفیس حس مزاح، وہ شاعرانہ تصورات، وہ خیالات کی وسعت...... واہ...... آج عرصے بعد مجھے کسی سے مل کر سیری کا احساس ہو رہا تھا اور آج عرصے بعد ہی کسی سے مل کر مجھے تشنگی بھی بے چین کر رہی تھی۔

اس ایک ملاقات نے آئندہ ملاقاتوں کا در کھول دیا۔ وہ اب مستقل پاکستان میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اسی سے پتا چلا کہ اس نے ڈیفنس میں گھر بھی لے لیا ہے۔

"آپ کبھی آئیے نا ہمارے گھر، میرے شوہر آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"اور میں؟"

"کیا مطلب؟"

"نہیں، کچھ نہیں۔" میں سٹپٹا گیا پھر بات بدل دی۔ "میرا مطلب ہے، میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں، کیا آپ مجھے اپنے گھر مدعو نہیں کر سکتے؟"

"وہ تو کر سکتا ہوں، مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری بیوی تم سے مل کر خوش ہو گی۔ خصوصاً اس صورت میں جب اسے ہمارے ماضی کے تعلق کے بارے میں پتہ چلے گا۔"

"جانے دیجئے فلک جی! راکھ میں دبی چنگاریوں کو کریدنے سے کیا حاصل۔"

"یعنی ابھی چنگاریاں باقی ہیں، بے شک دبی ہی کیوں نہ ہوں۔" میں نے کریدا تو وہ ٹال گئی۔ بڑی خوبصورتی سے میری نئی کتاب کے بارے میں گفتگو کرنے لگی۔ میرے کالموں کے انتخاب پہ اس نے سیر حاصل تبصرہ کر کے میرا جی خوش کر دیا۔ یہ وہی کالم تھے جن کو کبھی کبھار سرسری سا پڑھنے کے بعد آرزو سر جھٹک کے کہا کرتی۔

"اس کو کہتے ہیں۔ سانپ گزر گیا، لکیر پیٹتے رہ گئے۔ بھئی جو کھڑاک دو تین دن پہلے ہو گیا ہے۔ چاہے برا تھا، چاہے چنگا، اب اس پہ افسوس یا خوشی والا کالم لکھنے کا کیا فائدہ۔"

"تم نہیں سمجھو گی احمق عورت! اسے تجزیہ کہتے ہیں۔ معاشرے میں ہونے والی خرابیوں کی نشاندہی ہم ادیب نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔ نئی رونما ہونے والی تبدیلیوں پہ غیر جانبدارانہ تجزیہ پیش کرنا ہی میرا کام ہے۔"

"یہ تو "ڈاڈی" (سخت گیر) ساسوں والی عادت ہے۔ "کپتی" (لڑاکا) قسم کی نندوں والا کام۔"

ایک بار پھر اس کی بے سروپا باتوں نے اس خوبصورت گفتگو کا مزا کرکرا کر دیا۔

اس سے اگلی ملاقات ایک اور ادبی محفل میں ہوئی، جس میں اس کی شرکت میری

وجہ سے ہی ممکن ہوسکی تھی۔ میرے اثر و رسوخ کی وجہ سے ہی اس جیسی نو آموز شاعرہ ادبی دنیا کے بڑے بڑے ناموں کے درمیان موجود تھی۔

''فلک جی! میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنی تسکین ہو رہی ہے۔ وہاں ناروے میں کیا نہیں تھا میرے پاس۔ نہ دولت کی کمی تھی، نہ آسائشوں کی۔ پورا پیلس بنا رکھا تھا ہم لوگوں نے وہاں مگر میرے اندر کی شاعرہ کی تسکین نہ ہو پا رہی تھی۔ اپنا آپ ادھورا لگا کرتا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں، میرے اندر ہمیشہ سے خود کو منوانے کی لگن تھی۔''

''ایک بات تو بتاؤ غزل! دوست ہم پہلے بھی تھے، اب بھی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ پہلے میں صرف ریحان اور تم ہوا کرتا تھا، اب فلک جی اور آپ ہو گیا ہوں۔'' میں نے تکلف کی یہ دیوار گرانی چاہی۔

''کیا کروں، کہاں آپ...... کہاں میں ناچیز۔'' اس نے بڑی ادا سے پلکیں جھپک کر کہا۔ وہ اسی طرح مجھے چنے کے جھاڑ پہ چڑھایا کرتی اور میں پھر نیچے اترنے کا نام نہ لیتا۔ ایسا نہ تھا کہ اس سے قبل میں نے کبھی اپنی تعریف سنی نہ تھی۔ اس سے کہیں زیادہ پذیرائی کا میں عادی ہو چکا تھا۔ میری شہرت کی وجہ سے ہر جگہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا، لیکن کسی من چاہی ہستی کی جانب سے پسندیدگی اور عقیدت کا اظہار انسان کو خود بخود مغرور کر جاتا ہے۔

''یہ تو تم کسر نفسی سے کام لے رہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تم جیسی خواتین کی بے حد قدر کرتا ہوں جو خود کو گھر داری کے جھمیلوں میں گم نہیں کرتیں بلکہ اپنا ذاتی تشخص بھی برقرار رکھتی ہیں اور اپنے بل بوتے پہ اپنی پہچان کراتی ہیں۔''

''یہی ذہنی ہم آہنگی ہی تو ہے جس کی مجھے ہمیشہ تلاش رہی۔'' وہ خلاؤں میں اپنی خوابیدہ نگاہیں گھماتے ہوئے کہنے لگی۔

''کیوں، کیا سیٹھ باٹلی والا سے ابھی تک تمہاری ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو سکی۔ کب ہوئی تھی تمہاری اس سے شادی۔''

''بارہ سال پہلے۔''

''بارہ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے کسی کو جاننے اور پرکھنے کے لیے۔''

''نہیں فلک جی! اگر کسی کو جاننا ہو تو ایک لمحہ کافی ہے اور اگر کسی سے مزاج کے ستارے نہ ملتے ہوں تو عمر بھر کھوجتے رہو، کوئی سرا ہاتھ نہیں لگتا۔''

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ آرزو سے میری برسوں پرانی رفاقت اس کا ثبوت تھی۔

ہم دونوں ندی کے دو کناروں کی طرح عرصے سے ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ ایک ہی منزل پہ مگر الگ الگ۔

''بارہ سال کیا چیز ہیں، اسی لیے میں نے بارہ سال گزارنے کا رسک نہیں لیا۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''سیٹھ باٹلی والا سے میں نے ڈھائی سال بعد ہی علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ہماری انڈراسٹینڈنگ نہیں ہو سکی، نہ کبھی ہو سکتی تھی۔''

''اور...... وہ جو...... وہ جو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہارے شوہر نے لاہور میں بزنس سیٹ کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔''

''ہاں تو شوہر کیا صرف سیٹھ باٹلی والا ہی ہو سکتا ہے۔ میرے کرنٹ شوہر کا نام آغا غفور ہے۔ بہت بڑے کنٹرکٹر ہیں۔''

''اوہ...... آئی سی۔'' اور میرا دل مسلسل ''سی...... سی'' کر رہا تھا۔ کیا کمال کی رفتار تھی اس عورت کی، کیا ترقیاں تھیں، دھت تیرے کی۔ ریحان علی فلک...... بڑا مرد بنا پھرتا ہے، ایک ڈھول کیا گلے پڑ گیا، پندرہ سالوں سے اسے ہی ڈھم ڈھم ڈھما ڈھم ڈھم پیٹے جا رہا ہے۔ ذرا جو سر اور تال بدلنے کا خیال آیا ہو۔

''ان سے تمہاری انڈراسٹینڈنگ......؟'' میں نے بڑی آس سے پوچھا۔ (پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ......)

''اوہ...... آثار کچھ بہتر ہی ہیں۔ ایکچوئیلی آغا صاحب کو مجھ سے محبت کچھ زیادہ ہی ہے، اس لیے انڈراسٹینڈنگ کی کمی وہ اس سے پوری کر لیتے ہیں۔ یعنی میری بات...... بے شک وہ اس سے اختلاف رکھتے ہوں، بے چوں و چرا مان جاتے ہیں، ورنہ اخلاق اور سیٹھ باٹلی والا...... وہ ہر بات کو انا کا مسئلہ بنا لیتے تھے۔ ٹیپیکل مین...... میں نے ان کی انا ان کے پاس رہنے دی اور اپنی انا بحفاظت سمیٹ کر الگ ہو گئی۔ وہ بھی خوش، میں بھی خوش۔''

* * *

''پاپا! کتنے دنوں سے ہم آؤٹنگ پہ نہیں گئے۔'' جاناں نے میری سوچوں کا تسلسل توڑا۔ میں نے ایک پیار بھری نظر اپنی لاڈلی بیٹی کے کھلے کھلے چہرے پہ ڈالی۔

''بیٹا جان! آپ کے سمسٹر ہو رہے تھے، اس لیے سوچا، فری ہو جاؤ پھر پروگرام بناتے ہیں۔''

"پاپا! کیوں نہ ہم مری چلیں؟" میرے بیٹے نے آئیڈیا پیش کیا۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" آرزو فوراً متفق ہوگئی۔

"پہلے پاء جی کے پاس پنڈی چلتے ہیں، ان کی وڈی گڈی میں سارے "جی" (لوگ) پورے آجائیں گے۔"

"کون کون سے "جی"؟" میں نے الفاظ چبا چبا کر پوچھا۔

"آج وہ گہرے جامنی اور زرد پرنٹ کے لان کے سوٹ میں پسینے پسینے مجھے معمول سے زیادہ بری لگ رہی تھی۔

"چار ہمارے "جی" اور باقی تو "جی" پاء جی ہوراں کے۔"

"ہم فیملی ٹرپ پہ جا رہے ہیں، اس میں پاء جی ہوراں کا...... میرا مطلب ہے ان لوگوں کا کیا کام۔"

"وہ بھی تو ہماری فیملی ہی ہوئے۔ آپ کے وڈے پائی ہیں وہ۔"

"مری کے پچھواڑے رہتے ہیں وہ۔ ان کے لیے نئی چیز نہ ہوگی۔ وہ تو جاتے ہی رہتے ہیں۔" میں نے بدمزگی سے کہا۔ بھائیوں سے میری وابستگی ہمیشہ سے واجبی سی تھی اور بڑے بھائی نے جب سے پنڈی میں رہائش اختیار کی تھی، ملنا ملانا کم ہونے کی وجہ سے یہ برائے نام وابستگی بھی نہ رہی تھی۔ پچھلے دو تین سالوں میں ان کے بیوی بچے لاہور آئے تو ایک آدھ روز ہمارے ہاں بھی رکے۔ ان کی بیوی کی آرزو سے خوب بنتی تھی، مگر میں کسی کام سے اسلام آباد گیا بھی تو پنڈی جا کر بھائی سے ملنے کا تردد نہ کیا۔ ہاں، چھ ماہ پہلے جب انہیں فالج کا اٹیک ہوا تو میں ضرور عیادت کے لیے گیا تھا لیکن اس کے بعد فون کرکے بھی خیریت دریافت کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ ویسے اس کی خاص ضرورت بھی نہ تھی۔ سارے خاندان کی رپورٹیں پہنچانے کے لیے میری نصف بہتر کافی تھی۔ دنیا جہاں کے مرد گھر آنے کے بعد ٹی وی آن کرتے ہیں۔ بی بی سی، سی این این اور پرائیویٹ چینلز کے ذریعے حالات حاضرہ سے آگہی حاصل کرتے ہیں، لیکن میں بدنصیب...... میری قسمت میں آرزو تھی...... جسے میں آن نہ بھی کرتا تو وہ مجھے دیکھتے ہی خود بخود آن بلکہ چالو ہو جاتی اور سارے خاندان، دور پرے کے واقف کاروں، محلے داروں سے لے کر کام والی ماسی تک کے حالات زندگی کے تازہ ترین سانحوں اور تبدیلیوں سے مجھے باخبر کرتی...... بس نہ کہتی تھی تو اپنی نہ کہتی تھی...... میری نہ سنتی تھی۔

"کبھی تو کسی دوسرے کے بارے میں بھی سوچ لیا کریں۔" اس نے ہاتھ نچایا۔

"پاء جی جب سے بیمار ہوئے ہیں ان کا سارا ٹبر کتنا پریشان رہتا ہے۔ ایک تو ویسے ہی وہ دوسرے شہر رہتے ہیں، ساری برادری سے کٹ کر۔ ان کا کاروبار تو ان کے بڑے لڑکے ساجد نے سنبھال لیا ہے، حالانکہ وہ وچارہ تو خود ابھی "منڈا کھنڈا" (لڑکا بالا) ہے۔ ابھی اس کے یہ سب کرنے کے دن نہ تھے۔ باقی بچے پڑھنے لکھنے والے، باپ کی بیماری سے سہم سے گئے ہیں۔ ایک تو ہمارے جانے سے ویسے ہی انہیں اچھا لگے گا اور اگر ہم مل کر سیر کرنے جائیں گے تو ان کا جی اور بھی بہل جائے گا۔ پاء جی بھی خوش ہوں گے۔"

"اور تم اور بڑی بھابی تو ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے "کیکلی" ڈالو گی۔ اللہ ملائے جوڑی۔"

"ہائے، اب میری عمر کیکلی" ڈالنے کی ہے۔ مجھے شوق نہیں کڑی بن بن کے دکھانے کا۔ ماشاء اللہ جوان بچوں کی ماں ہوں۔ پتر میرے "منڈوں" (شانوں) برابر آ گیا ہے۔ میں ان شوخیوں میں سے نہیں جو "چٹا جھاٹا تتے عقل دا گھاٹا" پہ عمل کرتے ہوئے "بڈھی گھوڑی لال لگام" بنی پھرتی ہیں۔"

"اوہو ماما! آپ دونوں کس بحث میں لگ گئے۔" میرے بیٹے نے اکتا کر کہا۔

البتہ بیٹی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"پاپا! آئی تھنک کہ ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم مری بے شک نہیں جاتے، لیکن بڑے پاپا کے ہاں ضرور جانا چاہیے۔" میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس سے وہ مجھے بہت بڑی بڑی، بہت سمجھدار سی لگی۔

"شاید آرزو ٹھیک کہتی ہے۔ ہمارے بچے اب بڑے ہوگئے ہیں۔" میں نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی گزشتہ دنوں کی سرگرمیوں پہ قدرے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ جن کے ذریعے میں غزالہ درخشاں غزل سے تعلقات استوار کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ کبھی ڈنر پہ انوائٹ کرکے، کبھی بکس فیئر پہ چلنے کی دعوت دے کر تو کبھی کسی کافی ہاؤس میں بلا کر۔ اس سے خوبصورت گفتگو کے دوران میں نے ہمیشہ خود کو پچیس سالہ نوجوان محسوس کیا۔ ان بظاہر بے ضرر سی دوستانہ ملاقاتوں کو خوامخواہ ہی رومانی رنگ دے کر خود ہی اپنی تسکین کرتا رہا۔

"ہماری بیٹی کہتی ہے تو ضرور چلیں گے۔"

ایسا کہتے ہوئے میری اچٹتی ہوئی نظر آرزو پہ گئی تو مجھے اس کا چہرہ بجھتا ہوا محسوس

ہوا، لیکن میں نے اسے وہم سمجھ کے جھٹلا دیا۔

''وہ بھلا اتنی حساس کب سے ہونے لگی۔ اس کا موڈ اس بات پہ تو ہرگز خراب نہیں ہوسکتا کہ میں اسے اہمیت نہ دوں۔ اسے ان باتوں کی پروا ہی کب ہے۔ ہاں، چاول اچھے نہیں نکلے دم دینے کے باجود نرم پڑ گئے خربوزہ پھیکا نکلا، کالا زیرہ مزید مہنگا ہوگیا۔ آپاں صغراں نے پوتی کا رشتہ طے کرتے ہوئے اس سے مشورہ نہیں کیا۔ نئے ہمسائے بڑے روکھے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ان مسائل پہ وہ بخوشی ہلکان ہوسکتی ہے۔

* * *

''اجی، سنتے ہو!''

گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے میں نے اس کی آواز سنی۔ وہ سر پہ مہندی کا لیپ کیے چپل گھسیٹتی میرے پیچھے ہی نکل آئی تھی۔

''آپ سے کچھ منگانا تھا۔'' وہ دوپٹے کا پلو کھول کے کچھ نکالنے لگی۔

''تم چیز بتاؤ، پیسے رہنے دو۔ پہلے بھی تم سے پیسے مانگ کر چیزیں لاتا ہوں۔''

''پیسے نہیں جی! یہ ''لیریں'' ہیں۔ ان کے رنگ کے دھاگے لادیں۔'' اس نے چند دھجیاں سی پلو سے کھول کے میرے آگے لہرائیں۔ میرا خون کھول کے رہ گیا۔

''پکے رنگ کے ہوں، اصلی پری کی نکی لانا۔''

''اصلی پری یا نقلی پری...... میں یہ خرافات نہیں لاسکتا۔ سبزی گوشت کے بعد اب تم مجھے سوئیاں دھاگے خریدنے کی طرف لگانا چاہتی ہو۔ آرزو بیگم! تمہارا دماغ خراب ہوچکا ہے۔ میں ریحان علی فلک ...... یہ سب خریدوں گا۔ یہ درزیوں والا سامان۔''

''آپ ہر بار مجھے اپنا نام کیوں بتاتے ہو۔'' اس نے دوبارہ پلو میں بڑی سی گرہ باندھ لی۔

''نہیں تے ناں سہی...... میرے کوئی پیر نہیں ٹوٹے ہوئے، نکڑ کی دکان سے آپ جا کر لاسکتی ہوں۔ یہ تو مہندی تھپی ہوئی ہے، اس لیے آپ سے کہہ دیا۔ کوئی بات نہیں، میں چادر کی بکل مار کے لے آؤں گی۔''

''ہاں جانا ضرور ہے۔ اتنا ضروری کام نہیں یہ دھاگے وغیرہ لانا۔ خبردار جو اس بے کار حلیے میں باہر نکلیں۔'' میں نے ناپسندیدگی سے اس کے بالوں کو دیکھا، جن پہ تازہ تھپی گاڑھی گاڑھی بدرنگ اور بدبودار مہندی کہیں کہیں سے ٹپک کے کانوں اور ماتھے تک آرہی تھی۔ اور بال ایک بدوضع جوڑے میں لٹے تھے۔ کل کا دھلا چہرہ تھکن کی کہانی کہہ رہا

تھا۔ کھینچ کر بنائے بالوں کی وجہ سے اس کی چندھی چندھی آنکھیں بالکل منگولیہ نسل کی جنگ جو شہزادیوں جیسی لگ رہی تھیں۔ جامن چوس چوس کر کھانے کی وجہ سے ہونٹوں پہ ان کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ کل والے جامنی اور زرد سوٹ کی شلوار تو وہی تھی، البتہ قمیص پہ کل رائتہ گر جانے کی وجہ سے تبدیل کرنے کی زحمت کرلی گئی تھی اور سبز رنگ کی اس ڈھیلی قمیص کے اوپر اس نے پرانا سا ایک گھسا ہوا تولیہ شانوں پہ ڈال رکھا تھا تاکہ مہندی قمیص پہ گر کے نشان نہ چھوڑ جائے۔

''توبہ!'' اس نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ ''اچھا ٹھہریں' یہ تو لیتے جائیں۔''

''اب یہ کیا بلا ہے؟'' میں نے پلاسٹک کے اس ایئر ٹائٹ جار کو دیکھا۔

''یہ فالسے کا اچار ہے۔ وڈی آپاں کی نکی ''نوں'' (بہو) خیر سے دو جے جی کو ہے۔ کہہ رہی تھی۔ مامی جی! آپ کے ہاتھ کا اچار کھانے کو دل کررہا ہے۔ خاص اس کے لیے بنایا ہے' ضرور دے کر آنا۔'' اس نے میری بڑی بہن کا نام لیا۔

''ایک تو تمہارا یہ ''سوشل ورک''۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے وہ جار تھام لیا ویسے بھی آج میں پہلی بار غزالہ کے گھر جارہا تھا اور اس کے گھر یعنی ڈیفنس جاتے ہوئے راستے میں فردوس مارکیٹ تو آتی ہی تھی۔ جہاں آپا رہتی تھیں۔ البتہ یہ کہنا مشکل تھا کہ آپا میری جان بخشنے میں کتنی دیر لگاتی ہیں۔ میں ان کے ہاتھ کم ہی آیا کرتا اور جب آجاتا تو پھر اتنی جلدی وہ مجھے اپنے شکنجے سے نکلنے نہیں دیتی تھیں۔

''بعد میں جاؤں گا تو غزالہ کے ساتھ گزارے حسین لمحات کا سرور وہ بھک سے اڑا کے رکھ دیں گی۔ بہتر ہے، پہلے ہی اپنا خون جلالوں' بعد میں افاقہ تو ہونا ہی ہے۔''

یہ سوچ کر میں وہاں جانے سے پہلے ہی آپا کے ہاں پہنچ گیا۔ حسب توقع انہوں نے میرے لتے لینے میں دیر نہ لگائی۔

''آؤ آؤ بھائی! اے تابندہ...... ذرا گھی تو لانا اصلی والا ..... میں اپنے پردیسی بھائی کے قدم رکھنے سے پہلے دہلیز میں ڈالوں..... خیر سے آج چاند دن چڑھے کہاں سے نکل آیا۔''

ابھی میں شرمندہ ہونے کی ایکٹنگ کرنے ہی والا تھا کہ وہ بھولپن کی ایکٹنگ کے تمام ریکارڈ توڑنے لگیں۔

''ہائے ہائے کسی نے تمہیں میرے مرنے کی جھوٹی اطلاع تو نہیں دے دی جو تم بھاگے چلے آئے۔ جاؤ بھائی' اپنے کام دھندے پہ جاؤ۔ میں تو بھلی چنگی زندہ سلامت بیٹھی

ہوں' خوامخواہ تمہیں چکر پڑا۔"

"کمال کرتی ہیں آپا۔" اب کے شرمندگی واقعی میرے اندر عود کر آئی۔

"یہ اچار آرزو نے بھیجا تھا۔" میں نے جار آگے کیا۔ آپا کے خفا خفا سے چہرے پہ ایک دم ٹھنڈی میٹھی مسکراہٹ سکون سے پھیل گئی۔ میں سوچنے لگا یہ اچار سے ان کا دلی لگاؤ ہے یا آرزو کے نام کا اعجاز' جواب انہوں نے خود دے دیا۔

"جیتی رہے ہماری بھر جائی۔" ان کی آواز گلوگیر ہوئی۔ "یہ کام تو آرزو ہی کر سکتی تھی۔ یہ اس کی ہی محبت ہے کتنا خیال ہے اسے اس بہن کے جذبات کا۔"

"اب ایسا بھی کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا اس نے' خود جی بھر کے چٹوری ہے۔ سارا سال ہی چٹنیاں' چار' مربے' مرتبان بھر بھر کے ڈالتی ہے۔ یہ پاؤ بھر کا آپ کے لیے بھیج کے ایسا کیا تیر مار ڈالا اس نے۔"

"بات اچار کی نہیں ہے ریحان' ارے جھلے! یہ اچار تو نرا بہانا ہے۔ پرسوں ہی فون پہ اس سے بات ہوئی۔ تیرے لیے بڑی اداس تھی میں اور آرزو......وہ تو دلوں میں اترنے کا فن جانتی ہے۔"

اچھا آ.....آ....." میں نے حیرت سے اس انکشاف پہ نعرہ بلند کیا۔

"اور کیا.....دیکھ.....اس اچار کے بہانے تجھے یہاں بھیج دیا۔ میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ تجھے کیا پتا' ماں جائے کا سایہ بھی نظر آئے تو بہنوں کو کتنا سکھ ملتا ہے۔ اک سات سمندر پار بیٹھا ہے' دوجا پنڈی جا بسا' لیکن سچ کہتی ہوں' وہ اتنے دور نہیں لگتے۔ جتنا تو لگتا ہے۔ ایک شہر میں رہ کر بھی تو نے خود کو کتنا الگ کر لیا ہے۔"

"بس آپا.....! مصروفیت۔"

"رہنے دے' رہنے دے.....وہ جو دوسرے ملک سے مہینے بعد فون کرتا ہے۔ پانچ سات منٹ کی کال میں اتنا دل ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ اور تو.....جارے ریحان؟ تجھے تو نہ رشتے نبھانے آئے نہ محبت جتانی آئی۔" وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگیں۔ ان کی بہو تابندہ میرے لیے شربت لے آئی۔ میرا قطعی موڈ نہ تھا۔ کچھ دیر اور بیٹھ کے یہ شربت پینے کا۔ بلکہ میرا ارادہ تو کھڑے کھڑے سلام کر کے اچار تھما کے واپس جانے کا تھا لیکن اس جذباتی اور ڈرامائی صورتحال سے اس طرح غائب ہو جانے کا مطلب تھا اس ڈرامے کے دورانیے کو مزید طویل کرنا۔

"پتا نہیں تیری کون سی نیکی اللہ کو پسند آ گئی یا اللہ بخشے اماں جی' ابا جی کی دعائیں

کام آئیں جو تیرے نصیب میں آرزو جیسی گھر جوڑنے والی عورت آئی۔ یہ اس کے کرم ہیں تو خاندان سے جڑا بیٹھا ہے ورنہ تیرے کرتوت ایسے نہیں تھے جو کوئی تیرے ساتھ تعلقات برقرار رکھ پاتا اوروں کے بھی کام دھندے ہوتے ہیں لیکن ایک آواز پہ سارے بہن بھائی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹتے ہیں اور تو.....نہ کسی کی خوشی میں شریک.....نہ غمی میں شریک.....تیری کسر بھی آرزو پوری کر دیتی ہے۔ کہیں کوئی بیمار ہو' وہ سب سے پہلے پہنچے گی۔ کسی کا بچہ پاس ہو۔ سب سے پہلے مٹھائی لے کر وہ آئے گی۔ کسی کے گھر شادی ہو' آدھے کام وہ سنبھالے گی۔ تیری تو دنیا بنا دی اس نے۔"

ہمیشہ کی طرح آج بھی میں ان کی زبانی "آرزو نامہ" سن کر اوب گیا۔ سر جھٹکتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا آپا! میرا خیال ہے' میرے آنے سے آپ کو مایوسی ہوئی ہے۔ آرزو کو ہی آنا چاہیے تھا۔ شاید آپ بھی خوش ہوتیں۔ چلتا ہوں۔" وہ تاسف بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں۔ ان کی بہو فوراً کچن سے نکلی۔

"ماموں جانی! چائے پی کے جائیے گا۔"

"پھر کبھی سہی۔" میں ٹالتا ہوا راہداری کی جانب مڑ گیا۔ پیچھے سے تابندہ کا حیران سا تبصرہ سنائی دیا۔

"ممانی کتنی محبت کرنے والی' کتنی پر خلوص سی ہیں۔ ماموں جیسے روکھے پھیکے اور خشک مزاج انسان سے کیسے گزارا ہو جاتا ہے ان کا۔"

اس سوال پہ میں تڑپ ہی تو گیا۔ سخت ناانصافی تھی یہ' بجائے اس کے کہ مجھ سے ہمدردی جتائی جاتی کہ میں اس کے ساتھ گزارا کر رہا ہوں' الٹا ممانی صاحبہ پہ ہمدردی کی بالٹیاں بھر بھر انڈیلی جا رہی تھیں۔ لاشعوری طور پر میں آپا کا جواب سننے کے لیے رک گیا۔

"بس تابندہ! مقدروں کے کھیل' رب سوہنا جانے کس کام میں اس کی کیا مصلحت ہے۔ میں ابھی اپنے ویر کے اچھے نصیبوں کا شکر ادا کر رہی تھی' شاید اس جوڑی ملانے کے پیچھے اللہ کی یہی مرضی ہو کہ اس ناشکرے انسان کی زندگی آرزو جیسی عورت کی وجہ سے سنور جائے لیکن آرزو.....اس بھلی عورت کو کیا ملا....."

"ہم سب لوگوں کی محبت امی جان.....اور کیا.....کیا کوئی نند' بھاوج کے لیے ایسے جذبات رکھ سکتی ہے جیسے آپ کے ہیں۔ اگر ممانی جان کو اتنی محبت ملی ہے تو یہ بھی ایک طرح سے ان کے خلوص اور بے لوث محبت کا صلہ....."

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میں فوراً باہر نکل گیا۔

* * *

ڈیفنس کے Y بلاک کا سب سے عالیشان بنگلہ غزالہ کا تھا۔ مجھے اپنی سیکنڈ ہینڈ سوزوکی اس کے بڑے سے منقش عالیشان آہنی گیٹ سے اندر لے جاتے ہوئے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ پورٹیکو میں مرسڈیز' ہنڈا اکارڈ اور مزدا ہائیٹ چم چم کرتی لشکارے مار رہی تھیں' لش گرین لان میں سنگ مرمر کے بنے بینچ' چیئرز اور شیڈ لگے تھے۔ مصنوعی آبشار بھی تھی میں مرعوب ہوتا اندر داخل ہوا۔ آراستہ و پیراستہ کوریڈور سے لے جاتے ہوئے ملازم نے مجھے ایک سجے سجائے لاؤنج میں لا بٹھایا۔ میں ایک بیش قیمت دبیز صوفے میں دھنسا سامنے کی دیوار میں نصب ساٹھ انچ کی اسکرین پہ انڈیا پاکستان کا میچ دیکھ رہا تھا۔ جب آغا غفور کی آمد ہوئی۔ وہ ایک پستہ قامت' فربہ اندام اور تقریباً گنجا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ یقیناً مجھ سے بھی دس بارہ سال پہلے کی پیداوار......اس کی توند میری منی سی توند کے مقابلے میں اتنی ہی وسیع تھی جتنی اس کی مالی حیثیت میری مخدوش حالت سے بڑھ کے تھی۔ وہ مسکرایا تو اس کے کتھے اور چونے سے سبز پڑتے گلے سڑے دانت اور پیلے مسوڑھے دیکھ کر مجھے ابکائی سی آگئی۔

''تشریف رکھیے۔'' اس کی آواز اس کے جثے سے قطعی مطابقت نہ رکھتی تھی' منحنی سی' منمناتی ہوئی کسی خوفزدہ نوزائیدہ میمنے جیسی۔

''گجالہ آپ کا بڑا ذکر کرتی ہے۔''

''جی بس' ذرہ نوازی ہے ان کی۔''

''سنا ہے آپ بھی شاعر ماعر ہو' کتاب وتاب لکھتے ہو۔'' اس سوال پہ میں کان کھجا کے رہ گیا۔

''اپنی گجالہ کو بھی بڑا چسکہ ہے کتاب وتاب لکھنے کا' میں نے کہا۔ میرا دھن دولت کس کام کا.....جو تیرا شوق پورا نہ کر سکے۔ جا لکھ' جو لکھنا ہے لکھ لے۔ میں چھپواؤں گا۔ سالا کوئی نہ خریدے تو ساری کتابیں بھی میں کھود کھریدلوں گا۔''

''جی جی.....بتاتی ہے وہ کہ آپ بہت محبت کرتے ہیں اس سے۔'' وہ یوں شرمایا جیسے سولہ سالہ دوشیزہ کی پوشیدہ محبت کا بھانڈا کسی سکھی سہیلی نے سر عام پھوڑ ڈالا ہو۔

''ویسے غزالہ صاحبہ ہیں کہاں؟'' بہت محتاط ہوکر میں نے سوال کیا۔ بے شک وہ شوہروں کی اس قسم میں سے نہیں تھا جو بلا وجہ غیرت کھا بیٹھتے ہیں۔ پھر بھی احتیاط لازم تھی۔

''سو رہی تھی' رشیداں کو بول کے تو آیا میں' کہ میڈم کو جگا دو' کہ مہمان آیا ہے۔ لیکن سالی وہ بھی ڈرتی ہے میری طرح کہ میڈم سر ہی نہ پھاڑ دے۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ابھی اس کے قہقہے کی گونج ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک دہشت ناک چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی ایک ہیبت ناک واویلا۔

''ذرا سکون نہیں اس گھر میں۔ ہزار بار کہا ہے مجھے کچی نیند سے جگانے کی جرات مت کیا کرو۔''

سیڑھیوں سے کچھ لڑھکنے کی آواز آئی' شاید کوئی گلاس' مگ وغیرہ تھا۔

''بی بی! صاحب نے بولا تھا۔'' ملازمہ کی سہمی ہوئی آواز پہ میرے سامنے بیٹھے آغا غفور کی سیاہ رنگت ایک دم مٹیالی پڑ گئی۔ اس کے جامنی ہونٹ' زرد ہو گئے۔ لاؤنج کا پردہ ہٹا اور ایک بکھرے بالوں والی غضب ناک عورت پھنکارتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''کیا تکلیف تھی تمہیں غفور کے بچے' کتنی بار کہا ہے چھٹی کا یہ دن سکون سے گزار لیا کرو۔ کہیں باہر دفع ہو جایا کرو۔ سارا دن میرا خون جلانے گھر میں دندناتے پھرتے ہو۔'' وہ مٹھیاں بھینچے اس پہ چلا رہی تھی۔

''گجالہ.....گجالہ.....میری جان.....تم بھول گئیں.....تم نے آج پھلک صاب کو گھر بلایا تھا۔ اچھا تو نہیں لگتا' مہمان بیٹھا ہے اور میزبان گائب۔'' اس نے ڈر کے پاؤں تک سمیٹ کے صوفے پر کر لیے۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ روکھے بکھرے بالوں والی' پھیکی رنگت پہ بدنما چھائیوں والی' سوجھی ہوئی بے کشش گدلائی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں والی اور کرخت آواز میں انتہائی بھونڈے طریقے سے چلاتی ہوئی یہ عورت غزالہ ورخشاں غزل ہے۔

وہ غزالہ جس کی ہر ہر ادا میں غزل کا سا بانکپن ہے۔ جس کی لوچ دار آواز میں گیتوں کا ترنم.....جس کے خوابناک لہجے میں نظم کی سی نزاکت.....جس کے ابروؤں کی خفیف سی جنبش بھی ہزار فسانے کہہ ڈالتی تھی۔ اس کے وہی ابرو اس وقت آنکھوں سمیت ماتھے سے بھی اوپر جا لگے تھے۔ وہ جس کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ شاعرانہ تخیل کی مکین لگا کرتی تھی' اس وقت شعلے برسا رہی تھی۔ اس نے رخ موڑ کے مجھے دیکھا۔ اچانک اس کے چہرے پر زبردست تغیر پیدا ہوا اور وہ ''ایکسکیوزمی'' کہتی واپس مڑ گئی۔ آغا غفور نے کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ وضاحت پیش کی۔

''اپنی گجالہ گسّے کی ذرا تیج ہے۔ آئے گئے کا بھی لحاج نہیں کرتی۔''

"میرا خیال ہے' مجھے چلنا چاہیے' شاید غزالہ صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" مجھے خاصا برا محسوس ہوا کہ وہ مجھ پہ توجہ دیے بغیر واپس لوٹ گئی۔

"نہیں پھلک صاب' بیٹھو یار' اصل میں گجالہ نے آپ کو دیکھا نہیں' سویرے سویرے اس نے آنکھوں میں وہ نہیں لگائے ناں......وہ کیا بولتے ہیں آپ لوگ اسے.....ہاں....."

"اوہ لینس.....تو غزالہ لینسز بھی لگاتی ہیں۔"

"ہاں پہلے تو چشمہ وشمہ لگاتی تھی۔ پر اب کہاں فیشن ہے ان چشموں کا......سالی ناک بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔"

"مام کہاں ہے.....؟" اس آواز پہ میں نے چونک کے سامنے دیکھا۔ جاناں سے سال بھر ہی بڑی ایک لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ براؤن تراشیدہ بال ہیئر بینڈ میں جکڑے ہوئے۔ نوعمر چہرے پہ میک اپ کی آمیزش نے کچھ پکا پن پیدا کر دیا تھا' گھٹنوں سے ذرا نیچے تک ختم ہوتا وائٹ اسکن ٹائٹ ٹراؤزر..... پنڈلیوں پہ بنے ٹاٹوز..... ہائی ہیل سینڈل جسم سے چپکی شرٹ جس سے شانے اور گردن کا خاصا حصہ نمایاں ہو رہا تھا' اس چودہ پندرہ سالہ بچی کا یہ بے باک حلیہ دیکھ کر مجھے خفت نے آن گھیرا' مجھے یوں بے چینی سی ہونے لگی جیسے خدانخواستہ میری جاناں.....حالاں کہ کتنی کم عمری میں ہی آرزو نے اس کے فراک اسکرٹ وغیرہ چھڑوا دیے تھے۔ کبھی کبھار وہ جینز پہن لیا کرتی' مگر ڈھیلی ڈھالی لمبی سی ٹی شرٹ اور اسکارف کے ساتھ.....وہ بھی گھر کے اندر..... باہر جاتے ہوئے سلیقے سے دوپٹہ شانوں پہ پھیلانا اس نے گیارہ بارہ سال کی عمر میں ہی سیکھ لیا تھا۔ جب کہ آغا غفور اطمینان سے ریموٹ ہاتھ میں لیے چینل چینج کر رہا تھا۔

"میں آپ سے بات کر رہی ہوں انکل! ویراز مائی مام......" وہ بالکل غزالہ کے انداز میں چلائی۔

"ارے بی بی' تم کو مالوم ہے' وہ اتنی سویرے کدھر جائے گی۔ ہوگی اندر اپنے کمرے ومرے میں۔"

"اوکے' انہیں بتا دیں۔ میں اپنے فرینڈ کے ساتھ آؤٹنگ پہ جا رہی ہوں۔ لیٹ آؤں گی۔" وہ چیونگم چباتی.....بغیر کسی سلام دعا کے تکلف میں پڑے باہر نکل گئی۔ میں نے تعارف جاننا چاہا۔

"بیٹی ہے ہماری۔" وہ اپنے گلے سڑے دانت دکھاتے ہوئے مسکرایا۔

"لیکن وہ تو آپ کو انکل....."

"ہاں بچی ہے ناں.....ابھی دل سے میرے کو پاپا نہیں مانا.....یہ اصل میں گجالہ کے پہلے والے ہسبینڈ سے....."

"اوہ.....آئی سی.....' اس کا ذکر غزالہ نے اب تک مجھ سے نہیں کیا تھا کہ دو شوہروں کے ساتھ ساتھ وہ ماضی میں ان کے حوالے سے حاصل کی گئی یادگاریں بھی رکھتی ہے۔ میں نے گردن گھما کے باہر لان میں دیکھا' وہ ایک ہپی نما لڑکے سے بے تکلفی سے گلے مل رہی تھی۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اچھل کے اس کی ہیوی بائیک پہ سوار ہوئی اور تقریباً چپک کے بیٹھ گئی۔ میں نے آغا غفور کا ردعمل جانچنا چاہا۔ وہ اسی اطمینان کے ساتھ پان چبا رہا تھا۔ شاید اس نے بھی دل سے خود کو اس بچی کا پاپا نہیں مانا تھا۔

"اوہ آئم رئیلی ویری سوری فلک جی!" غزالہ ایک بار پھر موجود تھی اپنے اسی سدا بہار رنگ روپ اور پرتکلف مرصع لب و لہجے سمیت۔ نجانے اسے کون سا منتر آتا تھا کہ دس پندرہ منٹ میں اس نے اپنی کایا پلٹ دی تھی۔ گدلی آنکھوں پہ وہی نیلگوں لینس سجے تھے۔ پلکیں بھی دراز ہو چکی تھیں' جھائیاں' حلقے سب غائب.....

"ایکچوئیلی رات کو ایک لیٹ نائٹ فنکشن کی وجہ سے سونے میں دیر ہو گئی۔ آپ نے کچھ لیا فلک جی....." اچانک پینترا بدل کے وہ اپنے سرتاج سے مخاطب ہوئی۔

"غفور! صرف باتیں ہی بگھاریں یا مہمان کو چائے وغیرہ بھی پوچھی۔ ویسے تم سے امید تو نہیں....."

"ٹھنڈا منڈا تو پلا دیا۔ چائے کے لئے اس لیے نہیں بولا کہ تم نے تو پھلک صاب کو دوپہر کے کھانے پہ بلا رکھا ہے۔"

"رہے ناں تم وہی اجڈ کے اجڈ' یعنی اگر کسی کو لنچ پہ انوائیٹ کیا جائے تو چائے کا تکلف اضافی ہوتا ہے۔"

"پلیز' غزالہ....." "عزت افزائی آغا صاحب کی ہو رہی تھی' چہرہ میرا سرخ پڑ گیا۔ میں نے اسے مزید گل افشانی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"جاؤ دیکھو' کچن میں کیا ہو رہا ہے۔ رات کو میں نے جو جو کہا تھا' ٹھیک وہی کچھ بن رہا ہے یا نہیں۔" اس نے نخوت سے اپنے سرتاج کو وہاں سے چلتا کیا۔ اس کے غائب ہوتے ہی غزالہ نے "ہونہہ" کہہ کر زور سے سر جھٹکا۔ لمحہ بھر کی دیر تھی' اس کی ناگوار

تیوریاں پھر سے غائب ہو گئیں' چہرے پہ میٹھی مسکان اور لہجے میں شیرینی پھر سے گھل گئی۔

''تو یہ ہے تمہاری انڈراسٹینڈنگ'' میں نے کریدا۔

''ہاں شکر ہے اللہ کا' کی گزارا ہو رہا ہے۔'' اس نے صبر و قناعت کی دیوی بننے کا مظاہرہ کیا۔

''کون کہتا ہے کہ آج عورت سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔ یہ سمجھوتہ نہیں تو اور کیا ہے' ہاں آج کی عورت خود کو کچل کے نہیں رہ سکتی۔ اخلاق کے ساتھ رہنا خود کو پل پل مارنے کے مترادف تھا۔ کوئی ایک بات ایسی نہیں تھی جس پہ وہ مجھ سے متفق ہوتا۔ کمرے کی کلر اسکیم' باتھ روم میں رکھا شیمپو' ناشتے میں کھائے جانے والے جیم کا برانڈ.....اف ہر معاملے میں اپنی پسند ناپسند تھوپنا اس پہ فرض تھا۔ اگر اسے اورنج مارملیڈ پسند نہیں تو کیا وہ میری خاطر کھا نہیں سکتا تھا۔ اگر مجھے اسکائی بلیو کلر سے نفرت ہے تو کیا وہ اس کلر کی شرٹس پہننا ترک نہیں کر سکتا تھا۔ سب ہی کچھ میں کیوں کرتی۔ آخر کب تک اپنا دل جلاتی۔ اسے ہر ہفتے اسکائی بلیو شرٹ باقاعدگی سے پہنے دیکھ کر کڑھتی رہتی۔

فرائی انڈہ سے سخت چڑ ہے مجھے اور وہ میرے سامنے بیٹھ کر.....میری فیلنگز کی رتی برابر پروا کیے بغیر دو دو فرائی انڈے کھا جاتا تھا.....سوچو کتنا مشکل تھا میرے لیے اس کے ساتھ رہنا اور وہ سیٹھ باٹلی والا..... اس کا اپنا نفسیاتی مسئلہ تھا۔ اسے بیوی چاہیے تھی.....ٹیپکل سیٹھانی' ہر سال ایک بچہ پیدا کرنے والی..... دن بھر گھرداری میں الجھی رہنے والی' شام بن ٹھن کر سیروں سونا لاد کر اس کے ساتھ پارٹیز میں جا کر بگھارنے والا۔ میں نے اس کے لیے یہاں تک کیا کہ ڈھائی سالوں میں دو بیٹے تک پیدا کیے۔ لیکن .....جی! میں اس کی پسند کے بھاری بھاری زیورات نہیں پہن سکتی تھی۔ دوسرا وہ میری شاعری کا' میری صلاحیتوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ میرے فن کی قدر نہیں تھی اسے' اس لیے میں نے الگ ہو جانا مناسب سمجھا۔ وہ اولاد جمع کرنے کا شوقین' اس نے بیٹے اپنے پاس رکھ لیے' سب سمجھتے تھے کہ میں گھر بسانے والی عورت ہی نہیں' حتیٰ کہ میرے اپنے ماں باپ بھی' آپ بتائیے فلک جی! کیا میں ایسی ہوں؟'' اس نے اتنے مان سے سوال کیا کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اب آغا غفور کے ساتھ بھی تو گزارا کر رہی ہوں۔ بھئی جہاں تک چھوٹے موٹے سمجھوتوں کا تعلق ہے ان سے میں نہیں گھبراتی۔ آخر ہوں تو ایک مشرقی لڑکی اپنی تمام تر روشن خیالی اور آزاد پسند فطرت کے باوجود۔'' اگر کچھ دیر قبل میں اس کا بغیر میک اپ کا

چہرہ نہ دیکھ چکا ہوتا تو شاید اس کا خود کو لڑکی کہنا آسانی سے ہضم کر جاتا لیکن اس وقت اس کا یہ دعوا میرے حلق میں اٹک گیا۔

''آغا غفور کی کتنی باتیں ہیں جنہیں میں دل پہ پتھر رکھ کے جھیل رہی ہوں' آپ ہی بتائیے فلک جی! کیا آج کی عورت کا یہی مقدر ہے کہ وہ اپنے اوپر صرف باوفا اور صابر ہونے کا ٹیگ لگوائے رکھنے کے لیے صبر سے سب کچھ برداشت کرتی جائے۔''

''گجالہ! ٹیبل لگ گئی ہے' مہمان کو کھانے پہ لے آؤ۔'' اچانک آغا غفور اپنی قدرتی ڈھیٹ مسکراہٹ کے ساتھ یہ پیغام لیے حاضر ہوا۔'' غزالہ اپنے زریں فرمودات اس حد تک میرے اندر ٹھونس چکی تھی کہ اب مزید کچھ کھانے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر ایک اچھے مہمان کی طرح میں غزالہ کی سنگت میں ڈائننگ ہال تک چلا آیا جو واقعی ایک ''ہال'' ہی تھا۔

اٹھارہ کرسیوں والی وہ گلاس ٹاپ' براس میڈ ڈائننگ ٹیبل انواع واقسام کے کھانوں سے سجی تھی۔ بلکہ اٹی پڑی تھی۔ ایک نظر ڈال کر ہی میرا تو دل گھبرا سا گیا۔ تین چائنیز' دو اٹالین اور کم از کم چھ روایتی پرتکلف دیسی ڈشز کے علاوہ بازار سے منگائے آئٹم بھی صاف پہچانے جا رہے تھے۔ مثلاً مٹن تکہ' چکن کباب اور پزا...... اپنی نشست سنبھالتے ہوئے میں نے ایک اور عجیب منظر دیکھا۔ آغا غفور اپنی پلیٹ ہاتھ میں تھامے غزالہ کے روبرو مودبانہ کھڑا تھا۔ جو کلف زدہ نیپکن کھول کر اپنے آگے پھیلا رہی تھی۔ ایک شان بے نیازی کے ساتھ جب اس نے اپنے شوہر کی پیش کردہ پلیٹ تھامی تو مجھے میاں بیوی کی اس محبت پہ رشک سا ہوا.....واقعی کیا آئیڈیل شوہر تھا۔ (کم از کم ایک بیوی کی نظر میں) جو خود بڑھ کے پلیٹ پیش کر رہا تھا۔

''لاؤ بھئی' پہلے تمہارا کھانا ڈال دوں۔'' غزالہ کے کہنے پہ مجھے مزید رشک محسوس ہوا۔ یعنی اس میں بھی مشرقی بیویوں والی ادائیں پائی جاتی ہیں' خود کچھ کھانے سے پہلے شوہر کی پلیٹ بھرنا' میں دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ غزالہ نے پلیٹ کے ایک کونے میں فریش سلاد' کچھ رائتہ رکھا۔ چمچی بھر پاستا ڈالا۔ مٹن تکے میں سے ایک لاغر سی چانپ منتخب کی۔ اور باقی ماندہ بچے حصے کو ماش کی دال سے بھر دیا۔

''گجالہ! تھوڑے سے چاول بھی.....'' وہ گھگیایا۔

''توند دیکھی ہے اپنی۔'' وہ پھنکاری۔ ''وزن تو ایسے بڑھتا جا رہا ہے جیسے عدنان سمیع سے شرط لگا رکھی ہو' نہ چاول' نہ کباب' نہ سویٹ ڈش......''

وہ چپ چاپ اپنی پلیٹ لیے ڈائننگ ہال سے نکل گیا۔

''یہ آغا صاحب کہاں چلے گئے' کیا وہ ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے.....؟''

''آغا صاحب کو نہ صرف شوگر ہے بلکہ کولیسٹرول لیول بھی لاسٹ لمٹ کراس کر رہا ہے۔

یہاں بیٹھے تو ندیدی نظروں سے ہر چیز کو تکتے رہیں گے۔'' وہ استہزائیہ ہنسی۔

'نہ آپ کو کچھ ہضم ہوگا نہ مجھے۔ ویسے بھی فلک جی! میں ٹھہری نفاست پسند شاعرہ' آپ تصور نہیں کر سکتے' اسے اپنے سامنے کھانا کھاتے دیکھ کر میری نفیس طبع پہ کیا ستم ٹوٹتے ہیں.....اس کی ''چپ چپ...'' کر کے چبانے کی آواز.....اوانو.....ہوریبل'' اس نے کراہیت سے منہ بنایا تو میں تھرا اٹھا۔

اچانک مجھے کئی سال پہلے کا واقعہ یاد آیا۔ حالات ذرا بہتر ہوتے ہی میں نے تب آرزو کو ایک کل وقتی ادھیڑ عمر ملازمہ رکھ کے دی تھی۔ جب دونوں اوپر تلے کے بچے چھوٹے تھے۔ ماسی شنو کو جب پہلے دن آرزو نے آواز دے کر کھانے پہ بلایا تو میں نے خاص نوٹس نہ لیا' لیکن جب وہ میرے سامنے ہی فرش پہ پھسکڑا مار کے بیٹھی' ہاتھ میں روٹی رکھ کے' روٹی پہ سالن ڈال کے.....شڑوں شڑوں اور چپڑ چپڑ کی آوازوں کے ساتھ کھانا کھانے لگی تو مجھے سخت ناگواری محسوس ہوئی۔ کھانے کے بعد میں نے سخت الفاظ میں آرزو کو تنبیہ کی۔

''آئندہ سے ماسی کو کچن میں کھانا دے دیا کرو۔''

''سارا دن تو گرمی میں کام کرتی ہے۔ روٹی بھی گرمی میں بیٹھ کے کھائے گی تو کیا سواد آئے گا وچاری کو۔ ادھر پنکھے کے نیچے بیٹھ کے کھاتی آپ کا کیا لیتی ہے۔''

''گھر میں اور بھی پنکھے لگے ہیں' کہیں بھی بٹھا دو۔ مگر یہاں نہیں۔ بچے کیا سیکھیں گے' کل کو وہ بھی اسی طرح بدتہذیبی سے کھائیں گے۔''

''خوامخواہ میں.....وہ آپ کے بچے ہیں' جو آپ سکھاؤ گے وہی سیکھیں گے ماسی وچاری کا کیا قصور' ہر بندہ اپنے ماحول سے سیکھتا ہے اور وہ تو سیکھنے کی عمر سے بہت آگے نکل آئی ہے' نہ ریحان صاحب! بڑے بول نہ بولو' اللہ کو تکبر پسند نہیں۔ پتا نہیں میں ماسی کو یہ بات بولوں تو اس کا کتنا دل دکھے.....ناں جی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے' میرا ہنستا بستا گھر..... میں کس لیے کسی غریب کا دل دکھا کر ''ہائے'' لوں۔ اللہ معاف کرے جی.....مجھے بھی اور آپ کو بھی.....''

اور اس وقت میرے سامنے بیٹھی وہ عورت...جس کا موازنہ کبھی اپنی بیوی جیسی ایوریج عورت سے کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا' کسی ملازم کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے شریک حیات کے ساتھ ایسا سلوک کر رہی تھی جو کسی بھی طرح انسانی نہیں کہلایا جا سکتا تھا۔

میرا جی کھانے سے اچاٹ ہو گیا۔

''آپ تو کچھ لے ہی نہیں رہے فلک جی' پلیز کچھ اور لیجیے ناں' ایسا کرتے ہیں' چائے ہم اسٹڈی میں منگوا لیتے ہیں۔ ساتھ میں ایک بھرپور ادبی گفتگو ہو جائے تو کیا ہی کہنے' آپ جیسے انسان کی صحبت روز روز تو میسر نہیں آتی۔''

لیکن اب مجھے اس کی مزید صحبت کی خواہش رہی تھی نہ ہی اس کی ذہانت سے بھرپور خوبصورت گفتگو سے لطف اندوز ہونے کی۔ میں جلد ہی معذرت کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

* * *

''آ گئے خیر سے۔'' وہ آج بھی خربوزوں سے دل بہلا رہی تھی۔ ایک نظر میرا چہرہ دیکھنے کے بعد وہ اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں روٹی گرم کرتی ہوں۔''

''تمہیں پتا تو ہے کہ میں کھانے کی دعوت سے ہی آ رہا ہوں۔''

''رجے پیٹ والوں کی شکل پہ ایسے بارہ نہیں بجے ہوتے۔'' وہ ہاتھ اور سر دونوں جھٹکتی میرے دعوے کو جھٹلا گئی۔ اور میں پہلے کی طرح اس کے درست اندازے پہ پیچ و تاب نہ کھا سکا۔ چند ہی منٹ بعد ٹرے میرے سامنے تھی۔ آلو کا پراٹھا، لسوڑھے کا اچار، زیرے والا رائتہ اور کالی مرچ والا کھیرا، میں کافی دنوں سے آلو کے پراٹھے کی فرمائش کر رہا تھا جسے آرزو کمال بے اعتنائی سے درگزر کرتی آ رہی تھی اور آج جب کہ میں کھانے پہ موجود نہیں تھا۔ میری پسندیدہ چیز بنی تھی۔ اس ناانصافی پہ میں آواز بلند کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''لو، اتنے دنوں سے تو کھانس کھانس کے کان لے لیے ہیں آپ نے۔ ایک تو آلو ویسے ہی بلغمی کھانسی میں نقصان کرتے ہیں، دوسرا آپ اچار بغیر پراٹھا لیتے نہیں۔ میرا کیا دماغ خراب تھا، ساری رات آپ کھانستے، میں جاگتی رہتی، مفت کا سیاپا......''

میں مسکرایا تو وہ حیرت زدہ سی میرے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

''میں نے کہا۔ اجی! سنتے ہو؟''

''سن رہا ہوں۔'' میں نے خستہ لذیذ پراٹھے کے لقمے سے لطف اندوز ہوتے

ہوئے کہا۔

''بڑے اچھے موڈ میں لگ رہے ہو جی، لگتا ہے وہاں خوب مزا آیا۔ بڑے بڑے لوگ ہوں گے، بڑی بڑی باتیں ہوں گی ان کی۔''

''ہاں لوگ تو بڑے تھے...... مگر باتیں...... میں بڑبڑا کے رہ گیا۔ میری خود کلامی کو نہ سمجھتے ہوئے وہ برتن اٹھا کر کچن کی طرف مڑنے لگی۔

''آرزو! میں نے کہا، سنتی ہو۔؟''

''ہیں جی؟'' وہ غش کھاتے کھاتے رہ گئی۔

''اس ویک اینڈ پہ پروگرام بنا ہی ڈالو پنڈی جانے کا۔

بھائی جان کو فون کر کے بتا دینا تاکہ وہاں بچے پہلے سے تیاری کر کے رکھیں مری جانے کی۔''

''ہائے سچی، کتنا سواد آئے گا، کتنا شغل لگے گا، ہائے میں مرجاواں...... پہلے جاناں کو تو یہ خبر سناؤں۔''

اس کے چہرے پہ اس معمولی سی خبر سے یک بیک اتنی خوشیاں اور رنگ بکھر گئے کہ زندگی میں پہلی بار مجھے محسوس ہوا، خوشی کے اس سچے اور بے ساختہ رنگ کے آگے ساری شاعرانہ نزاکتیں سب تخیلاتی لطافتیں...... ہیچ ہیں...... سراب ہیں۔

